قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور ...

جلد 32 ✧ شمارہ 05 ✧ ستمبر 2022ء

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیر : نیلاالظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 150 روپے ✧ زرِ سالانہ 2300 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

سورۃ البقرہ کی آیت 155 میں صاف صاف لکھ دیا گیا ہے کہ جان و مال، بھوک اور خوف سے انسان کی آزمائش ہوگی۔ ہمارے ہاں کے تاجروں نے اس آیت کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ جان بچانے کے لیے مالی عذاب میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ بھوک اور خوف کا عفریت بھرپور انداز میں وار کر سکے۔ صحت اور بیماری لازم و ملزوم ہے۔ عمر کے بڑھنے میں مرض کا حملہ ہو سکتا ہے۔ اس حملے سے مدافعت کے لیے دوا ضروری ہے۔ اس وقت بازار میں ادویات کا مصنوعی بحران ہے۔ یاد رہے کہ ملک میں ستر ہزار دوائیں رجسٹرڈ ہیں۔ بیسیوں غیر ملکی، سینکڑوں ملکی دوا ساز کمپنیاں دوائیں تیار کرتی ہیں مگر خام مال باہر سے آتا ہے یہاں صرف مکسنگ اور پیکنگ ہوتی ہے۔ پچھلے دس برس میں ان دواؤں کی قیمت میں ڈیڑھ سو فیصد اضافہ ہوا ہے پھر بھی بازار سے دوائیں غائب ہیں خاص کر انتہائی ضروری ادویات جو ذیابیطس، فالج، بلڈ پریشر وغیرہ میں کام آتی ہیں۔ وزیرِ اعظم شہباز شریف نے ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی کو رپورٹ کرنے کا حکم بھی دیا ہے لیکن اب تک بڑھتی قیمتوں اور عدم دستیابی کا حل سامنے نہیں آیا ہے۔

بے مثل فنکار

وہ 2 نومبر 1897ء کو رامپور کے ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے جب کچھ بڑے ہوئے تو انہیں بھی تھیٹر کی چکاچوند بھلی لگنے لگی کیونکہ اس زمانہ میں تھیٹریکل کمپنیوں پر پارسیوں کی اجارہ داری تھی۔ انہوں نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز اداکاری سے کیا۔ پھر ہدایت کاری کی طرف آئے اور ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی، جس کا نام "آریہ سبودھ تھیٹریکل کمپنی" تھا۔ یہ کمپنی گیارہ سال تک قائم رہی۔ 1931ء میں عالم آرا پہلی بولتی فلم تھی۔ اس وجہ سے عوام کا رجحان تھیٹر سے ہٹ کر فلموں کی جانب ہو گیا۔ وہ بھی اس تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے "ہیملٹ" کو اردو زبان میں پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کا ڈول ڈالا۔ یہ فلم "خون کا خون" کے نام سے پیش ہوئی۔ اداکاروں میں ان کے علاوہ دہلی کی مشہور گلوکارہ شمشاد بیگم عرف چھمیا اور ان کی بیٹی نسیم بانو بھی شامل تھیں۔ اس اولین کاوش کو لوگوں نے بہت سراہا۔ خون کا خون 1935ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی، اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر اگلے برس انہوں نے اپنے فلم ساز ادارے "منروا موی ٹون" کی بنیاد رکھی۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات کمال امروہی سے ہوئی۔ کمال امروہی کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا۔ انہوں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے فلم کی کہانی اور مکالمے لکھنا چاہتا ہوں۔ اس جرأت پر وہ بڑے حیران ہوئے۔ ان کی حیرت کو دیکھتے ہوئے کمال امروہی نے کہا۔ "میں دیکھنے کی نہیں سننے کی چیز ہوں۔" یہ جملہ سنتے ہی وہ چونک پڑے اور انہوں نے کمال امروہی کو اپنی اگلی فلم کی کہانی اور اس کے مکالمے لکھنے کی ذمے داری سونپ دی۔ کمال امروہی کی کہانی پر فلم جیلر بنائی جو بہت مقبول ہوئی۔ جیلر کی مقبولیت کے بعد انہوں نے تاریخی موضوعات پر فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس موضوع پر ان کی پہلی فلم پکار تھی۔ یہ فلم 1939ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی جس نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دی۔ اس فلم میں ملکہ نور جہاں کا کردار نسیم بانو نے اور جہانگیر کا کردار چندر موہن نے ادا کیا تھا۔ یہی وہ فلم تھی جس نے نسیم بانو کو "پری چہرہ" کا خطاب عطا کیا۔ 1941ء میں منروا موی ٹون کی ایک اور فلم "سکندر" نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ سکندرِ اعظم کے ہندوستان پر حملے پر مبنی یہ ایک تاریخی فلم تھی۔ فلم میں سکندرِ اعظم کا مرکزی کردار پرتھوی راج کپور نے ادا کیا۔ ابتدا میں سنسر بورڈ نے اس فلم کی نمائش کی اجازت دے دی مگر بعد میں بورڈ کو اس فلم کے کچھ مناظر پر اعتراض ہوا جو دوسری جنگِ عظیم کے حوالے سے حکومتِ برطانیہ کے خلاف ردِعمل پیدا کر سکتے تھے چنانچہ کنٹونمنٹ کے علاقوں میں اس فلم کی نمائش ممنوع قرار دے دی گئی۔ یہ فلم بھی کامیاب ہوئی اور متعدد مرتبہ نمائش پذیر ہوئی۔ 1950ء میں بمبئی کے ایک سینما گھر میں ان کی یادگار فلم شیش محل نمائش پذیر ہوئی۔ وہ خود بھی سینما گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ فلم بینوں کی اگلی نشست پر ایک شخص آنکھ بند کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں دلی تکلیف ہوئی کہ وہ فلم بین ان کی فلم دیکھنے کی بجائے سو رہا ہے۔ انہوں نے منیجر کو بلایا اور کہا کہ اس شخص کو ہال سے جانے کے لیے کہیں اور اس کے ٹکٹ کے پیسے واپس کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد منیجر ان کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ شخص نابینا ہے اور صرف آپ کی فلم کے مکالمے سننے کے لیے آیا ہے۔ منروا موی ٹون نے جو دوسری فلمیں پیش کیں ان میں پرتھوی ولبھ، جھانسی کی رانی، مرزا غالب اور نوشیرواں عادل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 1953ء میں ریلیز ہونے والی جھانسی کی رانی ہندوستان کی پہلی رنگین فلم تھی جس کے لیے خصوصی کیمرے، آلات اور تکنیک کار امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ فلم بہت زیادہ کامیاب نہیں رہی البتہ مرزا غالب بہت کامیاب ہوئی۔ فلم میں غالب کا کردار بھارت بھوشن نے اور غالب کی محبوبہ کا کردار ثریا نے ادا کیا تھا۔ یہ فلم 1954ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اسے بہترین فلم کا قومی ایوارڈ ملا تھا۔ مرزا غالب کی نمائش سے منروا موی ٹون کو بہت آمدنی ہوئی اور اس آمدنی کے ایک حصے سے انہوں نے دہلی میں مرزا غالب کا مزار تعمیر کروایا۔ ان کی دوسری فلموں میں آتما ترنگ، خان بہادر، میٹھا زہر، شیش محل، طلاق، بھروسا، پھر ملیں گے، راج ہٹ، کندن اور میرا گھر میری جنت جیسی فلمیں شامل ہیں۔ ان فلموں میں سے بعض میں انہوں نے فلم سازی اور ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ اداکاری کے جوہر بھی دکھائے، ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی آخری فلم "مینا کماری کی امر کہانی" تھی اور اداکار کی حیثیت سے "رضیہ سلطان" جو فلم "پکار" کے کہانی نویس اور مکالمہ نگار کمال امروہی کی زیرِ ہدایت بنائی گئی تھی۔ ان کی بیوی مہتاب بھی خاصی معروف اداکارہ تھیں، ان کا اصل نام نجمہ تھا اور وہ 20 اپریل 1918ء کو بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے خاموش فلموں کے دور میں فلم "کمال شمشیر" میں کام کیا۔ تاہم انہیں صحیح کامیابی کیدار شرما کی فلم "چترلیکھا" سے ملی، جس میں انہوں نے غسل کے مناظر فلم بند کروا کر اس زمانے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ ان کی دوسری فلموں میں رن چنڈی، سینما کی رانی، بھولا شکار، قیدی، معصوم، بھگت کبیر، شمع، قانون، جیون، ایک دن کا سلطان، ساقی اور بیرم خان کے علاوہ جھانسی کی رانی شامل تھیں۔ وہ تان سین کے بیٹے بلاس خان کی زندگی پر ایک فلم "گرود کھشنا" بنا رہے تھے، اس فلم میں تان سین کا کردار راج کمار کو اور اکبرِ اعظم کا کردار امجد خان کو دیا گیا تھا۔ تان سین کے بیٹے بلاس خان کے لیے سہراب مودی کے ذہن میں تین اداکار سنی دیول، فاروق شیخ اور ونیل کھنہ تھے۔ جن میں سے ایک کا انتخاب ہونا تھا۔ بلاس خان کی محبوبہ کا کردار پدمنی کولہاپوری ادا کر رہی تھیں۔ مگر گرود کھشنا کی مہورت کے بعد وہ اچانک علیل ہو گئے، یوں ان کی یہ آخری فلم نامکمل رہ گئی اور وہ 28 جنوری 1984ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے۔ انہیں ہم سہراب مودی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

نسیم

......☆......☆......☆......

شہرِ خیال

مدیر/قارئین

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تجزیہ، لورپور (تھل) سے۔ ”پرچا 2 اگست کی شام کو ملا ہے۔ آپ نے مجھے کرسی صدارت پر بٹھانے کا اعزاز دیا۔ شکریہ قبول کیجیے لیکن جب خط شائع نہیں ہوتا تو دل سے اک آہ نکلتی ہے جو صحت کی خرابی، عمر کی زیادتی اور دل کی کمزوری کی وجہ سے سہنا کار ہائے دشوار ہو جاتا ہے (ڈاک کے نظام کا کیا کہنا، اس ماہ پانچ خطوط میں کے شمارے پر ملے) اب تبصرہ جلد مکمل کرنے کے چکر میں دماغ ڈانواں ڈول کی زد میں ہے، کئی پسندیدہ موضوعات، سلسلے چھوڑنے پڑ رہے ہیں جہاں تک کاغذ کی گرانی، عدم دستیابی کا تعلق ہے ہم نے اپنے محبوب پرچے کے ساتھ غیر مشروط ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا تب سے اس کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں اب ادارے کا ہر فیصلہ قبول ہے۔ دیگر رسائل کے ایڈیٹر بھی چیخ، چلا اور بے بسی میں بلبلا رہے ہیں، آپ کے ساتھ نیا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسی مہنگائی ضروری اشیاء کا غیاب اور افراتفری نہیں ہوئی ہے کہ محدود وسائل رکھنے والے زندہ درگو ہیں۔ تاجر جلائیں اور ریلیاں نکالیں یہ مسائل زمانہ قریب میں حل ہوتے نظر نہیں آتے۔ ہر لیڈر، چور، کرپٹ اور جھوٹا ہے اس لیے دل جلانے کی بجائے کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ قلمی کہانی ”بہادت کار“ پر نظر پڑی تو سب چھوڑ کر اس نگری کی سیاحت کو آنکلا ہوں۔ مسعود پرویز واقعی بہترین ہدایت کار، انسان اور نئے تجربے کرنے والوں میں تھے۔ زندگی میں ناکامیاں بھی ساتھ چلتی ہیں جو مزید بہتر کرنے، آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کی تحریک دیتی ہیں وہ اپنے تمام مراحل سے گزرے لیکن اپنے اصولوں پر کاربند رہے اس ایک مضمون میں ضمناً کئی دو مرے اپنے وقت کے قدآور کرداروں کا ذکر بھی آیا جو معلومات، دلچسپی اور لذت مطالعہ میں کم نہیں ہے یہ سلسلہ ہم سب کا پسندیدہ ہے اور اعجاز احمد نواب کے شکر گزار اور طویل زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔ ”نمک حرام“ میں یہ پڑھ کر حیران بیٹھا ہوں کہ جن ملکوں میں پیسے کی فراوانی اور عوام خوش حال ہے وہ بھی دولت کی بھاگ دوڑ، رقابت اور ڈالروں کے ڈھیر لگانے کے چکر میں خطرناک چکر بازیاں چل رہے ہیں۔ کاف کا اور الفریڈ اس انجام کے مستحق تھے لیکن ڈیوڈ کو آخری قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا کوئی محفوظ راستہ تلاش کر کے ہاتھ پاؤں بچا کر اتقام لیتا۔ ”خونی مگرمچھ“ اچھوتی، پرتجسس اور سنسنی پیدا کرنے والی کہانی ہے شاید شکار سے متعلق ایسے منفرد واقعات کم ہی پڑھے ہوں گے کیونکہ یہاں ایک ملک میں وحشت کے مرنے کے لیے شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی سے بڑھ کر مگرمچھ کا شکار کرنا مشکل ہے کیونکہ اس کے جبڑے بڑے طاقتور اور جسامت ہیبت طاری کرنے والی ہوتی ہے پھر اس پر دو تین گولیوں کا اثر نہیں ہوتا، شکار کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں اور آنے والے سالوں میں بھی پڑھتے رہیں گے لیکن موجودہ کہانی کا مزہ بھول نہ پاؤں گا۔ ”جادوگرنی“ کا جادوئی علاج کہاں تک کامیاب اور سچا ہے اس فیصلہ کو الگ رکھتے ہیں یہاں اپنے وزیروں، قدآور سیاستدانوں اور موجودہ وزیراعظم کو شور روتا ہوں جو آئے روز مختلف بیاریوں کا رونا روتے ہیں اور خون تبدیل کرانے مخصوص وقت کے بعد لندن، امریکا یاترا کے لیے تیار رہتے ہیں وہ شوبا کی جادوئی صلاحیت سے فائدہ اٹھائیں۔ انہیں بھلا کیا کمی یار کاوٹ ہے، بھلے چنگے ہو کر آئیں اور عوام کی خدمت کریں اور حقیقی تبدیلی لا کر خادم اعلیٰ کا کردار ادا کریں اتنا مفید، سستا اور مفت مشورہ ہے۔ سچی بیانیوں کی اولین پیشکش ”درد آزادی“ نے ہمیں بھی ایک انوکھے درد و دکھ اور پچھتاوے میں جلا کر دیا ہے، کتنی صدیاں، دہائیاں اور سال گزر گئے ہیں ہم اب بھی انہیں شیطان کے چیلوں سے خیر کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ کوئی اہل، حتمی فیصلہ نہیں کر پائے کہ کس سمت سفر کریں تو اپنی منزل پر پہنچ کر کبھی، سرخرو نہ سکون اور امن سے رہ سکیں گے۔ چوہدری حنیف نے ہندوؤں کو راضی رکھنے کے لیے کتنی دولت جایا اور خرچ کی، ہر تہوار پر خرچ کیا، گردوارے کو زمین دی، بلا تفریق غربا میں رقم، اجناس تقسیم کیں، بیواؤں کی مدد اور بچیوں کی شادی پر اخراجات میں حصہ ڈالا تا کہ

گاؤں کی فضا خوشگوار اور پُرامن رہے لیکن وہ سانپ پالتے اور ہاتھوں کے چلو میں دودھ پلاتا رہا لیکن وقت پڑا تو وہ اپنی فطرت پر اتر آئے اور زہریلا ڈنک مارنے میں لمحے کی دیر نہ لگائی، ساری منصوبہ بندی بیکار گئی۔ ایک طرف بے دردی سے دوران سفر خاندان کے لوگ شہید ہوئے تو وہ اپنے گھر میں انسانی شکل میں درندوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ ایسا ظلم، بربریت ہائی گئی کہ انسانیت شرمندگی سے منہ چھپانے پر مجبور ہو گئی، ہماری ذمہ داری، سوچنے، سمجھنے کی اتنی مختصر اور آسان بات یہ ہے کہ کیا ہزاروں مہاجرین قربانی دینے والوں کو خوابوں کی تعبیر مل گئی، ہم ان کی توقعات پر پورا اتر سکے ہیں؟ خدارا چند لمحے ضرور سوچ کے گھوڑے دوڑا کے غور کیجیے گا۔ ”خواب ناتمام“ میں نثار پاکستان تحریک کا ادنیٰ، معصوم اور بے بس سپاہی تھا۔ اپنے خواب کے لیے والد کے نظریات سے بغاوت کی، تکالیف اٹھائیں اور غیر یقینی حالات میں پاک سرزمین کا سفر کیا۔ اگر یہاں صورت حال مختلف ہے تو ذمہ دار ہم خود ہیں۔ قائداعظم، لیاقت علی خان و دیگر لیڈروں کو کیوں دوش دیں ہم کب اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔ دفتر ٹائم میں آرام، گپیں لگانا، فون سننے میں وقت کا ضیاع، رشوت، سائلوں کو تنگ، ذلیل کرنا کہ وہ تنگ آ کر اپنا موقف بدل لیں، حق چھوڑ دیں۔ سرکاری رقوم میں خرد برد اور ہر فنڈ میں گھپلے اور ذاتی مفاد کو ترجیح دینا ہمارا وتیرہ ہے۔ سرزمین کو کیوں الزام دیں۔ اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے، فرائض نبھانے کی بات کیجیے یہ وادی بھی خوابوں کی سچی تعبیر اور جنت نظیر بن سکتی ہے۔ نثار نے ملک کے ساتھ وفاداری نبھائی، ملازمت کے دوران ایمانداری کا عہد نبھایا وہ سب عدالتوں میں سرخرو ٹھہرا۔ ہمیں اپنا محاسبہ کر کے سیدھے راستے پر چلنا چاہیے تا کہ لوگوں کی دعاؤں کے ساتھ جنت کے بھی حق دار ٹھہرائے جائیں یہ سب ریاضت، عبادت، امانت داری اور ذمہ داری نبھانے کا نچوڑ ہے۔ ”منا“ تلخ لمحات، خون ریزی، ملک کے دو ٹکڑے ہونے، مشقت اور خوشیوں، مسکراہٹوں اور کھلی آنکھوں دیکھے خوابوں کی تعبیر کی کہانی ہے کئی لوگ دھرتی کا فخر ہوتے ہیں، شرافت، دیانت اور معاہدوں کی پاسداری زندگی کا نصب العین ہوتا ہے یہ مانوس اجنبی ایسی ساری صفات پر پورے اترتے ہیں بلکہ انسان دوستی ان کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ دو بچھڑے خاندانوں کو ہمیشہ کے لیے ملا کر چاروں طرف شادمانی کی فضا بنا دی۔“

☆ ذوالفقار علی بخاری کا خط کراچی سے۔ ”مکرمی! سب سے پہلے تو اس بات کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ مجھ جیسے نوآموز لکھاری کی تحریروں کو اپنے معیاری رسالے میں شائع کر کے جو آپ میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے ہاں، ادبی دنیا میں بہت کم ہی نئے قلم کاروں کو سراہنے کی روایت قائم ہے لیکن چند شخصیات اور ادارے آج بھی نئے لکھنے والوں کی پذیرائی کر کے انہیں وہ طاقت دے رہے ہیں جس کی بدولت وہ معاشرے میں موجود برائیوں کو اجاگر کر کے اچھائی کی جانب مائل کر رہے ہیں۔ ماہ اگست کے شمارے میں میری سرگزشت کا حصہ بننے والی کہانی مجموعی طور پر تیسری کہانی ہے، دوسری عجب بات یہ ہے کہ اولین کہانی اور تیسری کہانی اگست کے مہینے میں شائع ہوئیں یعنی یہ میرے لیے مسلسل دو سالوں سے سالگرہ کا بہترین تحفہ کہا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ محض حسن اتفاق ہے لیکن اس سے مجھے جو خوشی ملی ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے سنا تھا کہ اچھے مدیران ہمیشہ قلم کار کو آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں اور اب اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتا دیکھ بھی رہا ہوں جو کہ مزید توانائی بخش رہا ہے۔ آپ نے میری کہانی ”نمک حرام“ میں جو تبدیلی کی ہے اس نے کہانی کو چار چاند لگا دیے ہیں اور مجھے بھی اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ ایک لمحے میں ایسا محسوس ہوا جیسا میری طبع زاد کہانی کسی انگریزی ماحول کے رنگ و روپ میں ڈھل گئی ہے۔ اس کہانی کی اشاعت پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے جو مجھے قوت بصورت پذیرائی دی ہے وہ میرے لیے انمول ہے اور اس کہانی کو جن قارئین نے پسندیدگی کی سند دی ہے، ان سب کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں یقینی طور پر ان قارئین کی داد مجھے مزید بہترین لکھنے پر مائل کرے گی (انشاء اللہ وہ بھی نمبر آتے ہی لگ جائے گی) مجھے یقین کامل ہے کہ میری ایک اور کہانی ”آتش انتقام“ بھی جلد سرگزشت کے صفحات کا حصہ بن سکے گی اور قارئین سے داد وصول کرے گی۔ میں وہ قلم کار ہوں جو ایک زمانے میں خطوط پڑھ کر سرگزشت کی محفل سے لطف اندوز ہوتا تھا یہ قطعی علم نہیں تھا کہ آنے والے برسوں میں یہاں میری کہانی پر بات ہوگی۔ جناب اعجاز احمد نواب صاحب کا معلوماتی سلسلہ دلچسپ ہے۔ ان سے بالمشافہ ملاقات میں بھی بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہے اور خوشی ہے کہ وہ تاریخ کا حصہ بننے والے کرداروں کو سامنے لا رہے ہیں جو کہ قابل تعریف عمل ہے۔ دیگر کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں تو انشاء اللہ پھر کبھی تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو۔“

☆ نصر اللہ خان، جنوبی محلہ داؤد خیل میانوالی سے لکھتے ہیں۔ ”سرگزشت جلدی مل گیا تھا جس کی تمام کہانیاں اچھی اور معیاری تھیں۔ جناب انور فرہاد کی وفات پر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اب قلمی کہانی اعجاز احمد نواب لکھ رہے ہیں جو کہ انشاء اللہ کافی اچھی آ رہی ہیں۔ اعجاز احمد نواب صاحب کیا محی الدین نواب صاحب کے بیٹے ہیں، بتائیے کیونکہ کافی اچھے لکھاری اور مصنف ہیں (نہیں، یہ بھی ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں) آفاقی صاحب کی یاد شدت سے آ رہی ہے کیونکہ وہ فلمی کہانیاں کے علاوہ سفرنامے بھی بہترین لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کافی عرصے سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب غائب ہیں جن کی کمی محسوس ہوتی ہے (بڑھاپا آڑے آ گیا ہے) سرورق پر ملکوتی حسین یاد کی معلوماتی تحریر کافی اچھی تھی۔ زدیا صفوان خوب حق ادا کر رہی ہیں۔ پاکیزہ کا خاص نمبر جس کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے جس

سے پیسے ایجنسی پرائیڈ وانس دے رہے ہیں۔ محترم تنویر ریاض صاحب کے انتقال پر افسوس ہوا۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ سچ بیانی اغوا بڑی متاثر کن تحریر تھی جس سے معاشرے کی بے حسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انشا اللہ بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔"

☆ سیدہ شاہدہ شاہ جہلم سے رقمطراز ہیں۔ "ایک سچ مگر کچی کہانی" بنجارا" بھجوا رہی ہوں جب تک یہ کہانی شائع ہوگی اس وقت تک "کالو خان" کو پھانسی لگ چکی ہوگی۔ اس نے مجھ سمیت سپرنٹنڈنٹ جیل سے اپنی آخری خواہش کا اظہار کیا تھا مگر ہم سب میں سے کوئی بھی اس کی آخری خواہش پورے کرنے سے قاصر تھا۔ وہ نجانے کس کا لہو تھا۔ کس کا بیٹا تھا۔ اُمید ہے آپ سمیت تمام قارئین کو پسند آئے گی۔"

☆ بیگم پرویز خان، مانسہرہ سے لکھتی ہیں۔ "شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ سب سے پہلے ایک صفحے پر مشتمل یک ملّی پڑھی۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ شہرِ خیال میں داخل ہوئے میرا ارشد محمد بن کریم کے تبصرے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ شہرِ خیال میں سب ہی بہت اچھی اچھی رائے دیتے ہیں اور بہت اچھا تجزیہ کرتے ہیں سب سے پہلے شہرِ خیال میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد رودسیاہ پڑھتے ہیں۔ عاطر شاہین مبارک ہو۔ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ پاکستانی علی کے ساتھ ہماری دعائیں اور محبتیں۔ زویا صفوان ہمیں ہمیشہ ہی انمول ہستیوں سے متعارف کرواتی ہیں۔ شکریہ زویا جی۔ "جیمکو" ایک بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر۔ "صبر کا پھل" ایک اچھی سچ بیانی۔ "حسد" ایک سبق آموز سچ بیانی۔ حاسد اپنی ہی آگ میں جلتا ہے۔ "بدکار موبائل" ایک دعوتِ فکر دیتی سچ بیانی۔ اخلاقی زوال، انسانیت، شرم حیا اور اخلاقیات کا جنازہ کیسے کیسے نکل رہا ہے۔ دل کانپ گیا۔ "دراز" غلط فیصلے کیسے بچوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیتے ہیں۔ بہت ہی رلادینے والی سچ بیانی۔ "ممتا کی جیت" نے خون منجمد کردیا ہمارے پاس اتنی سہولیات ہیں اتنی نعمتیں ہیں لیکن ہم قدر نہیں کرتے۔ شکر ہے کہ ممتا جیت گئی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ میں نے کچھ تحریریں بھیجیں تھیں تاحال کچھ پتا نہیں (سرگزشت میں وہی تحریری بھیجیں جس قسم کی تحریریں شائع ہوتی ہیں) ابھی تک میرا خط بھی شائع نہیں ہوا۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے تشریف لائے ہیں۔ "اگست کا شمارہ موسلا دھار بارشوں میں موصول ہوا۔ جولائی کے آخر اور اگست کے شروع میں صرف کراچی ہی نہیں ڈوبا۔ پورے پاکستان کی حالت ایسی ہی تھی۔ خصوصاً بلوچستان کے حالات دیکھ کر خود کو تسلی دے لیتے تھے۔ ہمارے شہر میں آج تک اتنی بارشیں نہیں ہوئیں۔ اپنی زندگی میں ایسی شدید بارشیں نہیں دیکھیں۔ بارشوں کا پانی کمرے تک میں چلا آیا جس سے کتابیں رسالے اور وہ اخبارات جو کمرے میں زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ سب بھیگ گئے۔ آپ اس بندے کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کا خزانہ ہی یہ کتابیں اور رسائل و جرائد ہوں۔ اداریے میں مہنگائی کی وجہ سے سفید پوش طبقے کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جن اشیا کی قیمتیں سالوں بعد بڑھتی تھیں، اب ہفتوں میں بڑھ رہی ہیں اور یہ سب کچھ یقیناً سفید پوش اور خوددار طبقے کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ یک ملّی کی سرگزشت آج کے معروف کالم نگار و مزاح نگار عطاء الحق قاسمی کے بارے میں تھے۔ یہاں ایک صحیح کردوں، شاید کمپوزنگ کی غلطی سے لکھا گیا ہے۔ ان کے مشہور ڈرامے کا نام شب دیگ تھا نہ کہ شب دیغ (شب دیگ لیکن صحیح دیغ ہے) شہرِ خیال میں آپ نے مہنگائی کے حوالے سے سرگزشت کے مسائل اور صفحات کم کرنے یا قیمت بڑھانے کا پوچھا ہے۔ میری تو تجویز ہے کہ فی الحال صفحات ہی کم کردیں۔ اعجاز حسین سٹھار کا بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ انہوں نے گزشتہ ماہ فون پر رابطہ کیا تھا مگر پھر خود ہی خاموشی اختیار کرلی۔ عبدالحکیم ثمر کے جذبات پڑھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندگی میں ہر خوشی دے مگر انہی کا ہر آخری جملہ کہ زندگی دیتی کم ہے، لیتی کچھ زیادہ ہے۔ مینا راجپوت، ساجد محمود اور زرینہ شاہ نے بھی خوب لکھا۔ زویا اعجاز ایک باغی دوشیزہ کی دلچسپ سرگزشت کے ساتھ حاضر تھیں۔ اے حفیظ نے میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی خواتین کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کیں۔ مشاہیروں کے آخری الفاظ کے حوالے سے بہت سے مضامین نظر سے گزر چکے ہیں۔ مگر عائشہ چوہدری نے جس تفصیل سے لکھا، اس سے قبل نہیں پڑھا۔ طاہر منصور آفاقی کی کتاب سے انہوں نے خوبصورتی سے تلخیص کی۔ حفصہ محمد فیصل اور ذوالفقار بخاری کی تحریریں بھی دلچسپ رہیں۔ معروف فلمکار سبطِ حسن کی شخصیت کے بارے میں سن تو رکھا تھا مگر زیادہ معلومات نہ تھیں۔ زین مہدی کی تحریر "ترقی پسند" نے یہ معلومات فراہم کردیں۔ اپنے نظریے سے محبت کرنے والے اس بڑے ادیب کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہی ملی۔"

☆ قیصر خان کا تبصرہ بھکر سے۔ "اداریہ میں مہنگائی کی بات ہوئی ہے، سفید پوش طبقہ کے حالات ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہے۔ کرسی اقتدار کی خاطر سیاست دان عوام کو بھول گئے ہیں اور مافیا منہ مانگے دام وصول کررہا ہے۔ یک ملّی میں سرگزشت محترم جناب عطاء الحق قاسمی کے بارے میں مفصل پڑھنے کو ملا ہے! شہرِ خیال میں سوال پوچھا گیا تھا کہ قیمت کو بڑھائیں یا صفحات کم کردیں تو میرا مشورہ صفحات کو کم کردیں۔ خریدار چھوڑ سکتے ہیں قیمت کے اضافہ پر، صفحات کم ہوں گے تو بھی رسالہ کی فروخت متاثر نہیں ہوگی۔ کرسی صدارت پر میرے پیارے محسن جناب اعجاز حسین سٹھار صاحب بہترین تبصرہ کے ساتھ موجود تھے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں حاجی اعجاز صاحب دراز قد نرم طبیعت

اور بہترین حافظہ کے مالک ہیں۔ ایک زمیندار گھرانے کے فرد ہیں! ان کے بعد مینا راجپوت صاحبہ، ساجد محمود، زرینہ شاہ، بشیر احمد بھٹی، عبدالحکیم ثمر کے تبصرے پسند آئے ہیں۔ رانا شاہد صاحب حاضر نہیں تھے (ان کا تبصرہ آیا مگر وقت کی کمی کے سبب لگ نہ پایا) باقی اس مرتبہ آپا زویا صفوان نے معلوم نہیں اس شخصیت کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ "وقت آخر" تاریخ میں وہ الفاظ جو آج بھی یاد ہیں بہترین تحریر تھی۔ "ہدایت کار" قلم نگری سے نواب صاحب کا بہترین مضمون پڑھنے کو ملا ہے۔ "نمک حرام" جرم و سزا کی بہترین تحریر تھی! "ترقی پسند" زین مہدی صاحب اس بار ایک آزاد پنچھی کی تحریر لائے ہیں تحریر بہت شاندار تھی پسند آئی ہے۔ "دردِ آزادی" اس ماہ کی مناسبت سے بہترین دکھی کردینے والی سچ بیانی تھی۔ پڑھنے کے بعد رو دیے ہیں۔ آزادی کے لیے قربانیاں اس سے بھی بڑھ کر کیا ہوگی۔ "خواب ناتمام" ایسی سچ بیانی ہے جس کو ہر دردِ دل پاکستانی کی کہانی سمجھیں۔ آج کے پاکستان کی عکاسی تھی۔ "سراب" اس میں نفسیات پر مبنی کہانی ہر بار ہونی چاہیے بہت سے مسائل میں راہنمائی ملے گی۔ "سوتیلی ماں" ایک بہترین کردار کی کہانی تھی۔ ماں سگی سوتیلی نہیں ہوتی ماں ماں ہوتی ہے۔"

☆ سعید عالم کا ای میل لاہور سے۔ "اس بار کا شمارہ بروقت ملا۔ سب سے پہلے خطوط کی جانب لپکے اعجاز صاحب کا دلچسپ تبصرہ پڑھا مزہ آگیا۔ ساجد محمود، مینا راجپوت، زرینہ شاہ، عبدالحکیم ثمر کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ زویا صفوان کی تحریر باقی بس گزارے لائق تھی۔ وقت آخر بھی پسند آئی۔ اعجاز نواب بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ہدایت کار دلچسپ تھی۔ نمک حرام دل کو چھوتی زبردست تحریر تھی۔ ترقی پسند بھی اچھی تھی۔ درد آزادی یومِ آزادی کے حوالے سے بہت پسند آئی۔ دل دکھ سے بھرا تھا۔ ہمارے بڑوں نے کس قدر قربانیاں دے کر ملک حاصل کیا اور ہم ان کے خوابوں کو تعبیر نہیں دے رہے ہیں۔ آزادی کا صحیح مفہوم تک بھول گئے ہیں۔ یہ پاکستان مسلمانوں کی جنت کہلانے کے لیے بنا تھا۔ اسے اسلام کا قلعہ ہونا چاہیے تھا لیکن اس پیارے ملک کو سیاست دان لوٹ رہے ہیں۔ خواب ناتمام بھی دلچسپ لگی۔ خوب لکھا ہے۔ سراب بھی اچھی تھی۔ رودسیاہ کو مزید دلچسپ بنانے کی ضرورت ہے۔ سوتیلی ماں بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ آپ نے سوال کیا ہے کہ پرچے کی قیمت بڑھائی جائے یا صفحات کم کردیے جائیں تو میرا مشورہ ہے کہ قیمت نہ بڑھا کر صفحات کم کردیں۔"

☆ نوشین ملک کا خط فیصل آباد سے۔ "اس بار کی تمام سچ بیانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ درد آزادی نے آنکھوں میں آنسو لادیے۔ کیا خوب کہانی تھی۔ خواب ناتمام بھی اچھی لگی۔ ممتا بھی گزارے لائق تھی۔ ابتدائی صفحات پر ہدایت کار مسعود پرویز کی حالاتِ زندگی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ نمک حرام کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سراغ رسانی پر بھرپور کہانی پڑھنے کو ملی۔ شکاریات میں دو الگ الگ کہانیوں کو یکجا کیا گیا ہے لیکن صحیح انداز سے ماحول نہ بنانے کی وجہ سے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ جادوگرنی کیا واقعی سچی خبر ہے؟ اگر سچ ہے تو اسے پاکستان بلایا جائے یہاں اسے بہت سارے مریض مل جائیں گے۔"

☆ ظہیر الحسن نے چنیوٹ سے لکھا ہے۔ "سرگزشت ہمارے شہر میں اکثر تاخیر سے پہنچتا ہے (آپ سالانہ خریدار بن جائیں تاکہ گھر بیٹھے وقت پر پرچا مل جایا کرے) اعجاز حسن سٹھار کا تبصرہ ہر بار کی طرح دلچسپ لگا۔ خوب تبصرہ لکھتے ہیں۔ باقی نے معلومات میں اضافہ کیا۔ زویا صفوان اچھا لکھ رہی ہیں۔ ساجد امجد کی کمی پوری کردی ہے۔ حفصہ فیصل کی شانِ وطن بھی اچھی تھی۔ معلومات کا خزانہ پایا۔ صنفِ آہن کا جواب ہے شانِ وطن۔ ہماری بہنیں کسی سے کم نہیں ہیں۔ عائشہ چوہدری کی وقت آخر بھی دلچسپ لگی۔ ہدایت کار میں مسعود پرویز جیسے قابل ہدایت کار کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کی فلمیں دیکھ نہیں پایا ہوں لیکن علی سفیان آفاقی نے ان پر بہت لکھا ہے اس وجہ سے ان کا نام یاد ہے۔ نمک حرام از ذوالفقار بخاری بہت ہی نہیں بہت زیادہ پسند آئی ہے۔ اچھا لکھا ہے۔ ان کی کچھ کہانیاں بچوں کے رسالوں میں پڑھ چکی ہوں۔ شکاریات پسند نہیں آئی۔ ایسا لگا ہے کہ بھان متی نے کنبہ جوڑا، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ جادوگرنی جیسی جادو ٹونا کی ماہر خواتین و مرد لاہور میں بھرے پڑے ہیں۔ ان کی مزید تعلیم کے لیے لاہور بلایا جائے۔ سچ بیانی میں "درد آزادی" کمال کی تحریر ہے۔ گل بانو کی سوتن بھی اچھی لگی۔ خواب ناتمام تو سپر ڈوپر تحریر لگی۔ سراب بھی اچھی تحریر ہے۔ سوتیلی ماں کا جواب نہیں۔ ماں ماں ہوتی ہے سگی ہو یا سوتیلی۔ کل ملا کر اس ماہ کا شمارہ لاجواب ہے۔"

☆ وکیل الرحمٰن کا خط کراچی سے۔ "ازراہ کرم سرگزشت کے معیار کے مطابق قیمت 200 کردیں۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے لہٰذا فوری طور اضافہ لازم ہے۔ اگست کے شمارے میں سفرنامہ غائب ہے؟ گزشتہ سے پیوستہ رسالے سے خالد نظامی کا ذکرِ خیر ہوا ہے۔ میرے ہر دل عزیز فنکار ہیں۔ اداکاری جما کے کرتے ہیں۔ فطری اداکاری کا مجموعہ ہیں۔ سکندر صنم بھی مایہ ناز اداکار تھے۔ رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ تبصرہ اگلے خط میں سرگزشت کی ٹیم کو مؤدبانہ سلام عرض ہے۔"

☆ عبدالحکیم ثمر کا خط کراچی سے۔ "اداریہ رقم طراز ہے عوام اور پریشانیاں لازم و ملزوم بنادی گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے مہنگائی کے عفریت کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے لیکن مری ناقص سوچ کہتی ہے حکمرانوں نے عوام کو ان کی پریشانیاں سمیت IMF کی قیدی بنادیا ہے۔ اس ہدایت کے ساتھ عوام مرتی ہے مرے پر مہنگائی نہ مرنے پائے جبکہ حکمرانوں کا اترانا اپنی جگہ کہ ان کا اقتدار کوئی کرائے کا مکان تھوڑی ہے یہ تو ان کی موروثی

جاگیر ہے۔ ساری عمران کو یہاں تک رہتا ہے کیونکہ لیڈروں کی کوئی ایسی بڑی ذہنیت نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو وہ تم خوف نہ کرتے ہیں ہم اقتدار سے نہیں اقتدار ہم سے ہے۔ آج نہیں روک بھی لو تو کل کسی اور کونے کھانچے سے آجائیں گے۔ بسکٹ کے ہاف رول کا ملال تو مجھے بھی ہے لیکن ساتھ ہی ناشتے کے لیے پراٹھوں کی اونچی اڑان کی بھی فکر ہے جو بیس روپے سے بڑھ کر پینتیس چالیس روپے کی گود میں ہمک رہا ہے۔ ساتھ ہی عوامی مشروب چائے کو بھی دیکھ لیجیے جو مہنگائی کے جھٹکے پر چالیس پینتالیس روپے فی کپ کے ٹھراو تل پر ناچ رہی ہے۔ دلی چلی سرگزشت افسردہ تو کرگئی لیکن یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ مہنگائی کے اس زہر آلود فضا میں اس کی سانس بحال ہے۔ جب سرکار دو اور دو پانچ کا فارمولا اپنا لے تو منافع خوروں کی رال ٹپکنا تو لازمی ہے پھر تو چیزوں کی قیمتوں کے پر لگ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمالیہ کی چوٹی سر ہو جاتی ہے۔ ایک بار پھر نیوز پرنٹ کے بیوپاریوں نے نیوز پرنٹ کو یرغمال بنا کر اپنی تجوری بھرنے میں مصروف ہیں۔ اخبارات رسائل اور ڈائجسٹوں کا وجود رہے یا نہ رہے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں انہیں تو بس منافع چاہیے۔ پبلشروں کی بے بسی پر ایک بار تو خود بے بسی کا دل بھی دہل گیا ہوگا۔ ہمیں تو آسمان کو چھوتی ہوئی مہنگائی نارنگی اور آپ کو قارئین کے ذوق مطالعہ کا تحفظ! اس سلسلے میں آپ کا استفسار "اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں؟" برموقع ہے۔ دلی چلی لاغری سرگزشت کا تصور بھی ہمیں گوارہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بھوکے کو آدھا پیٹ کھانا دے کر فرخانے کے مترادف ہے۔ مہنگائی جب ہم سب کو اپنی منوں مٹی کے تلے دفن کر چکی ہے تو میں سمجھتا ہوں جہاں ہم دوں پر سو من مٹی وہاں دس من اور سہی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اگر پچیس پچاس روپے کا اضافہ کر دیا جائے (اضافہ تو ناگزیر ہے) مانا کہ یہ اضافہ کوئی مستقل حل نہیں ہوگا پھر بھی کچھ مسافت تو طے ہو جائے گی۔ ویسے جب تک سرکار کے ہاتھوں میں IMF کا چابک ہے عوام کی چیخیں نکلتی رہیں گی۔ ملال تو اس بات کا بھی ہے کہ قائداعظم کے پاکستان کو "نیا پاکستان" کا فریب دے کر حقیقی پاکستان سے دور کر دیا گیا۔ نیر داور راسپوتین کی روحیں ہمارے کرتا دھرتا بن گئیں۔ مہنگائی بیروزگاری اور عدم تحفظ کی سیاہ چادر تنی ہوئی ہے بظاہر صبح کا کوئی اتا پتا نہیں۔ دکھ کی یہ صدی کاٹے نہیں کٹتی اس کے باوجود ہمیں صبح کا انتظار ہے۔ ایک روپہلی صبح کا جو شاید ہم سے روٹھ چکی ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے ہم منتظر ہیں وہ صبح کبھی تو آئے گی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ویسا کیوں نہیں ہوتا؟ جو نہیں ہونا چاہیے وہ تو ہو جاتا ہے جو ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔ یہی بھول بھلیاں شاید زندگی ہے۔ سوچا چلو زندگی سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔ ملاقات کو ہم پہنچے تو یہ جان کر حیران رہ گئے ہم تو اس کی لاش اپنے کاندھے پر لیے لیے پھر رہے ہیں۔ سوال ہے زندگی کیا ہے؟ جواب بھی ایک سوال ہے۔ زندگی کیا نہیں؟ یہ ہم نے جہاں سب کچھ چھین لیتی ہے تو بہت کچھ دے بھی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم چھن جانے والی چیزوں کا غم سینے سے لگائے رہتے ہیں لیکن اس کی دی ہوئی سوغات کو ہم بھول جاتے ہیں۔ وقت کا مرہم کچھ غموں کو مندمل ضرور کر دیتے ہیں لیکن بعض غم ضدی ہوتے ہیں جس کی کسک ساری عمر ساتھ رہتی ہے۔ ایسی ہی کئی ایک کسک مجھے بھی ساری زندگی رلانے پر کمربستہ ہے۔ اول میری شریکِ حیات کا 52 سال کا ساتھ ایک جھٹکا توڑ گئی۔ تین بچوں کی ماں میری بڑی بچی کورونا کی بھینٹ چڑھ گئی اور اب حالیہ دنوں میرا جواں سال پوتا ساجد حسن کی ناگہانی موت! موت کا مطلوبہ نفری پورا کر گیا۔ ہم تو اس کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھے۔ 19 مئی 2022ء کو اس کی برات دھوم دھڑکے کے ساتھ لے کر جانے کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ نہیں ہوا جو ہم چاہتے تھے۔ 13 مئی 2022ء کو اچانک اس کی موت نے بارات کی خوشی جنازہ میں تبدیل کر دی۔ 19 مئی 2022ء کو اس کی ہونے والی سسرال میں برات لے جانے کے بجائے 13 مئی 2022ء کو اس کا جسد خاکی قبرستان کے سپرد کر آئے۔ اس طرح والدین کے کئی خواب چکنا چور ہو گئے۔ انہیں بڑھاپے کا سہارا چاہیے تھا اور موت کو اپنا ہدف! دونوں کی کشمکش میں زندگی ہار گئی اور میری لاٹھی ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔ میری دعا ہے کہ میرے پیاروں کی طرح اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ سرگزشت کے قلم کاروں کی کاوشوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ ہماری تسکین ذوق مطالعہ انہیں کی قلموں کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح شرکائے بزم خیال کی شوخی تحریر کا بھی جواب نہیں بعض تو اپنی طرز تحریر اور اپنی معلومات عامہ کی بدولت ہمارے ذہنوں پر راج کر رہے ہوتے ہیں اگر وہ کبھی کسی شمارے میں نہ بھی ہوں تو ان کی مہک ساتھ ہوتی ہے۔"

☆ محمد بن کریم لاہور سے لکھتے ہیں مگر یہ خط ایک ماہ بعد موصول ہوا ہے۔ "جب سے سرگزشت پڑھنا شروع کیا ہے پہلی بار دکاندار نے مقررہ تاریخ سے پانچ دن پہلے شمارہ مہیا کیا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ دکاندار کو دعائیں اور شمارے کی قیمت ادا کر کے ہاسٹل پہنچا اور سرورق پر نگاہیں دوڑائیں۔ اداریے میں معاشرتی المیہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی تھی جس کی پیدائش بدعنوانی سے ہوتی ہے۔ کرپشن اور دیگر رذیل اخلاق نے ہمارے معاشرے کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا ہے جس سے نکلنے کی تگ و دو ہمیں اور دلدل میں گراتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں (آمین)۔ ایک بھرپور تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ ایک ایک لفظ ان کی شمارے سے محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ سرگزشت کی دیگر خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال مشینوں اور بندہ بشر کے درمیان غلطی کا ہی تو فرق ہے۔ شمیم خیال کے تمام باسی عمدہ تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ یک کی سرگزشت میں اس بار جس ہستی کی زندگی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ تھا ان کا نام پہلے بھی نگاہوں سے گزرا ہے۔ گاؤں کی کچی سڑکوں سے نکل کر شہر کی بارونق اور ہجوم بھری زندگی میں وہ ایک خاص مقام پیدا

کر گئے اور وطن عزیز کے دارالحکومت میں ادب کی ترقی کے لیے جس محنت کی بنیاد رکھی وہ قابل تحسین ہے۔ انہیں "ادب کا معمار" کہا جائے تو بے جا نہیں بلکہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف اور حق ہے۔ کہانیوں کی فہرست میں "ممتا کی جیت" نے توجہ اپنی جانب مبذول کی اور جب مکمل کہانی کا مطالعہ کیا تو بلاشبہ دل سے نکلا کہ ماں کی عظمت اور احسان کو کوئی کیسے بیان کر سکتا ہے؟ فرزانہ نگہت صاحبہ نے کمال لکھا۔ سردی ہو یا گرمی، دھوپ ہو یا چھاؤں، خوشی ہو یا غمی ماں کے احسانات، ماں کی ہمدردی، ماں کی ممتا کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا ہے۔ بچہ پیدا کرنے سے لے کر وقت مرگ تک ماں کی محبت بڑھتی رہتی ہے۔ کی گگ نے بھی وہی کیا جو ہر ماں ایسے حالات میں کرتی۔ برف سے ڈھکی دنیا میں کیسے ماں کی ممتا سرد ہوتی۔ کہانی میں روانی اور جادو تھا جو قاری کو محسوس کرا رہا تھا کہ وہ بھی وہیں موجود ہے اور جاگتی آنکھوں سے سب ہوتے دیکھ رہا ہے۔ بالو اور اوتک کی دوستی میں جو غرض تھی وہی ان کی موت کا سبب بنی۔ بالو نے دوستی نبھانا چاہی مگر اوتک نے خودغرضی کا مظاہرہ کیا اور یوں ایک ہنستا کھیلتا خاندان غموں کا شکار ہو گیا۔ کوک کی بیماری نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے خود کی قربانی دے دے اور یوں ممتا کا ایک اور پہلو نمایاں ہوا۔ مجموعی طور پر عمدہ اور حقیقت سے قریب تر تحریر تھی۔ بیمار انجہت شمیم اسلام کے ساتھ حاضر تھیں۔ جیسے ان کا تبصرہ بھرپور ہوتا ہے ویسے ہی ان کی لکھی تحریر عمدہ اور شائستگی سے بھری ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ جسے فتح کرنے کی بشارت مسلمانوں کو چودہ سو سال قبل سنائی گئی تھی وہ عثمانیہ سلطنت کے دور میں پوری ہوئی اور مسلمانوں کے امتیاز میں اور اضافہ ہوا۔ شمیم اسلام کا فاتح جنتی ٹھہرا اور اسلام کی حقانیت میں اور اضافہ ہوا۔ تاریخی واقعات کو یوں چند صفحات میں سمو دیا اور پھر اس خوبصورتی سے کہ کہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ سلطان محمد فاتح نے سلطنت عثمانیہ کے نشاۃ ثانیہ کی ابتدا کی اور اس کا اثر آج تک محسوس ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے کہ فتح شدہ علاقے میں موجود سب سے بڑی غیر مسلم عبادت گاہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا کرتے تھے جو اسلام کی عظمت کا اعتراف تھا۔ آیا صوفیا کا گرجا بھی اسی روایت کے تحت مسجد میں تبدیل ہوا اور جب سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اسے میوزیم میں بدل دیا گیا لیکن اب پھر سے اسے مسجد کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ قلم کی کہانی بھی خوب رہی۔ نواب صاحب نے عمدگی سے قلم گری کی حقیقتیں بیان کی ہیں۔ امید ہے یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی رقاصہ لیے حاضر تھے۔ ایک ایسی ساحرہ کا قصہ جس نے ہر خاص و عام پر سحر طاری کیا تھا۔ کیا خوب کہا کہ زندگی کا دوسرا نام عورت ہے۔ ماتا ہری کی زندگی جتنی پُراسرار رہی اتنا ہی آشکار بھی تھی۔ دولت اور عیش و عشرت کی زندگی نے اسے کہیں جاسوسہ کا لقب دیا تو کہیں پر عزت کی قربانی کا صلہ ملا۔ کیمکو بقلم حسن رزاقی ایک ایسا سفرنامہ جو زندگی کے اتار چڑھاؤ پر مشتمل تھا۔ سفر کہانی پڑھ کر ہمیشہ دماغ تازہ ہو جاتا ہے اور سفر کرنے کا شوق بھی دل میں گھر کر جاتا ہے۔ جہازوں اور دفتری بکھیڑوں کے ساتھ ساتھ گھریلو حالات پر مشتمل یہ سفر کہانی بہت عمدہ رہی۔ سچ بیانیاں ہمیشہ کی طرح معاشرے کے تلخ حقائق کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ہم انسان بھی کتنے عجیب ہیں کہ پہلے ظلم کرتے ہیں اور پھر اس کی تشہیر۔ شاید یہی انسان کا معیار ہے جسے بدلنے کی چاہ میں وہ عمر بسر کر لیتا ہے اور عدم کو سدھار جاتا ہے۔ سچ بیانیوں میں "بدکار موبائل" از: ایم الیاس نے توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ موبائل کے نقصانات تو بہت پڑھے اور دیکھے مگر یوں موبائل کو بدکار کہنے اور پڑھنے کا موقع پہلی بار ملا۔ یہ سچ ہے کہ جہاں ایک چیز فائدہ مند ہوتی ہے وہیں کہیں نہ کہیں اس کا کوئی پہلو نقصان دہ بھی ہوتا ہے انسان نے جہاں ترقی کی ہے وہیں اپنی ترقی کو مٹانے کے ہتھیار بھی بنا ڈالے ہیں۔ موبائل ایجاد تو ہوا تھا باہم رابطے کے لیے مگر آج پوری دنیا اس چراغ کے پرزے میں سما چکی ہے۔ اسے چھوٹا سینما کہیں یا معلومات کا خزانہ، ہر پہلو واجب نظر ہے۔ مدیحہ کی کہانی بھی موبائل سے شروع ہوئی اور ساتھ ہی بربادی کی سڑک بھی بنتی گئی۔ والدین ہمیشہ اولاد کا بھلا سوچتے ہیں اور یہی بھلائی بعض اوقات اولاد کو باغی بنا دیتی ہے مگر یہاں مدیحہ کے ابو درست تھے۔ موبائل کے نقصانات کو دیکھ کر جوان اولاد پر نظر رکھنا لازم ہو گیا ہے لیکن شیطان جب سر پر سوار ہو جائے تو انسان ہزار بیڑیوں میں جکڑے ہونے کے باوجود اس کے جھانسے میں آجاتا ہے اور لازمی طور پر اپنا ہی خسارہ کر لیتا ہے۔ مدیحہ بھی بھٹک گئی لیکن پھر اسے نوید کی صورت میں انسان نامی شیطان ملا جس نے اس توبہ کار کی توبہ پر چوٹ کی اور اسے وہ کرنے پر مجبور کیا جس کی دلدل سے مدیحہ نکلی تھی۔ انجام وہی ہوا جو شیطان کے بہکاوے میں آنے پر ہوتا ہے مگر اس بار وہی انجام کس خوبصورتی میں بدلا وہ کمال ہے۔ "اداکار" از خالد شیخ طاہری بہت ہی عمدہ سچ بیانی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اداکار یا اداکاری کا نام سامنے آتے ہی انسان کے ذہنی پردے پر ایک تصویر چلنا شروع ہو جاتی ہے جس میں موجود اداکار رنگین کپڑوں میں ملبوس طرح طرح کی اداکاری سے تماشائیوں کے دل موہ لیتا ہے لیکن اصل زندگی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ یہاں ہر شخص اداکاری کے پردے میں بیکاری کرتے ہوئے ملتا ہے۔ جیسے اداکار مختلف ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھاتے ہیں ویسے ہی یہ سچ بیانی ایک اداکار و لیے ہوئے تھی جیسا ماں کہا گیا ہے۔ فراڈ اور ٹھگنے کے نت نئے واقعات تو نظر آتے ہی ہیں لیکن یہ سچ بیانی جو اگرچہ ایک پرانے طریقے پر ٹھگنے والے گروہ کی کہانی بیان کر رہی ہے پھر بھی اس میں ایک تسلسل تھا اور ہر سطر پر ایک جامع خیال کا تصور ابھرتا تھا۔ ایک ہی گھر میں بار بار گھسنا اور ایک ہی بیماری کو اداکاری میں بدلنا اس کی خوبی رہی۔ آخر میں جو ہوا وہ کسی کی سوچ میں نہ تھا۔ جہاں قارئین کسی اندوہناک واقعے کے انتظار میں تھے وہیں ایک حادثہ ہوا اور کہانی کا رخ بدل گیا۔"

تاخیر سے موصول خطوط: رضوانہ شاہنواز، ایبٹ آباد۔ سحر علی، لاہور۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔ شاہد حسین، مظفر گڑھ۔

یادوں کا سفیر

زین مہدی

مشرق تمدن کا نمونہ، لکھنؤ کی تہذیب کا نمائندہ کہلانے والے اس شاعر خوش نوا کی زندگی کا ہر لمحہ ایک کہانی ہے۔ کبھی غم تو کبھی خوشی کا مدو جذر اس کی زندگی کا سرمایہ رہا، جس میں غم کا سرمایہ کثیر ہے۔ انہیں یہ بھی فخر حاصل ہے کہ کراچی کی ادبی محافل کو اوج پہ پہنچایا۔ قیام پاکستان کے بعد رثائی ادب کی ابتدا کی اور پاکستان کے میر انیس کہلائے۔

ایک بڑے شاعر کا عکسِ زیست، مختصر حالاتِ زندگی

شیر شاہ سوری کی فوج طوفان کی طرح بڑھی چلی آرہی تھی۔ ہر طرف ایک گرد و غبار کا طوفان تھا۔ افواج کے بار بار حملے نے مغل سلطنت کی بنیاد ہلا دی تھی۔ اس کی فوج آگے بڑھتی اور مقابلے کی کوشش کرتی مگر شیر شاہ کے جاں نثار اسے آدھے راستے میں ہی جا دبوچتے 'فرار کی کالک سے چہرہ سیاہ کیے ہمایوں کے دستے اِدھر اُدھر بھاگ لیتے۔ نصیر الدین محمد ہمایوں نے بالآخر اصل معرکہ کے لیے قنوج کو منتخب کیا اور پھر اپنی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر کے قلعہ کو ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنے بھائی کامران سے مدد کی درخواست کی۔ اور ایک وفد مارواڑ کے راجا مال دیو کے پاس بھی بھیجی اس سے بھی مدد کی استدعا کی لیکن شومئی قسمت کسی نے بھی مدد کی ہامی نہ بھری۔ سب تماشا دیکھتے رہے اور شیر شاہ سوری کی سپاہ آگے بڑھتی چلی آئی۔ ایک سیلاب کی مانند بپھری ہوئی فوج تھی۔ کسی بھی طرح روکے نہ رکی ایک ہی حملے میں اس نے تمام حصار توڑ دیا اور شہر میں داخل ہوگئی۔ وہ تاریخ تھی سترہ مئی پندرہ سو چالیس عیسوی۔ ایسے موقع پر ہمایوں کے جانثاروں نے جان پر کھیل کر ہمایوں کو نہایت خاموشی سے فرار کرا دیا۔

ہمایوں پر ہند کی سرزمین تنگ ہوگئی تھی۔ اس کے لیے کہیں بھی امان نہ تھی۔ وہ جان بچا کر قنوج سے تو نکل آیا تھا مگر اب جائے تو جائے کہاں؟ اسے نہ اپنے بھائی پر اعتماد تھا اور نہ کسی دوست پر کیونکہ اس نے سب کو آزما لیا تھا۔ قنوج سے نکل کر وہ مغرب کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں پناہ ملے گی۔ اسی سفر میں وقت گزرتا گیا۔

دو سال کا عرصہ سفر میں گزر چکا تھا۔ اس نے تھر کے ریگستان کو سفر کے لیے منتخب کیا تھا تا کہ دشمن اگر تعاقب کرے

تو دور ہے اسے دکھ لیا جائے۔ گرم دنوں میں تھر کے ریگستان کو پار کرنا آسان نہیں۔ اس پر اس کی بیوی حمیدہ بانو حاملہ تھی۔ ایسے وقت میں تھر کے راجا رانا پرتاب راؤ نے اپنی چھوٹی سی ریاست کے مطابق مدد کی پیشکش کی۔ انہیں اپنا مہمان ٹھہرالیا۔ کیونکہ حمیدہ بانو کا گھوڑا بھی مر چکا تھا۔ ایسے برے وقت میں عمر کوٹ کی سرزمین پر حمیدہ بانو نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ (15 اکتوبر 1542 کو پیدا ہونے والے اسی بچے نے بڑے ہو کر اکبر کے نام سے ہند کی حکومت سنبھالی تھی) ایک طرف جانشین کی پیدائش کی خوشی تھی تو دوسری طرف اپنی کسمپرسی کا غم۔ وہ اب جائے تو کہاں جائے یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے کہ ہر طرف دشمن تھے۔ ایسے وقت میں، اس کے ساتھ چل رہے مشیروں میں سے کچھ نے مشورہ دیا کہ ایرانی سلطنت سے رابطہ کیا جائے۔ اس وقت سلطنت ایران سب سے طاقتور سلطنت مانی جاری تھی۔ ایرانی مہر بادشاہت کی قوت سے دنیا آگاہ تھی۔ وہاں طہماسپ کی حکومت تھی۔ وہ اگر ساتھ دے دے تو ہمایوں کی فتح یقینی ہے۔ اس مشورے کو ہمایوں نے بھی پسند کیا اور اس نے ایران کا رخ کرلیا۔

اسے علم تھا کہ طہماسپ اس کے خاندان کو پسند نہیں کرتا پھر بھی ایک اُمید تھی کہ شاید وہ اس کی مدد کردے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی ایسا تھا بھی نہیں جو اس کسمپرسی کے وقت ہمایوں کی مدد کرتا۔

ہمایوں کو ایرانی حدود میں داخل ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے بھائی کامران مرزا نے جو کابل و قندھار کا حکمران تھا اس نے شیر شاہ سوری کے خلاف بھائی کی تو کوئی مدد نہ کی مگر جب اسے پتا چلا کہ وہ ایران مدد حاصل کرنے پہنچا ہوا ہے تو اس نے شہنشاہ ایران کے پاس مراسلہ بھیج دیا کہ اسے ہمایوں زندہ یا مردہ حالت میں چاہیے۔ طہماسپ نے جواب میں ہمایوں کی مدد کا اعلان کر دیا۔ اس نے تین سو خیموں۔ شاہی قالینوں سے سجا۔ فوجی سازندوں کی بارہ جماعت جس میں ہر سازندہ اپنے وقت کا ماہر۔ کہ ان کے ساز بجتے ہی افواج میں نئی قوت دوڑ جاتی۔ رگوں میں جوش بھر جاتا۔ ساتھ ہی بارہ ہزار سپاہ مع آلات حرب بھی ہمایوں کو دیا کہ اگر تم نے کامران کو شکست دے دی تو ہرات تمہارا۔ ہمایوں نے حملہ کیا اور فتح اس کا مقدر ٹھہرا۔

اس کامیابی نے اسے حوصلہ بخشا اور وہ اب ایک نئے عزم سے ہند فتح کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے ہند کی جانب روانگی شروع ہی کی تھی کہ راستے میں اس کی اس عظیم الشان فوج میں مزید سپاہ شامل ہوگئے۔ ہوتی قبائل کے لغاری، کھوسہ اور سندھ کے جنگجو بھی اس کی حمایت پر اس کے ہمراہ ہوگئے اور 22 جون 1555 کو انہوں نے سرہند پر حملہ کیا اور اس قلعہ کو فتح کی بنیاد بنالیا۔

اس وقت ہمایوں کے ساتھ ایرانی جرار کا لشکر تھا جو کسی بھی حصار کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ جب دشمن پر نوٹتے تو شیر کی طرح دشمن کو دبوچ کر چیر پھاڑ دیتے۔ اس لشکر میں دیگر سرداروں کے ساتھ نشاپور کے ماہر شہسوار سید محمود رضوی بھی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت امام رضاؑ سے ملتا تھا۔ سید زادے تھے مگر بہترین جنگجو بھی تھے۔ وہ ہمایوں کے ہراول دستے میں شامل تھے۔

ہند کو فتح کرنے کے بعد مغل حکومت کا پرچم پھر سے لہرا گیا۔ ایران سے آئے بہت سے سپاہ لوٹ گئے لیکن سید محمود رضوی نے ہند میں ہی قیام کا ارادہ کرلیا۔

گدائے شاہِ خراساں ہند میں آئے
شعار صبر و رضا اپنا اور لقب رضوی
مٹایا گو فلک کج مدار نے ہم کو
مٹا سکا نہ مٹے گا یہ رنگ مرتضوی

انہوں نے کسی بڑے شہر کو منتخب کرنے کی بجائے چھوٹے شہر میں قیام کو پسند کیا۔ ایک کے بعد دوسرا علاقہ دیکھتے رہے۔ بالآخر ان کی نظر انتخاب لکھنو اور کان پور کے درمیان واقع ایک قصبہ جو اس وقت بہت ہی چھوٹا سا تھا اسے پسند کیا۔

موہان نامی اس قصبے میں وہ قیام پزیر ہوگئے۔ بعد میں وہ قصبہ ضلع اناؤ کا قصبہ کہلایا۔ اسی موہان نے کئی دانشور پیدا کیے جس میں ایک حسرت موہانی بھی ہیں۔

موہان میں رہتے ہوئے انہوں نے پیشہ سپاہ گری کے ساتھ زمینداری پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ اب موہان ہی ان کا وطن بن چکا تھا۔ انہوں نے پوری طرح زمینداری پر توجہ مرکوز کردی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ بچے جوان ہوتے رہے۔ خاندان بڑھتا رہا۔ کئی پشت نے اس سرزمین کا اناج کھایا۔ ان کی زمینداری گھٹنے کی بجائے بڑھتی جارہی تھی اور اس خاندان کا شہرہ بھی پھیلتا جارہا تھا۔ انہی کی نسل میں سید قاسم علی بھی تھے۔

گو کہ اس خاندان کو موہان میں سکونت اختیار کیے

ہوئے کئی پشت گزر چکی تھی مگر سخاوت اور حسن سلوک ہونے کی وجہ سے شہرت دور دور تک تھی۔ قاسم کر سید قاسم علی کی ناموری بطور ایماندار رئیس لکھنو و کانپور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت، علمی شرافت، حسن انتظام اور غربا سے حسن سلوک کی وجہ سے ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کا بس ایک شوق تھا کہ زمینداری کو وسعت دی جائے۔ اپنے اس شوق میں وہ غربا کی دعا کو شامل رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور یہی ان کی کامیابی تھی کہ ان کی زمینوں میں وسعت آتی جا رہی تھی۔ وہ نہ صرف موہان بلکہ پورے اناؤ میں اپنے حسن سلوک کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہی خصوصیت ان کے بیٹے سید فرزند علی میں بھی موجود تھی۔

انہی فرزند علی کے صاحبزادے سید سرفراز علی تھے جنہوں نے زمینداری کے ساتھ سپاہ گری کا پیشہ بھی اپنا رکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک سحر انگیزی تھی۔ جو بھی ایک بار ملتا وہ گرویدہ ہوجاتا مگر جب ہاتھ میں تلوار آتی تو وہ شہباز سے کم نہ نظر آتے۔ جھپٹتے پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے کہ دشمن کا سر جب تک جدا نہ ہوجاتا ان کی تلوار نہ رکتی۔ ان کی بہادری کے قصے گھر گھر سنے جاتے۔ انہوں نے سلطنت اودھ کی سپاہ میں شمولیت اختیار کررکھی تھی۔ وہ واجد علی شاہ کی خاص پلٹن میں شامل تھے۔ اسی پلٹن میں جس نے 30 جون 1857 کو انگریز سپاہ کے حملے کو چنہٹ کے مقام پر روکا تھا اور نہ صرف روکا تھا بلکہ اس انگریز پلٹن کے ایک ایک فرد کو تہ تیغ کیا تھا۔ پوری پلٹن کا صفایا ہوگیا تھا۔ جسے انگریز اپنی بڑی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ بقول انگریز نامہ نگار اس پلٹن کے بہت کم سپاہی اپنی جان بچا سکے تھے۔ اسی شکست کا بدلا لینے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر انچیف سر کولن کیمبل ایک لاکھ سپاہ کے ساتھ لکھنو پر چڑھ دوڑا تھا۔ ادھر سلطنت اودھ میں صرف دو پلٹن تھی، منصور اختری اور نادری جس میں سپاہ کی تعداد کل پندرہ ہزار تھی۔ اتنی بڑی سپاہ کا مقابلہ آسان نہ تھا پھر بھی دونوں پلٹن نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ کئی گنا بڑی افواج سے جنگ کرنا آسان نہ تھا۔ انجام وہی ہوا کہ اس قلیل سپاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس شکست نے اس خاندان کی برسہا برس کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ شکست انفرادی ہو یا قومی، اثاثے پر بات بن جاتی ہے۔ انگریز حکومت نے بھی اثاثوں پر ہاتھ ڈالا۔ سید سرفراز علی کی زمین ضبط کرلی اور ان کی زمینیں ان لوگوں میں تقسیم کردی جنہوں نے قوم سے غداری کی تھی۔ شاہ اودھ کے

آپ رضا پچاس برس تک غزل گوئی کے ساتھ میں ایک ماہر غوطہ زن کی طرح گوہر آب دار اور در شہوار تلاش کرتے رہے۔ اس بحرِ غزل کی غوطہ زنی میں انہیں بہت سے لعل و یاقوت اور جواہر و نگین ملے جنہیں انہوں نے دو دلکش اور مرصع پاروں میں پرو کر دو مجموعوں میں "نوائے رضا" اور "غزل معلی" کے نام سے پیش کیا۔

سید آل رضا کی شہرت و مقبولیت میں ان کی غزل گوئی کو بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی غزلوں میں لکھنوی لسانی لطافتیں اور تہذیبی نفاستیں نہایت خوب صورت شکل میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید آل رضا لکھنو کے دورِ جدید کے ان شعرا میں ہیں جنہوں نے جلال، آرزو اور صفی جیسے اساتذہ فن کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا اور سراج لکھنوی اور ثاقب لکھنوی کے ساتھ مل کر لکھنو کی بساط شاعری کو رونق بخشی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اپنے کارناموں کے سبب آل رضا کا نام ہمیشہ جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

☆☆☆

اردو میں جدید مرثیہ نگاری کی روایت کو تاب و توانائی عطا کرنے میں سید آل رضا کی خدمات قابل قدر اور لائق منزلت ہیں۔ جبھی تو اردو کے عظیم شاعر اور جدید مرثیہ نگاروں کے سرخیل جوش ملیح آبادی نے آل رضا کی خدمات جلیلہ کا اس انداز میں اعتراف کیا ہے "مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسین کے کردار کو پیش کر کے مومن کو یہ سبق دے کہ دیکھو، اگر تم حسینی ہو تو خبردار، باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور قربان روایات دہر کو خاطر میں نہ لانا۔ یہ تاج فخر قدرت نے سید آل رضا کے واسطے عطا کر رکھا تھا۔"

سید آل رضا نے 1939ء میں نجم آفندی کی نظم "اشارات غم" سے متاثر ہو کر اپنا پہلا مرثیہ تصنیف کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر نجم آفندی کے انقلابی اشعار نہ ہوتے تو میں جدید مرثیہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

زمینیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ محلوں میں رہنے والے جھونپڑی میں آ گئے مگر سید سرفراز علی نے ہمت نہ ہاری، حالات کے سامنے ڈٹ گئے۔ میدان بدل لیا۔ تلوار کو دیوار پر ٹانگ دیا اور ایک نئے عزم سے کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے سوچ لیا کہ سلطنت اودھ نہیں تو سپاہ گری سے تعلق کیسا؟ اسی لیے انہوں نے نئی راہ منتخب کی۔

خاندان سادات اور علم دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ علم کو ہی دولت سمجھتے ہیں۔ پشت در پشت یہی وتیرہ رہا ہے، اسی لیے انہوں نے دوبارہ سے علمی میدان کو ترجیح دے دی۔ بچوں کو تعلیم کی جانب راغب کر دیا۔ دونوں بیٹے سید فرزند علی اور سید علی رضا کو مروجہ تعلیم دلوائی۔ سید علی رضا نے وکالت کی تعلیم حاصل کی اور ہردوئی کی عدالت میں قانونی پریکٹس کرنے لگے۔ خاندانی تھے، سوچ و فکر ورثہ میں ملا تھا۔ مقدمہ آتا تو وہ خوب تیاری کرتے۔ ایک ایک نکتے پر خوب غور کرتے۔ رف آئیڈیاز بناتے، ہر رخ سے اسے پرکھتے پھر کچہری میں جاتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سید علی رضا کی شہرت پھیلنے لگی۔ ان کے استدلالی بیان اور فن خطابت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ لوگ کہتے کہ ان کے پاس آنے والا مقدمہ کامیاب ہوتا ہے۔ ان کی لغت میں لفظ ناکامی ہے ہی نہیں اسی لیے لوگ ان کی خدمت حاصل کرنے کے لیے لوٹنے پڑتے تھے۔

ان کی شادی میر امراؤ علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے صرف ایک بیٹا تولد ہوا تھا جس کا نام انہوں نے سید محمد رضا رکھا تھا۔

سید علی رضا شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی زمینیں جاگیریں ضبط کر کے مسلمانوں پر زوال لا دیا ہے۔ اس کا مقابلہ صرف تعلیم سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ سر سید احمد خان کے کٹر حامی بن چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے تعاون سے ہی مسلمانان ہند کی خدمت کی جا سکتی ہے تاکہ مسلمانان ہند ملک میں سرفراز ہو سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سید محمد رضا کو انگریزی تعلیم دلوا رہے تھے۔

سید محمد رضا نے صرف انگریزی تعلیم ہی حاصل نہ کی بلکہ برطانوی حکومت کے اعلیٰ امتحانات بھی پاس کیے۔ وہ ابتدا میں منصف تھے پھر سب جج ہوئے پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ وہ 1926 تک اودھ کے مختلف اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی وجہ شہرت ان کا فن کلام ہوتا تھا۔ وہ عدالت میں بھی اکثر وکلا سے ایسی کوئی بات کہہ جاتے جو ہنسی کا سبب بن جاتی۔ ایک خاص الزام بھی ان پر تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ یہ الزام متعصب وکلا یا کلائنٹ کی جانب سے تھا۔

1928 میں وہ لکھنؤ چیف کورٹ کے جج بنا دیے گئے۔ اس تقرری پر لکھنؤ کے لوگوں نے خاصی خوشی کا اظہار کیا کیونکہ ان کا شمار اودھ چیف کورٹ کے پانچ اولین ججوں میں ہوتا تھا۔ اچھی شہرت اور حسن اخلاق کی وجہ سے وہ مقبول بھی تھے۔ جب تک اپنے عہدے پر رہے کسی نے انگلی نہ اٹھائی۔ اسی اچھی شہرت کی وجہ سے وہ وائسرائے کے یہاں بھی مقبولیت رکھتے تھے۔

1934 میں وہ سینئر جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ ان کی مقبولیت ہی تھی کہ انگریز وائسرائے نے ان کے حسن لیاقت اور خدمات جلیلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کونسل آف اسٹیٹ کا ممبر نامزد کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی، ایسے وقت میں جب مسلمانوں کو دبانے کی پوری کوشش ہو رہی تھی۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کو ترجیح دی جا رہی تھی کہ ایسا عہدہ انہیں تفویض کیا گیا لیکن قسمت کو کیا کہیے کہ اس نے اپنا وار کر ہی دیا۔ تینتیس سال کی سروس کے بعد ایک سال کی بھی پنشن نہ لے پائے اور موت انہیں اپنے ساتھ لے گئی۔

سید محمد رضا کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے سید آل رضا تھے۔ ان سے چھوٹے کاظم رضا تھے جو قیام پاکستان سے قبل یوپی میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل یعنی ڈی آئی جی تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب حق انتخاب ملا تو انہوں نے پاکستان کی خدمت کا آپشن دیا۔ ان کی خواہش پر انہیں پاکستان جانے کی اجازت دے دی گئی اور وہ پاکستان آ گئے۔ انہیں کراچی میں ڈی آئی جی کا عہدہ ملا۔ بعد میں وہ ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر جنرل آف پولیس مقرر ہوئے۔ پھر وہ انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی خاندانی شرافت کا ایک معمولی واقعہ لوگ سنایا کرتے ہیں کہ ایک کاروباری صاحب جو اب ایک بڑے کاروباری خاندان کے فرد ہیں وہ ایک کاروباری سلسلہ میں ہوائی جہاز سے لاہور جا رہے تھے۔ انہوں نے ائرپورٹ جانے کے لیے ایک ٹیکسی لی۔ اس وقت خال خال لوگ ہی

ٹیکسی پر سفر کرتے تھے۔ ان کی ٹیکسی میکلوڈ روڈ پر نہایت تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ ایک کار ٹیکسی کا تعاقب کر رہی ہے۔ وہ صاحب گھبرا گئے کہ پتا نہیں اس کار میں کون ہے، تبھی کار نزدیک آ گئی اور ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ کار بھی رکی اور اس کار سے ایک پولیس کے اعلیٰ افسر کو اترتے دیکھا کاروباری شخصیت مزید گھبرا گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس آفیسر نے بتایا کہ ٹیکسی کے پچھلے پہیے میں ہوا اتنی کم ہو چکی ہے کہ وہ کچھ دیر کا مہمان ہے۔ کسی بھی جگہ جب اس پر دباؤ پڑے گا تو ٹیوب پھٹ جائے گا۔ اسی خطرے کی وجہ سے ٹیکسی روکی گئی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے افسر کا شکریہ ادا کیا اور تاثر بدلنے لگا لیکن تاجر صاحب کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ افسر نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ مجھے ہوائی جہاز سے لاہور جانا ہے اور جہاز کی روانگی کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

افسر نے مسئلہ سن کر کہا۔ "ایسا کریں کہ ٹیکسی والے کو اس کا کرایہ دے دیں اور آپ میرے ساتھ آ جائیں میں آپ کو ائرپورٹ چھوڑ دوں گا۔"

تاجر ڈرتے ڈرتے ان کی کار میں بیٹھا کیونکہ افسر کی وردی بتا رہی تھی کہ وہ پولیس کا بہت بڑا کوئی افسر ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ایک گارڈ بھی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس وقت الگ سے موبائل بھر پولیس، افسر کا رعب دکھانے کے لیے ساتھ چلنے کا رواج آیا نہیں تھا صرف ایک گارڈ ساتھ ہوتا تھا اور یہ ایک گارڈ بھی رعب ڈالنے کے لیے بہت تھا۔

چودہ میل کا فاصلہ طے کر کے اس تاجر کو ائرپورٹ پر چھوڑا اور وہ افسر واپس چل دیا۔ بعد میں جب تاجر کو معلوم ہوا کہ یہ افسر کاظم رضا تھے تو وہ ایک ایک کو یہ قصہ سناتا کہ افسر ایسا ہونا چاہیے۔

سید کاظم رضا کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ عوام اور خواص دونوں میں حد درجہ مقبول تھے۔ ایسے پچاسوں قصے ہیں جو ان سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی پوسٹ پر رہتے ہوئے بھی وہ اسی وجہ سے ہر دل عزیز تھے۔ انہیں کنگز پولیس مڈل بھی ملا تھا۔ جو بہادری، کسی خاص کارنامے پر ہی دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے دور میں کسی مسلمان کو یہ مڈل ملنا آسان نہیں ہے۔ یہی نہیں قیام پاکستان سے قبل انہیں ایک اور اہم تمغہ بھی ملا تھا جو ان کی اعلیٰ خدمات کا صلہ سمجھا جا سکتا ہے۔

آل رضا کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں

دیوانہ ہوں، کھویا ہوا دل ڈھونڈ رہا ہوں
ہر حسن کے جھرمٹ پہ ہے دھوکا کہ یہیں ہے

رضا کتنی حسیں اور مختصر شرح محبت ہے
نہ پاس آئے تو دوزخ ہے جو پاس آئے تو جنت ہے

اس نے آنکھوں میں ادا کی تھی رضا رسم سلام
دیکھتا ہوگا کوئی، ہاتھ اٹھائے نہ بنا

پھر لاکھ محبت کو رضا کوئی سنوارے
آغاز محبت کا زمانہ نہیں آتا

وہ رسم عشق کی منزلیں، وہ نزاکتیں، وہ لطافتیں
کبھی لطف آفت جاں بنا، کبھی جھڑکیوں نے مزا دیا

حسین قدموں سے لپٹی ہوئی کشش تھی جہاں
وہیں تھا دل بھی رضا اور دل کہاں ہوتا

وہ چپ سوال رضا پہ، رضا خوشی پہ
کسی طرف سے کسی بات کا جواب نہ تھا

رضا کھیلتا تھا غم زندگی سے
محبت کو ہم نے وسیلہ بنایا

کچھ میری نظر نے اٹھ کے کہا، کچھ ان کی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو نہ برسوں میں چکتا، طے ہو گیا باتوں باتوں میں

کسی کی کارسازی کا پتا دیتا ہے، آخر میں
مرے ہر کام کا آغاز میں دشوار ہو جانا

یوں تو بے تابی میں اس محفل کو چھوڑ آنا پڑا
کیا کہیں پھر کیا ہوا، جب دل کو سمجھانا پڑا

اس تمغہ کو وائسرائے پولیس میڈل کا نام دیا گیا تھا۔

اتنے سارے تمغے یوں ہی نہیں مل جاتے، اس کے پیچھے خدمات کی طویل فہرست ہوتی ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد وہی رعب داب والی شخصیت مرنجان مرنج شخصیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کسی چھوٹے موٹے جرم میں ملوث شخص کے بارے میں کوئی سفارش کر دیتا تو وہ پوچھتے بھی نہیں اور اپنے اختیار کے مطابق اسے رہا کروا دیتے لیکن اس سے یہ وعدہ بھی کروا لیتے کہ آئندہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا۔

سید محمد رضا کے تیسرے بیٹے عباس رضا تھے۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ جوڈیشل سروس سے وابستہ تھے۔ پہلے سب جج تھے پھر ڈسٹرکٹ جج بنے۔ وہ سسرالیوں کے زیر اثر تھے اور سسرال پکّا کانگریسی تھے۔ ان کے ہم زلف سید علی ظہیر جو یو پی کی نامور شخصیت سید وزیر حسن کے صاحبزادے تھے اور بعد میں وزارت بھی انہیں ملی تھی۔ انہی کے اصرار پر عباس رضا انڈیا میں ہی رک گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال 1969 میں ہوا۔ ان کی شخصیت میں بھی ایک وقار ایک تمکنت تھی، اگر پاکستان آجاتے تو وہ بھی اعلیٰ خدمات سے وطن کو سنوارنے میں اپنا کردار ادا کرتے لیکن ہمزلف کی ضد نے انہیں مجبور کردیا۔ آج ان کے بچے وہیں زندگی گزار رہے ہیں۔

سید محمد رضا کے چوتھے بیٹے ہاشم رضا تھے۔ یہ تمام بھائیوں میں زیادہ اسلام پسند تھے۔ مذہبی اس معنوں میں تھے کہ نماز روزے کے پابند تو تھے ہی مسلمانوں کی جانب بھی بہت زیادہ جھکاؤ رکھتے تھے۔ کالج کے دنوں میں بھی ہندو دوست انہیں متعصب کہا کرتے تھے لیکن وہ متعصب نہیں مسلمانوں کے ہمدرد ضرور تھے۔ انہوں نے 1932 لکھنو یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا اور اوّل آئے تھے۔ پھر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے، کامیابی حاصل کی اور تربیت کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ آکسفورڈ سے تربیت حاصل کی اور واپس آتے ہی احمد نگر میں بطور ڈپٹی کلکٹر تقرر ہوا۔ ساڑھے تین سال بعد وہاں سے ناسک بھیجا گیا۔ ناسک مہاراشٹر کا ایک اہم ضلع مانا جاتا تھا۔ بمبئی اور پونہ کے بعد یہ صوبے کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ اتنے بڑے شہر کے ڈپٹی کلکٹر بن کر بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ انہیں ایک کمی سی محسوس ہوتی۔ دراصل ناسک مہاراشٹر کا شہر تھا۔ مراٹھی اپنے پیشوا شیواجی کو بہت زیادہ مانتے تھے۔ ہر گھر، ہر دکان میں اس کی تصویر لگانا فرض سمجھتے تھے اور یہ بات ہاشم رضا کے دل میں چبھتی تھی اس لیے کہ شیواجی مسلمانوں کا دشمن تھا۔ اس نے اپنے دور میں مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ وہ ایک کمین فطرت، بے اصول، دھوکے باز اسلام دشمن شخص تھا مگر مراٹھیوں کے نزدیک ان کا ہیرو تھا۔ وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس کی مورتی گھر میں رکھتے تھے۔ اس کی تصویریں نمایاں جگہ پر لگاتے تھے اور یہ دیکھ دیکھ ان کا خون جلتا تھا اس لیے انہوں نے حکومت بمبئی کو درخواست دی کہ سندھ بھی آپ کی عملداری میں ہے اس لیے میرا تبادلہ سندھ میں کرادیا جائے۔ پونہ ڈویژن کے اس وقت کمشنر تھے سر جے ڈبلیو اسمتھ۔ انہوں نے درخواست دیکھی تو انہیں بلا کر سوال کیا کہ لوگ بڑے علاقوں میں جانا چاہتے ہیں اور آپ ایک غیر ترقی یافتہ۔ ریگستان میں جانا چاہ رہے ہیں۔ کیا یہ ایک حیرت کی بات نہیں ہے؟ وہاں آپ کتنے لوگوں کو جانتے ہیں؟

اب ذرا سوچ کا در کھولیں اور 1937 کا دور ذہن میں لائیں۔ ابھی پاکستان کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ سندھ پر ہندو وڈیروں کا قبضہ تھا پھر بھی انہوں نے دبنگ جواب دیا۔ وہ بولے۔ "میں وہاں ایک بھی شخص کو نہیں جانتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہاں جو لوگ رہتے ہیں ان سے میرا ایک رشتہ ہے۔ وہ مسلمان ہیں اور ان سے میرا اسلامی رشتہ ہے، اسی لیے میں سندھ جانا چاہتا ہوں۔"

اپنے ماتحت افسر سے انگریز افسر کو ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے گم صم ہوگیا پھر بولا۔ "سندھ میں گرمی بہت پڑتی ہے۔ وہاں جاکر پچھتاؤ گے۔"

"سر ہم جب ڈیوٹی پر ہوتے ہیں تو سردی گرمی کی پروا کسے ہوتی ہے؟"

سر اسمتھ نے جھک کر سرگوشی میں کہا۔ "سن رکھو ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوتا، اسے آزاد ہونے میں پچاس سال لگیں گے اور پاکستان بننے میں تو سو سال کا عرصہ لگے گا پھر سندھ کے زیادہ تر بڑے ہندو ہیں اس لیے وہ پاکستان کے حصے میں جائے گا اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"

اس بات نے ان کے دل کو سخت چوٹ پہنچائی اس لیے کہ کہنے والے کا بیان ہے (مضمون "مت سہل ہمیں جانو" ماہنامہ جام نو، کراچی) کہ ہاشم رضا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ جذبات میں آگئے تھے لیکن اپنے انگریز افسر کو منہ توڑ جواب نہیں دے سکتے تھے پھر بھی انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سر، مجھے امید ہے کہ پاکستان میری زندگی میں معرض وجود میں آئے گا اور میری دعا ہے اسمتھ صاحب کہ آپ کی زندگی بھی اتنی بڑی ہو کہ آپ مملکت پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت زندہ ہوں۔" (بحوالہ: سید آل رضا: شخصیت وفن۔ اکادمی ادبیات پاکستان)

مزے کی بات یہ ہے کہ پورے دس سال بعد ہاشم رضا نے مسٹر اسمتھ کو ایک دلچسپ خط لکھا۔ 1947 میں قیام پاکستان کا خواب پورا ہوگیا اور وہ کراچی میں اپنی ڈیوٹی پر تھے کہ انہیں اسمتھ کی بات یاد آگئی اور انہوں نے اسے ایک

دلچسپ خط لکھ بھیجا۔ "جس پاکستان کے وجود میں آنے کا آپ نے سو برس کے عرصے کی بات کہی تھی وہ صرف دس برس سے بھی کم عرصہ میں دنیا کے نقشہ میں ابھر آیا اور میں وہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

حب الوطنی سے سرشار اس شخص کو جو 1939 میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے سندھ میں تعینات ہوا تھا، بعد ازاں مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہا۔ 1961 میں سابق مشرقی پاکستان کے چیف سیکریٹری بھی رہے۔

سید محمد رضا کے پانچویں بیٹے سید مسعود رضا بھی انگریزوں کے دور میں ہی انڈیا میں رہتے ہوئے آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے مقابلے میں کامیاب ہوکر وہیں تعینات ہوچکے تھے لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستان آگئے اور اسی محکمے میں رہتے ہوئے ترقی کی منزل طے کرتے رہے۔ اکاؤنٹ جنرل بنے اور پھر آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے عہدے پر مامور ہوئے۔ بعد ازاں اکاؤنٹس میں خداداد صلاحیتوں کی بدولت اقوام متحدہ کے بورڈ آف آڈیٹ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اقوام متحدہ کے دس بارہ اداروں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال ان کے ذمے تھی۔

وہ پنڈی آئے ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس موقع پر اس وقت یو این او کے جنرل سیکریٹری یوتھان نے مرحوم کی بیوہ کے نام ایک تعزیتی خط لکھا:

I know what a great personal loss it is to you.itis not only your personal loss but the great loss of your country and i assure you that this is also of the united Nations.

سید محمد رضا کے پانچ بیٹے، ان پانچوں میں وہی خصوصیات تھیں جو سید محمد رضا کی پہچان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ حلال لقمہ مزاج میں تبدیلی لاتا ہے اور ایسی مثبت تبدیلی ایمان کی تازگی کی پہچان ہے۔ ایمان دار والدین کے بچے بھی ایماندار ہی ہوتے ہیں۔ ان کے پانچ بیٹوں کا مختصر تعارف تو دے دیا لیکن یہ بتانا بھول گیا کہ ان کی تین بیٹیاں بھی تھیں۔ ایک بیٹی کا نام سعید فاطمہ تھا۔ سعید فاطمہ سترہ برس کی عمر میں وفات پاگئی۔ دوسری بیٹی لئیق فاطمہ تھی۔ وہ ابھی چودہ سال کی تھی کہ معمولی سی بیماری میں موت کی گود میں جا سوئی۔ تیسری بیٹی عقیل فاطمہ اس کی شادی امروہہ کے تصور حسین نقوی سے ہوئی تھی۔ وہ یو پی میں محکمہ زراعت کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ قیام پاکستان کے وقت تصور حسین رام پور میں تعینات تھے۔ انہوں نے پاکستان آنے کے لیے آپشن کا فارم بھرا لیکن انہیں اجازت نہیں ملی تو

سید آل رضا نقادوں کی نظر میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

آل رضا ایک قادر الکلام شاعر تھے اور یہ قادر الکلامی انہیں اپنے خاندان اور ماحول سے وراثت میں بھی ملی تھی اور اس میں نکھار، نیز نئے پن کے آثار انہوں نے ذاتی محنت و مشقت سے پیدا کیے تھے۔ وہ ہر صنف سخن پر قادر تھے لیکن غزل ان کا خاص وسیلہ اظہار تھی اور غزل ہی ان کی اصل شناخت ہے۔ ان کی غزل کوئی بلحاظ زبان و بیان لکھنو کے اس دبستان شعر اور رنگ سخن سے تعلق رکھتی ہے جس میں ثاقب، آرزو، عزیز، سراج اور صفی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ 1947ء کے بعد ابھر کر سامنے آنے والے ایسے لکھنوی شاعر ہیں جو پاکستانی شعرا میں سب سے بلند و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں قدیم و جدید اور غم روزگار و غم جاناں دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور ایسی دل کش و توانا ہیں کہ مطالعے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوجائے گا کہ آل رضا اردو غزل کے کیسے نغز گو شاعر ہیں۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی

جدید مرثیہ نگاروں میں سید آل رضا کا مرتبہ اور منصب، مقام اور اہمیت سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کا آہنگ اور انداز، موضوعات، الفاظ و تراکیب، شعری نزاکتیں اور اسلوبی لطافتیں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں جن کو سید آل رضا نے بلندی تخیل، ندرت فکر اور اچھوتے اسلوب بیان سے ایک نمائندہ مرثیہ نگاری کی بنیاد بنادیا ہے جس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں سید آل رضا کے مخصوص انداز و اسلوب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس صدا میں انسانیت، اسلام، حسینیت اور کربلا کے سوتے رواں نظر آتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں انسان اور انسانیت کا ایک اعلیٰ تصور ملتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد وہ
وہ ملازمت چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ اعلیٰ افسر ہونے کے بعد بھی انہیں مختلف تہی دست ہو گئے۔ ان کی قابلیت کو مدِنظر رکھتے قسم کی پریشانیوں کا سامنا تھا۔ انہیں زمیندار مہاجرین کے ہوئے راجا صاحب محمود آباد نے لیے بنائی گئی سوسائٹی کا انہیں صدر منتخب کرلیا۔

یہ تھا سید محمد رضا کے بچوں کا مختصر تعارف۔ اب ہم دوبارہ ان کے بڑے بیٹے آل رضا کی طرف چلتے ہیں۔ وہ علم وادب کے شیدائی تھے۔ گو کہ سید محمد رضا بھی ادبی ذوق رکھتے تھے لیکن صرف پڑھنے کی حد تک۔ انہیں پورا پورا دیوان ازبر تھا لیکن نہ تو کبھی نثر لکھنے میں دلچسپی لی اور نہ شعر کہنے میں۔ ان کے ذوق کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ جب جواں سال بیٹی کو دفنانے کے بعد گھر سے ہوئے تو دکھ بھرے لہجے میں میر تقی میر کا یہ شعر پڑھا:

نہ تھا معلوم اے آرام جاں، اس نامرادی میں
کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

اور جب دوسری بیٹی لیئق فاطمہ نے اکیس دن میعادی بخار میں مبتلا رہنے کے بعد جان کھودی تو وہ میر انیس کا یہ شعر پڑھ کر رو گئے:

کچھ دن جو اپنے پاس رہے مستعار تھے
یہ لال سب امانت پروردگار تھے

سید محمد رضا کی بیگم آل فاطمہ بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ذاکرہ تھیں اور صاحب بیاض بھی تھیں۔ ان کے والد محترم بھی اہلِ علم میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا نام نامی سید مہدی حسن تھا۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا، انگلستان سے ہی 1892 میں بار ایٹ لا کیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر انہیں سی پی میں ڈپٹی کمشنر کا عہدہ مل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی برٹش حکومت کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ان کے گھر پر کچھ دنوں بعد شہر بھر کی ادبی شخصیات محفل جمایا کرتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ آل فاطمہ میں بھی شعر شناسی آ گئی تھی۔ ایسی گود میں پلنے والے آل رضا میں ادبی ذوق کیوں نہ پنپتا۔

اس میں دو رائے نہیں ہے۔ 10 جون 1896 کو ناؤ کے نیوتنی قصبے میں جنم لینے والے آل رضا میں، وہ تمام اوصاف ہر ایک کو نظر آنے لگے تھے جو ان کے گھرانے کی پہچان تھی۔ وہ اپنے والد سے زیادہ قریب تھے۔ ان کے لاڈلے تھے اور جہاں جہاں ان کا قیام ہوتا وہ ساتھ رہتے۔ اس وجہ سے والد کے تمام صفات ان میں آ گئے تھے۔ وہ بھی والد کی طرح علم وادب میں دلچسپی لیتے۔ اتنی سی عمر تھی لیکن اچھی خاصی تعداد میں اساتذہ کے کلام ازبر تھے۔ وہ جب سناتے تو سننے والے دنگ رہ جاتے کہ اتنی کم سنی میں اتنا کچھ اسے کیسے یاد ہے؟ دراصل ماں اور باپ دونوں ہی علم وادب کے شیدائی اس لیے ان کا ذوق بھی اسی جانب مائل رہا۔

گو کہ ابتدائی تعلیم گھر کی تھی پھر بھی جب 1908 میں انہیں سیتا پور اسکول میں داخل کرایا گیا تو اساتذہ تک ان کی شعر فہمی پر دنگ رہ جاتے۔ سلسلہ تعلیم شروع ہوا تو نہایت خوش اسلوبی سے جاری رہا۔ اپنی جماعت میں ایک مقام حاصل رہا۔ ایسے تیز طرار بچے یوں بھی اساتذہ کی نظروں میں عزیز رہتے ہیں۔ وہ بھی اساتذہ کی نگاہوں کا مرکز بنے رہے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اسکول کی ہر ایکٹیوٹی میں آگے آگے رہتے۔ خاص کر ادبی محافل کا جب جب بھی انعقاد ہوتا یہ خوب پُرجوش ہو جاتے۔ ان کی ایک عادت سے سب واقف تھے۔ وہ حد سے زیادہ حساس تھے۔ ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے۔ اپنی عمر سے بڑھ کر وہ مدد کر جاتے۔ ان کی اس کمزوری کا لوگ فائدہ بھی اٹھا لیتے۔ ایک دوست تھا۔ بعد میں وہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر براجمان ہوا۔ وہ اس کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتا۔ وہ شہر سے کسی نا کسی کو پکڑ لاتا اور کوئی ایسی کہانی سناتا کہ وہ آبدیدہ ہو جاتے اور پھر جیب میں جو کچھ ہوتا وہ اسے نکال کر دے دیتے۔ بعد میں اس دوست نے محفلوں میں راز کھولا کہ وہ پہلے ہی معاملہ طے کر لیتے کہ آل رضا جو دیں گے اس میں سے تین حصہ ان کا ایک حصہ اس شخص کا ہوتا۔

1912 میں جب آل رضا نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ آ گئے تب اس دوست سے جان چھوٹی۔

لکھنؤ آ کر آل رضا نے کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ کالج بڑا مشہور اور تعلیمی اعتبار سے معتبر۔ اچھے اساتذہ ملے۔ انہوں نے بھی دل لگا کر تیاری کی اور 1916 میں بی اے کی سند امتیازی نمبروں سے حاصل کر لی۔ خاندانی وقار، عربی وجاہت، مردانہ دلکشی، جوانی کا خمار انہیں الگ دکھاتا مگر وہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی صرف تہذیب لکھنؤ کا شہکار بنے رہے۔

وہ والد سے زیادہ قریب تھے انہیں اپنا آئیڈیل مانتے تھے اس لیے ان میں بھی یہ خیال پنپ رہا تھا کہ وہ بھی قانون پڑھنا چاہتے ہیں۔ لا کالج میں داخلے کے خواہشمند تھے کہ

ایک ایسی افتاد آن پڑی کہ ان کی شخصیت پر وار کاری ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ 1917.18 میں ایک عجیب وبا پورے ملک میں پھیل گئی۔ یہ وبا عالمی تھی اور ممالک غیر سے آئی تھی۔ اس نے پورے برصغیر کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس وبا کا اثر یوپی پر بھی پڑا، پورے صوبہ میں لوگ متاثر ہونے لگے۔ اموات کی شرح ناقابل یقین حد تک بڑھ گئی تھی۔ شومئی قسمت کہ اس وبا کا اثر ان کے گھر پر بھی پڑا اور ان کی سترہ سالہ بہن سعید فاطمہ جس کی شادی طے ہو چکی تھی۔ گھر میں شادی کی تیاری عروج پر تھی کہ وہ اس وبا کی لپیٹ میں آ گئی اور جانبر نہ ہو سکی۔

اس بے وقت موت نے آل رضا کے دل ودماغ پر ایک عجیب اثر ڈالا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلتا۔ بس ٹک ٹک دیکھتے رہتے۔ لوگ لاکھ کوشش کرتے مگر وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہتے۔ ان کا حال مجنون دیکھ کر گھر والے ایک نئی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک طرف جوان بیٹی کا غم دوسری طرف یہ افتاد، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی خاموشی کو کیسے توڑا جائے۔ تقریباً چھ ماہ لگ گئے ان کی زبان سے الفاظ نکلتے اور سنبھلتے سنبھلتے ایک سال لگا۔

اس مجنونہ کیفیت سے نکلے تو بھی غم کا بوجھ چہرے سے نظر آتا رہا۔ ابھی وہ اس غم کو سہہ ہی رہے تھے کہ ایک اور افتاد آن پڑی۔ ایک دوسری بہن لائق فاطمہ کو ایسا بخار نے گھیرا کہ وہ اتر کے نہ دیتا۔ شہر بھر کے حکیموں کو دکھایا گیا۔ دوا چلتی رہی مگر افاقہ ہو کر نہ دیا۔ لکھنؤ میں ایک سے ایک حکیم تھے تقریباً سب کو آزمایا گیا۔ ڈاکٹروں کو بھی دکھایا گیا لیکن بخار تھا کہ جان چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ یہ میعادی بخار تقریباً اکیس دن تک رہا اور اترا تو بچی کی جان لے کر اترا۔ اس غیر متوقع موت نے ان پر غم کا پہاڑ توڑ دیا۔ دو دو بہنوں کا غم جھیلنا آسان نہیں، ایسے وقت میں والدین نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو ان حالات میں کچھ عجیب سا لگا لیکن یہ بھی والدین کی دور اندیشی تھی۔ انہوں نے بیٹے کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ایسے ہی چلتا رہا تو کہیں بیٹا مکمل مجنون نہ بن جائے، اگر گھر میں نئی دلہن آ جاتی ہے تو گھر کا ماحول بدل جائے گا، غم کا اثر کم ہو جائے گا۔ اسی خیال کے تحت لڑکی کی تلاش کی جانے لگی۔ اِدھر اُدھر کئی لڑکیاں دیکھی گئیں قرعہ فال پریاواں کے نواب، احمد حسین کی بیٹی حسینی بیگم کے نام آیا۔ رشتہ بھیجا گیا، وہاں سے بھی قبول کر لیا گیا اور نہایت تزک واحتشام سے شادی انجام پا گئی۔ حسینی بیگم دلہن

ان کی جو غزل ان کی حیاتِ جاوید کی ضمانت بن سکتی ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں

کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت
شاخوں پر کم رہنے پائے، ہاتھوں میں کمھلائے بہت

بزم سے اپنی ہم کو اٹھا کر، منع کیا تھا آنے کو
جا کے اب اس کا بدلا لیں گے، یاد ہمیں کیوں آئے بہت

موسم گل کی سن گن پائی، جلدی جلدی گھر سے چلے
ویرانے کو بسا کر چھوڑا، گو کہ سڑی کہلائے بہت

پاس بٹھا کر شوق بڑھا کر، یہ بھی اشارے ہوتے ہیں
حسن کو لازم ہے کہ سنبھالے، عشق اگر اترائے بہت

درد محبت کیا کیا بخشے، پاسِ محبت کچھ نہ سہی
ایک ستم کا اس کے گلہ کیا، جس نے کرم فرمائے بہت

قسمت کا یہ پھیر بھی دیکھا، بجھنے والی پیاس بڑھی
مٹی ترسی، بوند نہ برسی، بادل گھر گھر آئے بہت

کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھل اٹھنے کو
یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت

انسانوں کا عجائب خانہ ہے تو رضا دل چسپ مقام
جس سے پوچھو، جس کو دیکھو، سمجھے کم، سمجھائے بہت

☆☆☆

مرثیہ گوئی میں مقام ومرتبہ حاصل کرنے کے لیے جس ذہنی کرب اور طویل ریاض سے انہیں گزرنا پڑا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر خود انہوں نے درج ذیل سطور میں کیا ہے: ''میری یہ ہمت کیوں کر پڑی کہ منبر پر جا کر ایک خالص جدید رنگ کا مرثیہ پڑھ دوں۔ ابتدا یوں ہوئی کہ فروری 1939ء کے محرم میں چاند رات سے فصل کی برسات شروع ہو گئی اور میں نے بے ساختہ کہا:

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

اس شعر کی کیفیت میں، میں کچھ اس طرح ڈوبا کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مرثیہ کہنے لگا۔ اب غزل گو رضا نہ تھا بلکہ مرثیہ گو رضا بن گیا۔''

بن کر ان کے گھر آگئیں۔ ان کی آمد نے سید آل رضا کو بڑا سہارا دیا اور وہ جو خاموشی کی چادر اوڑھ رکھی تھی اس سے باہر آگئے۔ زندگی کی دلچسپیوں میں شامل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ دو سال کے وقفہ کے بعد انہیں دوبارہ سے تعلیمی سلسلہ بحال کرنے کا خیال آگیا اور انہوں نے الٰہ آباد سے قانون کی تعلیم کا آغاز کر دیا اور 1920ء میں ڈگری حاصل کرلی۔

وکیل بن چکے تھے اس لیے پریکٹس بھی کرنی تھی۔ انہوں نے پریکٹس کے لیے لکھنو کا انتخاب کیا۔ ایک سال تک لکھنو کی عدالت میں وکالت کی ساتھ ہی ساتھ پرانے شوق کو بھی پورا کرتے رہے۔ ادبی محافل میں شرکت یقینی بناتے رہے لیکن یہاں پہلے سے ہی بڑے بڑے نامی گرامی وکیل اور بیرسٹر موجود تھے اس لیے انہوں نے پرتاپ گڑھ منتقل ہونا پسند کرلیا۔

پرتاپ گڑھ اتنا بڑا شہر نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر انہیں لکھنو کی یاد بہت زیادہ ستانے لگی۔ وہاں کی ادبی فضا، دوستوں کی سنگت، عزیزوں کی محبت ہر وقت کچوکتی رہتی۔ اس کا حل یہ نکالا کہ انہوں نے پرتاپ گڑھ میں ادبی فضا کو مہمیز دینا شروع کر دیا۔ خود بھی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنے گھر بھی محافل کا انعقاد کرتے۔ ایک اچھا خاصہ حلقہ ان کا بن چکا تھا۔ ان میں ایک نام بہت نمایاں تھا، وہ تھا شیخ مجم احسان مجم ایڈووکیٹ۔ وہی ان کے فن کو مسلسل مہمیز کرتے۔ چھیڑتے، کہنے کو اکساتے۔ ان کے اندر کے شاعر کو بیدار رکھنے کی جتن کرتے اور وہ شعری خزانہ سا جمع کرتے چلے گئے۔ 1922ء کو ان کی شاعری کا سال قرار دیا جاتا ہے۔ وکالت اور ادبی محافل کی مصروفیت بھی لکھنو کی یاد کم نہ کرسکی تھی۔ چھ سال کا عرصہ گزار کر وہ واپس شہر نگاراں لوٹ آئے۔ لکھنو کا ماحول انہیں کھینچ لایا۔

لکھنو واپس آتو گئے تھے۔ ادبی محافل میں بھی شریک ہونے لگے تھے مگر قانون کی پریکٹس نہ چھوڑی۔ لکھنو کی عدالت میں وکالت شروع کر دی۔ وکالت ان کا خاندانی پیشہ بن چکا تھا۔ دلائل کے گران کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ جب جج کے سامنے کھڑے ہوتے تو ایسا لگتا جیسے دلائل کا ایک سمندر سا بہہ رہا ہے۔ مقابل وکلا اس طرح سے چکرا اٹھتے کہ انہیں جواب نہ سوجھتا۔ وہ جواب تلاشتے رہ جاتے اور جج فیصلہ سنا رہا ہوتا۔ اکثر لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دلائل دینے، بحث کرنے

سید آل رضا کی تصانیف

(1) نوائے رضا

سید آل رضا کا یہ پہلا مجموعہ کلام ہے جو 1929ء میں لکھنو سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں پچاس غزلیں شامل ہیں۔ اسے سید آل رضا کے برادر خورد سید کاظم رضا نے مرتب کر کے شائع کیا تھا، نیز انہوں نے ''عرض حال'' کے عنوان سے اس شعری مجموعے کا مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ چودہ صفحات پر مشتمل کاظم رضا کا تحریر کردہ سید آل رضا کا یہ ابتدائی تعارف بذات خود بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اب تک سید آل رضا پر جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا جاچکا ہے اس میں کاظم رضا کے اس مقدمے کو نہ صرف اولیت حاصل ہے بلکہ یہ تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ 24 اگست 1929ء کو اینہ جیسے دور افتادہ مقام پر لکھا جانے والا یہ مقدمہ آل رضا کی غزل گوئی کا فن کارانہ طور پر نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ تخلیق شعر کے اسرار و رموز پر سے پردے بھی اٹھاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مقدمے میں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی تعریف کی ہے، بلکہ ایک وسیع المطالعہ نقاد نے ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے کلام کا محاکمہ کیا ہے۔

(2) شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد

یہ دو مختلف مرثیے ہیں جو کتابی صورت میں یک جا طور پر 1944ء میں لکھنو سے اشاعت پذیر ہوئے۔ کتاب کے آغاز میں سید آل رضا نے ایک 'مقدمہ' شامل کیا ہے جو ادبی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

(3) غزل معلّیٰ

سید آل رضا کی غزلیات پر مبنی دوسرا مجموعہ 1959ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ 176 غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت کا اہتمام ماہ نامہ ''افکار'' کراچی کے مدیر صہبا لکھنوی نے کیا تھا۔ مجموعے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ سید آل رضا نے ''عرض حال'' کے عنوان کے تحت سترہ صفحات پر مشتمل ایک پُرمغز مقدمہ شامل کتاب کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف کو فن شاعری کے جملہ اسرار و رموز سے محرمانہ واقفیت حاصل تھی۔

سید آل رضا نے 1929ء اور 1959ء کے درمیانی عرصے میں جو بھی غزلیں تحریر کیں، ان کا کچھ حصہ ''غزل معلّیٰ'' میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اگر تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو اس مجموعہ غزلیات میں شاعر کی غزل گوئی اعلیٰ مقام پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آل رضا نے صنف غزل کو اس دور میں پروان چڑھایا اور اس کو حسن و زیبائی عطا کی جب یہ ان اوصاف سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ غزل گوئی کا بانکپن، خصوصی اسلوب و ہیئت اور تاثیر نظر آرہی تھی۔ ایسے میں اس مجموعہ کلام نے تغزل کو وقار و عظمت عطا کیا۔ ''غزل معلّیٰ'' کی ان ہی خصوصیات کے پیش نظر اردو کے نامور نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا: 'غزل معلّیٰ' کی اشاعت ہماری شاعری کے اس دور میں، جب اعتبار غزل اٹھتا جارہا ہے، ایک اہمیت رکھتی ہے۔

سید آل رضا کی غزلوں کے اس دوسرے مجموعے کی اشاعت کے بعد ان کا غزلوں پر مشتمل کوئی اور مجموعہ اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ سید ہاشم رضا کے بقول: اس کے بعد کی غزلوں کو ابھی تک کاغذی پیراہن نہیں ملا۔

(4) شریکۃ الحسین

اگرچہ یہ مرثیہ دیگر مرثیوں کے مقابلے میں زیادہ طویل نہیں، لیکن اپنے موضوع، فن کارانہ چابک دستی اور کمال فن کی بدولت اردو کے رثائی ادب میں نہایت قدر و منزلت کا حامل ہوگیا ہے۔ اس کا سر مصرع ہی اس مرثیے کی عظمت کا پتا دے رہا ہے:

تھا جہاں، پھر وہیں قرآن کو لے آئے حسین

99 بندوں پر مشتمل ''شریکۃ الحسین'' کی ادبی اہمیت کا اندازہ اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر سید احتشام حسین کی مندرجہ ذیل رائے سے لگایا جاسکتا ہے:

تاریخ کے عظیم الشان واقعات کا دہرایا جانا ہی کافی نہیں ہے، جن اصولوں کی کش مکش کا وہ نتیجہ ہوتے ہیں، ان کے تجزیے سے نئی نسلوں کے لیے کچھ نتائج برآمد کرنا ہی مفکر کا کام ہے۔ آل رضا مفکر نہ تھے، لیکن انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ واقعہ کربلا میں جو سبق پوشیدہ تھا، اس کی جانب اشارے کر دیے جائیں۔

(5) ''تہذیب عبادت''

سید آل رضا کا یہ مرثیہ کتابی شکل میں دانش کدہ اکیڈمی، کراچی کے زیر اہتمام 1972ء میں شائع ہوئی۔ اس مرثیے میں 92 بند ہیں۔ مرثیے کا سر مصرع یہ ہے:

تہذیب عبادت ہے سراپائے محمد

میں اپنے والد کی تصویر بن جاتے تھے۔ ایسے ایسے نکتے اٹھاتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ ایک مقدمہ ان کے پاس آیا۔ مقدمہ بہت سیدھا سادا تھا۔ مدعی کے گھر میں چوری ہوئی۔ جس رات چوری ہوئی تھی مدعی کا باپ برآمدے میں سو رہا تھا۔ چور جب بھاگ رہا تھا تو اس نے چور کا نام لے کر شور مچا دیا۔ چور نے اپنے دفاع میں ہاتھ میں پکڑی درانتی پھینک کر اسے مارا جس کی وجہ سے وہ بری طرح گھائل ہو گیا۔ چوری کی تفتیش کے لیے پولیس آئی۔ مدعی نے اپنے تایا زاد کو نامزد کر دیا۔ پولیس نے پہلے تو اس بندے کو پکڑ لیا مگر بعد میں اسے چھوڑ دیا اس لیے کہ مدعی نے اپنے باپ کے کہنے پر ملزم پر الزام لگایا تھا۔ باپ دونوں آنکھوں سے نابینا تھا۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ایسے شخص کی گواہی کیسے لی جاتی۔ اسی وجہ سے کیس کمزور ہو گیا تھا۔ پولیس نے ملزم کو رہا کر دیا تھا۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے ان کی خدمت حاصل کی گئی، انہوں نے جج کے سامنے دلائل دینا شروع کیا ''می لارڈ، آپ نے سنا ہوگا کہ جن کی بینائی ختم ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی دیگر حسیں بیدار کر دیتا ہے۔ ان کے محسوس کرنے کی حس بہت زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ وہ صرف چھو کر بندے کو پہچان لیتے ہیں کہ کون ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی قوت شامہ بھی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ وہ ہلکی سی بو کو بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ اس دن ہوا یہ کہ چور جب واردات کے بعد مال مسروقہ لے کر بھاگ رہا تھا تو.....'' کہتے کہتے وہ خاموش ہوئے اور پھر دبے قدموں غیر محسوس انداز میں ملزم کے رہشر کے عقب میں چلے گئے اور انہوں نے تیز سرگوشی کے انداز میں پکارا ''لکھوا۔'' ملزم نے چونک کر کہا۔ ''کا؟''

انہوں نے کہا۔ ''می لارڈ آپ نے ملاحظہ کیا، اس دن ہوا یہ تھا کہ ملزم چوری کا سامان اٹھائے باہر جارہا تھا کہ مدعی کے باپ نے اس کے مشام سے اٹھتی بو سے اسے پہچان لیا اور اس کا نام لے کر پکارا۔ ملزم گھبرا گیا بالکل اسی طرح جیسے ابھی میں نے اس کا نام لیا تو یہ ملزم صاحب گھبرا کر جواب دے بیٹھے، کیا..... اسی طرح اس رات ہوا، جیسے ہی مدعی کے باپ نے اس کا نام لیا، ملزم گھبرا اٹھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی پھینک ماری۔ اب فیصلہ فاضل عدالت کرے کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔

جج نے اسی وقت فیصلہ سنا دیا۔ اپنے کئی صفحے کے فیصلے میں جج نے لکھا کہ میں بھی ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں جو نابینا ہیں اور وہ پھر بھی لوگوں کا ہاتھ پکڑتے ہی یا اس کے قریب

جاتے ہی اسے پہچان لیتے تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مدعی کے وکیل نے جو منطق کی رو گی ہے مجھے بھی یقین آچکا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کہ بوڑھے نے بیل یا دو نے اس رات تعمین یا دو کو پہچان لیا اور اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ بھاگتے ہوئے ملزم نے ہاتھ میں موجود درانتی جو وہ رسی یا اس طرح کی چیزوں کو کاٹنے کے لیے لے کر آیا ہوگا کچھ لوگ درانتی دفاع کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس تیز دھار دار چیز کو پہچان لیے جانے کے ڈر سے ہی ملزم نے پھینک ماری اس لیے بھی کہ چوری کی نیت سے کسی کے گھر میں جب کوئی داخل ہوتا ہے تو وہ گھبرایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں پکڑے جانے کے ڈر سے وہ جان لیوا حملہ کرسکتا ہے۔

اس فیصلے نے ان کی شہرت کو بڑھاوا دیا۔ لوگ مثال کے طور پر کہنے لگے کہ مدعے کی گواہی بھی کسی کی گردن پھنسا سکتی ہے۔

ایسے بہاسوں کیس ان کی کامیاب وکالت کی گواہ ہیں۔ ان کے بارے میں بھی لوگ ان کے والد کی طرح کہنے لگے تھے کہ مقدمہ جیتنے کے لیے آل رضا کا نام ہی کافی ہے۔ ان کی کامیابیاں اور انداز دلائل نے اس وقت کے انگریز ججوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ دلائل ایسے دیتے جیسے کہانی سنا رہے ہوں۔ ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے، ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں حکومت کی جانب سے "لیبر ٹریبونل کا چیئرمین" کا عہدہ دے دیا گیا۔ یہ عہدہ معمولی نہیں تھا۔ یہ عہدہ ہائی کورٹ کے جج کے عہدے کے برابر تھا۔

لکھنؤ آکر انہوں نے وکالت میں ہی نہیں ادبی دنیا میں بھی ہلچل پیدا کردی تھی۔ وہی لکھنؤ جو علم و ادب میں ایک نام رکھتا ہے اور اس دور میں تو وہاں شعر و شاعری اوڑھنا بچھونا کی طرح رائج تھی۔ شاعری ہی وجہ شہرت و عزت بھی جاتی تھی۔ ایک سے ایک نامی گرامی شعرا شہر میں موجود تھے۔

لکھنؤ برصغیر کی ہزار سالہ مسلم تہذیب و ثقافت کا آخری نمائندہ شہر تھا۔ تہذیب وضع داری، نفاست اور لطافت کی پہچان تھا۔ ہنرمندی وسلیقہ شعاری کا منہ بولتا ثبوت کہلاتا تھا۔ اس وقت انیس کے فرزند میر نفیس کے بیٹے سید خورشید حسن دولہا صاحب لکھنوی اور مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج کے بیٹے طاہر رفیع اس شہر کا تاج کہلاتے تھے گلی گلی میں قادر الکلام شاعر بس رہے تھے۔ ایسے ماحول کا اثر ان کے مزاج پر اثر انداز ہوا تھا۔ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں یہ تمام محاسن یک جا ہوگئے تھے۔ وہ حرکات و سکنات سے ہی، لکھنوی تہذیب کا پروردہ اور نمائندہ کہلانے کے حقدار بن چکے تھے۔

جیسا کہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں لکھنؤ اردو شاعری کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بہت ساری ادبی انجمنیں خدمت ادب میں مصروف تھیں۔ انجمن معین الادب کا نام خاصا اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس میں صفی لکھنوی اور ظریف لکھنوی جیسے جید شاعر شامل تھے۔ بڑے بڑے مشاعرے کرانا، شاعری کی ترویج کے لیے مسلسل کام کرنا اس انجمن کی پہچان تھی۔ اس انجمن نے انہیں پہلے نائب صدر اور پھر صدر منتخب کیا۔ اس انجمن کے زیر انتظام ایسے کئی مشاعرے کرائے جس نے لکھنؤ والوں کے دل موہ لیے۔ حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی کے علاوہ بھی پورے برصغیر سے قادر الکلام شعرا کو بلاتے۔ اس انجمن کے مشاعرے لکھنؤ کے اہم مشاعروں میں شمار ہوتے تھے اور ان مشاعروں کو کامیاب کرانے کا سہرا انہی کے سر تھا۔

جسٹس سید محمد رضا کی طرح یہ بھی وضع داری میں یکتا تھے۔ بڑی نفاست سے انگرکھا پہنتے ٹوپی اور شیروانی زیب تن کرتے۔ انداز گفتگو میں بھی لکھنوی اثر نمایاں رکھتے۔ شوکت تھانوی ان کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اگر مولانا عبدالحلیم شرر اپنی کتاب کا نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" نہ رکھتے تو میں سید آل رضا کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہتا۔ صرف شکل وصورت ہی نہیں، سیرت و طینت کے بھی حسین، چہرے پر خاندانی شرافت کا نور، مزاج میں تکلفا نہیں بلکہ اُسی انکسار، شائستگی اور نفاست کا معیاری پیکر۔"

شوکت تھانوی نے یہ باتیں تب لکھیں جب وہ کراچی آچکے تھے مگر اس وقت بھی ان کی وضع داری کا یہی عالم تھا جب وہ لکھنؤ میں تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں اپنی ایک ادبی پہچان بنالی تھی اور یہ پہچان ایک شاعر کی تھی۔ پرتاپ گڑھ سے واپسی کے بعد بھی وہاں سے رابطہ قائم تھا۔ وہاں کے احباب بالخصوص شیخ نجم احسان نجم ایڈووکیٹ ہر خط میں ایک تقاضہ ضرور کرتے کہ آپ ایک اچھے شاعر تو ہیں ہی ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ آپ نے ایک افسانے کا خلاصہ سنایا تھا۔ اسے بھی تحریر کردیں تاکہ ہمارے ذوق مطالعہ کو تسکین پہنچے۔ ایڈووکیٹ صاحب نے لکھنؤ کے ایک مطبع کو بھی خط لکھ دیا تھا کہ وہ ان سے ناول لکھوا لے۔

نسیم صاحب نے تقاضا شروع کردیا کہ ہمارا مطبع آپ کا ناول چھاپنا چاہتا ہے۔ آپ اسے احاطہ تحریر میں لے

آئیں۔ بالآخر آل رضا نے "نیرنگ محبت" کے عنوان سے ایک ناول لکھ دیا۔ ممتاز بک ایجنسی امین آباد، لکھنؤ نے اسے شائع کردیا۔ زبان و بیان کا تو ذکر ہی بیکار ہے کیونکہ زبان دانی پر انہیں ملکہ حاصل تھا۔ مگر جو موضوع انہوں نے لیا تھا وہ اس وقت رائج تھا۔ مقبول تھا۔ ایک محبت کی داستان تھی جسے بیان کیا گیا تھا۔ اس دور میں ناولوں کا جو انداز تھا یعنی مکالمہ ادا کرنے والے کا نام پھر مکالمہ۔ اسی انداز میں لکھا تھا جواب متروک ہے۔ نثر نگاری میں اور بھی کئی شہکار تخلیق ہوئے ہوں گے لیکن اب وہ کسی کے ریکارڈ میں نہیں ہیں اس لیے کہ انہیں اپنی تحریر کیا غزلیں تک سنبھال کر رکھنے کی عادت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ اس بات کا تذکرہ ان کے چھوٹے بھائی یوں کرتے ہیں۔ "بھائی صاحب کی طبیعت بھی اس مسئلہ میں عجیب طرح کی تھی۔ جس کے کلام کو اتنی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہو وہ اپنے کلام کو یوں ضائع کردے۔"

خود وہ اپنی اس کوتاہی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "مجموعہ کلام چھپوانے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ کبھی یہ خیال ہی نہیں پیدا ہوا کہ مشاعروں یا نجی صحبتوں کے علاوہ اس کی صورت اشاعت کوئی اور بھی ہوگی۔ شعر گوئی جو میرے لیے ایک تفریحی مشغلہ رہا ہے، میں نے اپنے لیے نہ کبھی باعث نام ونمود سمجھا۔ نہ اب سمجھتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ شاعری اس قابل نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ اگر ارباب ذوق میری شاعری کو ایک ادنیٰ سی ادبی خدمت سمجھیں تو یہ میرے لیے موجب صد افتخار ہوگا۔ شعر کہتے وقت مجھ پر ایک خاص کیفیت وقتاً فوقتاً طاری ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے اندازہ کرتا رہتا ہوں کہ واقعی اچھا شعر کہنا بس اسی کیفیت خاص کا کرشمہ ہے۔ جس وقت یہ کیفیت جتنی ہو گی۔ اس وقت اتنا ہی اچھا شعر نکلے گا۔ اس کیفیت کو کوئی بیان کرکے سمجھا نہیں سکتا۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔"

ان کی عادت سی تھی کہ جو کچھ کہتے اسے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ کوئی غزل کسی کتاب میں رکھ دی کوئی تحریر کسی دراز میں رکھ دی اور پھر وہ ضائع ہوگئی۔

ان دنوں برصغیر کا سیاسی ماحول بھی گرم ہوتا جا رہا تھا۔ سیاسی بادل گھر آئے تھے۔ قیام پاکستان کا مطالبہ شدومد سے بلند ہونے لگا تھا تو انہوں نے بھی پاکستان کے حق میں بولنا شروع کردیا۔ باقی بھائیوں کی طرح یہ بھی پاکستان کے حق

سید آل رضا نقادوں کی نظر میں

نیاز فتح پوری

سب سے زیادہ نمایاں خصوصیات ان کے کلام کی اس کا لکھنوی لب ولہجہ اور اس کی لکھنوی بو باس ہے جو بہت سے لکھنوی شعرا کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ دوسری خصوصیت اس کا Direct Approach ہے، یعنی تیر چلا اور نشانے پر بیٹھ گیا۔ تیسری خصوصیت اس کا والہانہ لب ولہجہ ہے۔ چوتھی خصوصیت جذبات کی پاکیزگی ولطافت اور ندرت تعبیر ہے۔ پانچویں خصوصیت بیان کا خلا، یعنی ادھوری بات کہہ کر اس کو پورا کرنا ذہن سامع پر چھوڑ دینا۔ یہ انوٹ مومن کی خصوصیت ہے اور آل رضا کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین

سید آل رضا کے مرثیوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر عصر جدید کے طرز فکر کا اثر ہے۔ ان میں عقل اور جذبات کی آمیزش ہے۔ ان میں واقعات کے نظریے اور تشریح کا وہ نیا طریقہ ہے جو ہمارے بزرگوں کے سامنے نہ تھا۔ یہی باتیں ہیں جو نئے دماغوں کو آسودہ کرتی ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی

سید آل رضا مرحوم لکھنوی انداز شاعری کے آخری بڑے شاعر تھے۔ زبان وبیان کی خوب صورتی، محاورے اور روزمرہ کے برمحل استعمال اور روایتی سانچوں کو انہوں نے جس مہارت اور ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سے لکھنوی روایت کے ساتھ ان کے ربط خاص کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں آخری حد تک پہنچے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں کانگریس کی طرفداری کرنے والوں میں رفیع احمد قدوائی پیش پیش تھے۔ وہ بھرپور کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو مسلم لیگ سے کھینچ کر کانگریس کی جھولی میں ڈال دیں۔ ان کے خلاف نوجوانوں کو منظم کرنے میں آل رضا نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ گوکہ سیاست سے انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا مگر مسلم لیگ اور پاکستان ان کے لیے اہم تھا اسی وجہ سے وہ رفیع احمد قدوائی کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ رفیع احمد قدوائی کھلاک سیاست داں تھے۔ یو پی میں 1937 میں بننے والی گووند ولبھ پنت کی کابینہ کے وزیر

تھے۔ ان کے مقابل آواز بلند کرنا آسان نہ تھا پھر بھی سید آل رضا ان کے خلاف سینہ سپر رہے۔ مسلم لیگ کو مضبوط کرنے میں لگے رہے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو قبول کرلیا اور دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک ابھر آیا۔

اب ایک نیا مسئلہ سامنے تھا کہ ہجرت کا کرب کیسے جھیلا جائے؟ ان کے ایک بھائی پہلے سے ہی پاکستان میں تھے۔ ہاشم رضا قیام پاکستان سے بہت پہلے یہاں تعینات تھے۔ دو بھائی سید کاظم رضا اور سید مسعود رضا حق خود انتخاب کے تحت پاکستان جا چکے تھے۔ وہ دونوں سرکاری ملازم تھے اس لیے ان کے پاکستان جانے کا انتظام ہوگیا تھا لیکن سید آل رضا وکیل تھے اس وجہ سے انہیں سرکاری مراعات نہیں مل رہی تھیں۔ شاید وہ لکھنؤ میں رہ جاتے مگر ان کے حساس دل پر اس وقت چوٹ پڑی جب انہوں نے دیکھا کہ لکھنؤ جو اردو کا مرکز تھا۔ جہاں اردو کو شباب ملا اسی شہر میں اردو کے گلے پر چھری چلائی جا رہی ہے۔ انڈین حکومت کی جانب سے سڑکوں کے نام تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ سڑک یا شاہ راہ کی بجائے بورڈ پر مارگ لکھا جا رہا ہے۔ سائن بورڈ اور سنگ میل سے اردو کو ہٹا کر ہندی لکھی جا رہی ہے۔ دفاتر سے اردو کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ جب کوئی احتجاج کرتا تو کہتے کہ مسلمانوں نے اپنا حصہ مانگا، ان کو پاکستان دے دیا اب جاؤ پاکستان۔ یہاں ہندی چلے گی کیونکہ یہ ہندوؤں کا ملک ہے۔ اس رویّے نے ان کے دل کو مغموم کر دیا اور وہ اپنی مدد آپ کے تحت پاکستان آگئے۔

موت ہی جس کو چھڑا سکتی تھی وہ دلکش دیار
یوں چھٹا ہم سے کہ ہم کو خود ہی چھوڑ آنا پڑا
سلسلہ جھوٹی اُمیدوں کا ہے کتنا دل فریب
ایک ٹوٹی دوسری کے رو میں بہہ جانا پڑا

اس وقت کراچی دارالحکومت تھا۔ اس لیے انہوں نے رہائش کے لیے کراچی کو منتخب کیا۔ کراچی میں سر چھپانے کا آسرا چاہیے تھا۔ تلاش بسیار کے بعد جیکب لائن کی الٹی طرف واقع شکار پور کالونی میں کرایہ کا ایک مکان حاصل کیا۔ یاد رہے یہ وہ دور تھا جب حکومت مہاجرین کو بسانے کے لیے متروکہ جائداد تقسیم کر رہی تھی۔ ان کے چھوٹے دو بھائی اہم سرکاری عہدوں پر اسی کراچی میں متعین تھے۔ اگر وہ چاہتے تو متروکہ جائداد حاصل کر سکتے تھے۔ جدی پشتی رئیس بھی تھے اس وجہ سے بھی انہیں کوئی بھی متروکہ مکان بڑی آسانی سے مل سکتا تھا لیکن خاندانی تھے۔ قربانی دینا چاہتے تھے اس لیے بھی کلیم داخل نہیں کیا اور کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے۔

یہ وہ دور تھا کہ پورے ہند سے ادیب و شعرا کھنچ چلے آرہے تھے۔ ایک ادبی ماحول تعمیر ہوتا جا رہا تھا۔ سید آل رضا نے یہاں آنے کے بعد اپنا پرانا پیشہ وکالت شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ادب کی خدمت میں بھی حصہ لینے لگے۔ قاضی احمد اختر جونا گڑھی، پروفیسر مرزا محمد سعید، شمس العلما مولوی محمد عبدالرحمان، مولانا راشد الخیری، شاہد احمد دہلوی، استاد قمر جلالوی، مولانا سیماب اکبرآبادی، آرزو لکھنوی، حکیم محمد سعید، رئیس امروہوی، ماہر القادری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ابراہیم جلیس، میر خلیل الرحمان، صبا لکھنوی کے علاوہ بھی بہت سارے جید قلمکار و شعرا کراچی پہنچ چکے تھے۔ ان جیسے بے شمار ادیب و شعرا کے پہنچ جانے کی وجہ سے ادبی محافل کا انعقاد آسان ہوگیا۔ خوب محفلیں جمنے لگیں۔ مشاعرے ہونے لگے۔

لیکن ایک بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کراچی آنے کو تو آگئے تھے۔ سوائے ایک بھائی کے، سبھی پاکستان میں یکجا ہو چکے تھے۔ ادبی محفلوں میں بھی بھرپور شرکت کرتے تھے۔ خود بھی محافل سجاتے تھے۔ مشاعرے منعقد کراتے تھے مگر ایک بات ان کے چہرے سے عیاں تھی کہ وہ بجھ کر رہ گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ یہاں کی علمی و ادبی اور تہذیبی فضا سے مطمئن نہ تھے اسی لیے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔

دراصل وہ یہاں کے بدلتے ماحول، کم سواد، مجہول، بر خود غلط، خود پسند اور خدا فراموش طبقے کی بڑھتی منہ زوری، ارباب ذوق کو مختلف انداز سے ذلیل خوار کرنے کا چلن نے انہیں مکدر کر دیا تھا مگر پاکستان سے محبت، حب الوطنی کا خاندانی تقاضہ، سچے بہی خواہ ہونے کا ثبوت تھا کہ وہ ایسے نادان دوستوں کو معاف کرتے رہے اس لیے بھی کہ ان کا پورا خاندان حب الوطنی کے جذبے سے سرشار رہا۔ قربانیوں پر قربانیاں دیتا رہا تھا اس لیے بھی وہ ایسے دوستوں کو نظر انداز کرتے رہے تھے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

وہ ایک حساس انسان تھے۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتے تھے۔ ایک شاعر اور ادیب کے لیے حساس ہونا ضروری ہے۔ وہ خوبی ان میں بھرپور تھی۔ ہر بات کو دل پر لے لیتے تھے۔ بہنوں کا دکھ دل کا داغ بنا ہوا تھا۔ وہ غم کم بھی نہ ہو پایا تھا کہ اپنی مٹی کو چھوڑنے کا کرب جھیلا، غریب الوطنی کا درد سہا۔ یہ ابتلا ایک حساس شخص کے لیے جگر سوز ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی غم میں بجھ گئے تھے۔ گو کہ وہ وکالت میں بھی دل لگاتے تھے اپنے استاد حضرت انور حسین آرزو لکھنوی کے کراچی آجانے کے بعد پابندی سے مشاعروں میں شریک ہوکر غزلیں بھی پڑھتے تھے۔ ریڈیو پاکستان کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے۔ غزلیں سناتے۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے پورے پاکستان میں پھرتے۔ ڈھاکا، چٹا گاؤں (مشرقی پاکستان) کے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے جاتے لیکن جب حساس دل نے ان کوتاہیوں کو سہنے سے انکار کر دیا تو وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ دوستوں سے ملنا جلنا کم کر دیا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ان کی فکر میں تبدیلی آتی گئی۔ 1964 میں وہ وحید الحسن ہاشمی صاحب کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں ”میں نے غزل کہنا چھوڑ دیا ہے۔ محفلوں میں شرکت بھی نہ کے برابر ہے۔ کیا کروں رنگ زمانہ نے مجبور کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی نیڈی قسم کا لباس زیب تن نہ کرنا چاہے تو بہتر ہے کہ حتی الوسع گوشہ نشینی ہی اختیار کر لے۔ رنگ زمانہ میری وجہ سے کیوں بدلے اور میں اس کے خلاف کوئی اور توقع ہی کیوں کروں۔“

1969ء میں ان کے جواں سال فرزند سید قمر رضا کو قضا نے آن دبوچا۔ قمر رضا لاہور میں کچھ عرصہ تک ایس پی رہ چکے تھے۔ اس جواں مرگی پر وحید الحسن ہاشمی نے تعزیتی خط لکھا تو جواب میں آل رضا نے 13 جنوری 1969ء کے خط میں وحید الحسن ہاشمی کو لکھا ”میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سخت امتحان کے وقت خدا کے فضل و کرم اور سرکار حسینی کی مدد نے مجھے ایسا سنبھالا دیا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ برابر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی بڑی محبت سے مجھے سینے سے لگا رہا ہے۔ ایک خاص کیفیت میں یہ شعر کہا ہے۔

شام سے یوں تو رہا وقت اندھیرے کا مگر
اب ہوئی رات تو اب چاند مرا ڈوب گیا

پھر زبان سے میرے یہ بھی نکلا۔

”غم حسین ہے سب کچھ غم قمر کیا ہے۔“

”انا للہ وانا الیہ راجعون...... اللہ آپ کو خوش رکھے۔“

مرحوم قمر کا جنازہ کراچی کے رضویہ سوسائٹی میں واقع شاہ کربلا ٹرسٹ بارگاہ سے اٹھا تو حضرت علی اکبر کی شان میں اپنے ہی کہے ہوئے مرثیہ کا ایک شعر بطور تعرف سے

سید آل رضا نقادوں کی نظر میں

پروفیسر کرار حسین

جدید مرثیہ، جس کے ایک بہت اہم سرخیل جناب سید آل رضا مرحوم ہیں، میر انیس اور مرزا دبیر کی ہیئت اور زبان کی سرزمین میں ان کے سائے سے ذرا ہٹ کر، موجودہ دور کی مقابلتاً کھلی ہوئی اور انتشار آلود فضا میں اپنا پودا لگانے کی مبارک کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

سید آل رضا، لکھنوی رنگ شاعری کے نمائندہ شاعر تھے۔ لکھنوی رنگ شاعری یوں تو ناسخ کی غزل سے پھیلا اور مقبول ہوا، لیکن ناسخ کی یہ روایت غزل، صحیح معنی میں، ان کے شاگرد رشید علی اوسط رشک کی شاعری میں جدید روپ کے ساتھ سامنے آئی۔ سید آل رضا کی غزل پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غزل رشک کی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔

لکھنوی غزل کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے 'جذبے' کو شاعری سے خارج کر کے 'خیال' کو اس کی جگہ دی تھی۔ 'جذبے' کو خارج کرنے سے 'عشق' غزل سے خارج ہوگیا اور اس کی جگہ 'حسن' نے لے لی جس سے اردو غزل نے نئی نئی صورتیں اختیار کیں۔ اس کے ساتھ لکھنوی غزل نے زبان و بیان کی صحت پر بھی پورا زور دیا اور رعایت لفظی سے اس میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آل رضا بھی اسی روایت کی لکیر پر چلنے والے شاعر ہیں۔ ان کی غزل پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی جذبہ دبا ہوا ہے، صحیح زبان کا رنگ حاوی اور تلاش مضمون کا اثر نمایاں ہے اس وجہ سے روزمرہ، محاورے اور اس سے پیدا ہونے والی رعایت لفظی آل رضا کی شاعری کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔ ان کی غزل کی زبان بہت صاف اور نکھری ستھری ہے۔ ہر لفظ موتی کی طرح اس طرح جڑا ہوا ہے جیسے مینا کاری کے کام میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

پڑھا:

مولا علیؑ زمانے کے مشکل کشا علیؑ
کڑیل جواں کی لاش اٹھاتا ہوں یا علیؑ

جب حزن نے غلبہ پانا شروع کیا تو ان میں ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ اپنے غم کو بھولنے کے لیے انہوں نے رثائی ادب کی جانب توجہ دینی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ غزلوں نظموں کی دنیا سے دبے قدموں نکلتے چلے گئے۔ اس جانب وہ اشارہ کرتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

وہ رضا جس کو غزل گوئی سے تھا کچھ واسطہ
واقعہ تھا اک زمانے میں ، اب افسانہ ہوا

انہوں نے رثائی ادب پر بھرپور توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے رثائی ادب میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔ یوں سمجھ لیں کہ ان کی غزلوں کی پرداخت لکھنؤ میں ہوئی تو رثائی ادب کے اصناف میں اہم مقام انہیں کراچی میں حاصل ہوا۔

قیام پاکستان سے قبل کراچی کی عزاداری محدود تھی۔ شہر پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ تمام کاروبار ان کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں میں زیادہ تر غربا ان ہندوؤں کی چاکری کرتے۔ مزدوری کرتے۔ مسلمانوں کا خون چوسنے والے یہ ہندو بنیے بلڈنگوں پر بلڈنگ کھڑی کرتے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹاور سے نمائش تک بمشکل دس فیصد مسلمانوں کی عمارت تھی وہ بھی اندرون سندھ کے لوگوں کی۔

کراچی کی مسلم آبادی میں سب سے زیادہ اہل سنت تھے، ان کے بعد اسماعیلی جبکہ اہل تشیع بہت تھوڑی تعداد میں تھے، اہل تشیع میں بھی اردو داں نہ کے برابر تھے۔ جب اردو داں ہی نہ ہوں تو تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا رواج کیوں کر ہوتا؟ لیکن جب ہجرت کا کرب جھیلتے اردو داں طبقہ بڑی تعداد میں آ پہنچا تو یہاں بھی مرثیہ خوانی ہونے لگی اور اس کی داغ بیل آل رضا نے ڈالی۔ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد پہلا مرثیہ "نور ہاشم" کراچی میں سنایا۔ اس کے بعد تو تواتر سے وہ مرثیہ کی مجالس میں شریک ہونے لگے۔ تو تصنیف مرثیہ سنانے لگے، مشاعروں میں جانے سے منع کر دیتے لیکن مرثیہ خوانی میں کبھی انکار نہ کرتے۔ دیگر شہروں میں بھی مرثیہ خوانی کرنے جاتے۔ رثائی ادب کو اتنا وقت دینے لگے کہ لوگ انہیں پاکستان میں رثائی ادب کا بابا آدم کہنے لگے۔ یہ بہت حد تک درست بھی ہے کہ کراچی کی سرزمین پر پہلا مرثیہ انہوں نے ہی پڑھا تھا جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔

کراچی کی طرح لاہور میں بھی رثائی ادب کی ترویج جاری تھی۔ وہاں سے ان کا بلاوا آ جاتا تھا۔ ایسا کوئی سال نہ گزرتا تھا جس سال انہیں بلاوا نہ آتا ہو۔ جب بھی وہ لاہور جاتے ان کے شاگرد وحید الحسن ہاشمی انہیں عزت و تکریم کے ساتھ پیشوائی کے لیے اسٹیشن پر موجود ہوتے۔ لاہور کی پذیرائی سے آل رضا خود بھی احسان مند ہیں، وہی انداز جو لکھنؤ کی پہچان ہے کہ سر تسلیم جھکے جا رہے ہیں۔ لاہور کی پذیرائی پر انہوں نے 17 نومبر 1968 والی مجلس میں ایک رباعی پڑھی:

مجمع جو ادیبوں کا چنا ملتا ہے
الفاظ و معانی کا صلا ملتا ہے
لاہور میں بھی مرثیہ جب پڑھتا ہوں
کیا ذوق سماعت کا مزا ملتا ہے

ہاشم رضا لکھتے ہیں کہ بھائی جان نے اپنی ڈائری میں "میرا موضوع مرثیہ گوئی" کے عنوان سے پانچ سرخیاں متعین کر رکھی تھیں۔ ۱: انسانیت ۲: اسلام ۳: تعیش ۴: کربلا ۵: حسینیت

انہی سرخیوں پر وہ مرثیہ کہا کرتے تھے۔ ان سے ان کی مرثیہ گوئی کی ترجیحات عیاں ہے۔

☆☆☆

مرثیہ گوئی کو ترجیح دینے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان آخری عمر میں مذہب کی جانب زیادہ جھک جاتا ہے۔ 12 جنوری 1978 کو اپنے بیٹے سید احمد رضا کے نام خط میں وہ لکھتے ہیں۔ "میری صحت کی عجیب حالت ہو رہی ہے نہ معلوم کس دن ختم ہو جاؤں۔ عجیب عجیب کیفیت ہوتی رہتی ہے۔ مجھے خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں کینسر میں مبتلا ہوں۔ کچھ نہ کچھ دوا بھی استعمال کرتا ہوں مگر طبیعت کچھ نہ کچھ خراب ہی ہوتی جاتی ہے۔ معدے کا فعل ٹھیک نہیں ہے اور خدا جانے کب ختم ہو جاؤں۔ تم سب کے لیے دلی دعائیں کرتا رہتا ہوں لیکن زبردستی کی زندگی کب تک قائم رہے گی۔ اب عمر بھی اتنی گزر چکی ہے کہ نہ معلوم کب آخر وقت آ جائے۔ تم سب سے استدعا کرتا رہتا ہوں کہ اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ بہت خیال رکھنا۔ انہوں نے ہم سب کی بڑی خدمت کی ہے۔" اس خط کے مندرجات سے ان کی زندگی کے اواخر میں ان کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہیں موت کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے باوصف انہیں

اپنی اہلیہ کا خیال تھا۔ اپنے بچوں کو بار بار تلقین کرتے تھے کہ وہ اپنی ماں کا خیال رکھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اکثر ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا" آل رضا صاحب نے اپنی زندگی کے آخری دور میں فردوس کالونی میں مکان بنایا تھا۔ یہ مشرقی انداز کی بنی ہوئی عمارت تھی اور ایک مشہور شاعر یاور عباس کے مکان کے قریب تھی۔ سید صاحب کا مکان مشرقی تمدن کا نمونہ تھا۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ اس میں کسی قسم کی شان و شوکت نمایاں نہیں تھی۔ ان کے ملاقاتی کمرے میں بھی کوئی نمائشی چیز نہ تھی۔ وہ نہایت شائستہ انسان تھے، ہمیشہ نرم لہجے میں گفتگو کرتے۔ بات چیت کا انداز بھی نہایت شائستہ ہوتا۔ کبھی کبھی اسی انداز میں لطیفہ بھی سنا دیا کرتے۔

سٹی کورٹ کے سامنے ان کا دفتر تھا۔ وہ روزانہ کچہری جاتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ ان کا یہی معمول تھا۔ البتہ آخر عمر میں، بیٹے قمر رضا کے مرنے کے بعد بجھ سے گئے تھے۔"

سید صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے رنج کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ گو کہ ان کا یہ شعر کافی پہلے کا تھا مگر ان حالات پر کھرا اترتا ہے:

رت اور فضا بدلی ' زنداں کی ہوا بدلی
بیڑی کی صدا بدلی ، دیوانہ پریشان ہے

یاد رہے کہ لکھنؤ کی شاعری دلی کی شاعری کی حریف ہے۔ گو کہ لکھنؤ کی ابتدائی شاعری دہلوی شعرا کی منت پذیر اں رہی لیکن بعد میں سیاسی اور معاشرتی حالات کی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری دبستان دہلی کے رنگ و آہنگ سے الگ ہوتی چلی گئی اور پھر اس نے منفرد حیثیت اختیار کرلی۔ یہاں شروع شروع میں میر، سودا، میر حسن وغیرہ کے دم سے دبستان دہلی کی خصوصیات کا چرچا رہا بعد ازاں معاشی و معاشرتی حالات و کوائف کے نتیجے میں دبستان لکھنؤ کا رنگ بدل گیا۔ یہ تبدیلی غلام ہمدانی مصحفی، انشا اللہ خاں انشا، قلندر بخش جرأت کے کلام میں پہلی پہلی بار نظر آتی ہے۔ اس کے بعد امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، اور ان کے معاصر شعرا کے کلام میں نظر آنے لگتی ہے، گویا دبستان لکھنؤ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ ظہور پذیر نظر آئیں۔ اگر جائزہ لیں تو دہلی کی شاعری میں عشق کے موضوعات نفسیاتی، جذباتی، واردات اور متصوفانہ تھے لیکن لکھنؤ کی شاعری میں یہ کیفیت نہیں رہی۔ لکھنؤ میں محبوب کی صفات کے بیان پر زور دیا گیا۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہونے والے معاملات پر زیادہ زور دیا گیا۔ محبوب کی رنگینیوں کے بیان اور کاروبار دلداری پر مرکوز کیا گیا۔ پھر

(ب) سید آل رضا کے کلام کی ترتیب و تدوین

(1) "عظمت انساں، آل رضا، مع مقدمات، جدید فن مرثیہ نگاری"

(مرتبہ: وحید الحسن ہاشمی)

یہ اردو ادب کا پہلا اور اب تک واحد مرثیہ ہے جو کتابی صورت میں ممتاز اہل قلم کی آرا کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ تبصرہ نگاروں میں جوش ملیح آبادی، پروفیسر مسیح الزماں، ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، پروفیسر یوسف جمال انصاری، ڈاکٹر نیر مسعود، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر آغا سہیل، پروفیسر عابد علی عابد اور پروفیسر وزیر الحسن عابدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(2) "مراثی رضا" از آل رضا

(مرتبہ: پروفیسر کرار حسین)

اس کتاب میں سید آل رضا کے تمام مرثیوں کو یکجا کر دیا گیا ہے، گویا یہ شاعر کے مرثیوں کی کلیات ہے، جس میں بیس مرثیے شامل ہیں۔ ان میں سے پانچ تو مطبوعہ تھے اور بقیہ پندرہ غیر مطبوعہ۔ اس مجموعے کو ممتاز دانش ور پروفیسر کرار حسین نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب 1981ء میں خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ "مراثی رضا" کا سرورق پاکستان کے شہرہ آفاق مصور صادقین نے تیار کی۔

(3) "باقیات آل رضا"

(مرتبہ: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے "باقیات آل رضا" کے نام سے سید آل رضا کے غیر مدون کلام کو مرتب کر کے الحسن پبلی کیشنز لاہور کے تحت جون 2000ء میں شائع کرایا ہے۔ سید آل رضا کے کلام کی تدوین انہوں نے اصناف وار کی ہے۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، نوحہ، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مرثیہ (شخصی) اور فرد کے عنوانات کے تحت شبیہ الحسن نے غیر مدون کلام آل رضا کی تدوین کی ہے۔

(ج) سید آل رضا کا غیر مدون کلام

"باقیات آل رضا" کی اشاعت کے بعد سید آل رضا کے مزید غیر مدون کلام کا حصول بظاہر ناممکن تھا، تاہم "جوئیدہ، یابندہ" کے مصداق سید آل رضا اور ان کے کلام سے راقم کی ذہنی وابستگی نے اس کلام تک رسائی کو بھی ممکن بنا دیا جو بوجوہ "باقیات آل رضا" میں شامل نہ ہو سکا۔

دوسری دہائی کے بعد شعری، فکری کاوشوں کے نتیجے میں مزید تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ روایتی غزل کے لب و لہجے میں نیا رنگ، نیا آہنگ پیدا ہونے لگا۔ ایک طرف مولانا حسرت موہانی اپنے کلام کا جادو جگاتے نظر آتے ہیں تو مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی غزل گوئی دبستان لکھنو کی شمع کو فروزاں کیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ریاض خیرآبادی حسن تغزل کے فروغ میں کوشاں تھے جن کی زبان مستند ہونے کے ساتھ پر لطف بھی تھی۔ تبھی تو نیاز فتح پوری جیسا مبصر کہنے پر مجبور ہوا ”شاید ریاض کے برابر صحیح شعر کسی اور نے نہیں کہے۔“ اسی دور میں صفی لکھنوی یگانہ چنگیزی، اثر لکھنوی، جلال لکھنوی، آرزو لکھنوی، زبان و بیان، فن و موضوع اور طرز ادا کے ہزاروں نکات سے آگاہ کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں جدید افکار و نظریات، نیا رنگ و روپ اور نئی تاب و توانائی۔ منفرد اسلوب، فکر کی گہرائی۔ خیالات کی بلندی، طنز کی آمیزش اور تاثرات کی ہمہ گیری کی بدولت اردو ادب میں ممتاز مقام کی جانب بڑھنے کا اشارہ دیتی شاعری لکھنو سے ابھری۔ ایک نئی خنطلنے دار اور مردانہ آواز ابھری تو لوگ اس نئے نوجوان کی جانب متوجہ ہوگئے۔ لکھنو کے ہر بڑے مشاعرے میں بلائے جانے لگے۔ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین ”آل رضا کی شاعری کی دنیا میں الفاظ نے جو عمارتیں تعمیر کی ہیں، وہ بڑی پائے دار ہیں، خوبصورت ہیں۔ ہم ان الفاظ کی ایک اینٹ بھی کہیں سے کھسکا نہیں سکتے۔“

غزل گوئی سے شاعری کی ابتدا کرنے والے آل رضا کا بیان اتنا سادہ مگر پرفسوں ہوتا کہ لوگ فوراً متوجہ ہوجاتے۔

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

غزل گوئی کی جب ابتدا ہی ایسی ہو تو کیا کہنا۔ گویا انہوں نے دبستان لکھنو کے اساتذہ کے بیش ورثے کی پاسداری کی وہاں دوسری..... جانب جدید افکار و نظریات کو لکھنو کی شعری فضا میں پروان چڑھایا۔ زبان کی لوچ .....بیان دل کشی اور موضوعات میں خارجیت کے رنگ سے انہیں دبستان لکھنو میں اپنی منفرد حیثیت تسلیم کرالی۔ بقول شبیہ الحسن ”جدید شعری رویوں سے کما حقہ آگاہی کی وجہ سے ہی ان کے کلام میں ایک تازگی اور نیاپن محسوس ہوتا ہے۔“

اپنے ادبی سرمایہ کے ساتھ وہ پاکستان آئے تھے۔ مگر لکھنو کی رنگارنگی اور کراچی کی ہیجان خیزی کے نمایاں فرق نے انہیں ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا۔ یہاں وہ لکھنو جیسی ادبی فضا تو تعمیر نہ کر سکے۔ اور نہ خود کو یہاں کے ماحول میں ضم کر سکے۔ یہاں کے سیاسی انتشار اور معاشرتی حالات سے وہ درجہ دل برداشتہ تھے۔

اصل میں کم سواد، مجہول، بدخود غلط، خود پسند، اور خدا فراموش طبقے نے پاکستان بھر کے ارباب دانش کو ذلیل و خوار کر رکھا تھا۔ وہ پاکستان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے پورے خاندان کی خدمات قابل ستائش ہے۔ اس خاندان نے پاکستان کو شکار گاہ کی بجائے قربان گاہ سمجھا اور ملک و ملت کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ملک کے حوالے سے ان کے ترانے، قطعات، منظومات، رباعیات، اور دیگر نثری و شعری تخلیقات گواہ ہیں۔ مگر دل کا کیا کرتے کہ وہ یہاں کے ماحول سے مطمئن نہ ہوسکے۔ اسی وجہ سے گوشہ نشین ہوگئے۔ مشاعروں میں ادبی تقریبات میں جانے سے کترانے لگے۔ صرف مرثیہ پڑھنے کی ہامی بھرتے ورنہ صاف انکار کر دیتے۔ وہ خود میں محصوری کی زندگی گزار رہے تھے کہ یکم مارچ 1978 کو انہوں نے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ علی باغ (کراچی) کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ تدفین کے وقت ایسا کون تھا جس کی زبان پر ان کے مشہور سلام کا یہ شعر نہ تھا

بچے تو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم پھر ہے
جو چل بسے تو یہ اپنا سلام آخر ہے

ان کے انتقال پر تاریخیں کہنے والے شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ رئیس امروہوی، نسیم امروہوی، محشر بدایونی، شان الحق حقی، راغب مرادآبادی، صبا اکبر آبادی، امید فاضلی، ماہر القادری۔ سید قدرت نقوی، اور طالب جار چوی۔ ان کے انتقال پر پی ٹی وی کی جانب سے ان کی شخصیت اور فن پر ایک مذاکرہ نشر ہوا۔ دور درشن لکھنو سینٹر سے 14 مارچ 1978ء کو ان کے فن پر پروگرام نشر ہوا۔ اس کے علاوہ بہت سارے سیمینار و مذاکرے مختلف ممالک کے اردو پروگراموں میں پیش کیے گئے۔

اس تحریر کی تیاری میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے
بیاد شاعر اہل بیت سید آل رضا از علامہ ضمیر اختر نقوی
سید آل رضا کے خطوط اور اصلاحیں از وحید الحسن ہاشمی
باقیات آل رضا از وحید الحسن ہاشمی
آل رضا کا فن غزل گوئی از: شبیہ الحسن
سید آل رضا، شخصیت اور فن از: ڈاکٹر سیدہ عصمت نقوی

تاوان

زویا صفوان

اسلامی اقتدار کی خاطر، مسلمانوں کو دبانے کی سازش کے مقابل وہ سینہ سپر ہوگئے۔ انہوں نے انگریز حاکموں کو ان کی اوقات دکھانے کی کوشش کی تھی اسی کوشش کا تاوان تھا کہ عمر کا ایک بڑا حصہ کالا پانی کی سزا جھیلنے میں گزار دی۔ مگر جھکے نہیں۔

ایک عالم با عمل کی زندگی سے اخذ کردہ دلچسپ سرگزشت

ضلع انبالہ کے قصبہ تھانیسر کے رہائشی جعفر نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد بس دو ہی زیر بحث عوامل دیکھے اور سنے تھے۔ مسلمانوں کی تنزلی و زبوں حالی اور انگریزوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ۔

اس کے گھر میں اکثر والد اور ان کے احباب ان باتوں پر باہمی خیال آرائی کرتے ہوئے تلخ اور آزردہ ہو جایا کرتے۔ سات سالہ جعفر ان کی یہ گفتگو بہت انہماک سے سنا کرتا۔

”حالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔“ شفیع نے کہا۔

”خراب تو ہوں گے ہی۔ ملکی صورت حال کا جو عالم ہے وہ ہم سب کے سامنے ہی ہے۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی بادشاہ ہیں جن کے آباؤ اجداد نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ وسیع تر سرزمین فتح کی تھیں۔ ایک عالم ان کے نام سے کانپتا تھا۔“ عبدالرحمٰن کہنے لگا۔

”عیش و عشرت میں پڑیں گے تو یہی حال ہوگا ناں۔“ جعفر کے والد نے لب کشائی کی۔ ”مسلمان اپنا ماضی بھی تو فراموش کر چکے ہیں۔ کیا درخشندہ روایات تھیں ہماری! کیا دبدبہ اور وقار تھا!“

”ہاں! اب تو سب کچھ ملیامیٹ ہوگیا ہے۔ کاش وہ گھڑی دوبارہ لوٹ سکے جب ان انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ کاش اس غلطی کی اصلاح کی جاسکے۔“ عبدالرحیم نے تاسف سے کہا۔

”بس وقت کی یہی تو ستم ظریفی ہے کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا اور ہمیں اپنی غلطیوں کے پچھتاووں میں جلتے رہنے کے لیے یونہی چھوڑ جاتا ہے۔“ جعفر نے اپنے والد کو کہتے سنا۔

”پچھتاوے تو اب دن رات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ نتائج جو اس قدر بھیانک سامنے آرہے ہیں۔“

عبداللہ نے سرد آہ بھری۔

"ایسا تو ہوگا ہی۔ اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کر سب اختیارات انہیں جو سونپ دیے ہیں۔ اب وہ جو چاہے سلوک کرسکتے ہیں۔ ہم اپنی ہی سرزمین میں اتنے بے بس ہیں کہ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری و دفتری زبان قرار دے دیا گیا اور ہم کچھ بھی نہیں کرسکے۔" عبدالرحمٰن کی تملاہٹ اور بے بسی دیدنی تھی۔

"خدا جانے! یہ دخل اندازیاں کس موڑ یا انجام تک پہنچیں گی؟" شفیع نے اضطراب سے کہا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی روز عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجائے گا اور نتیجہ کسی تصادم یا جنگ کی صورت میں برآمد ہوگا۔" عبدالرحیم نے قیاس آرائی کی۔

"اگر کبھی ایسا وقت آیا تو بشرطِ زندگی میں بھی صف اوّل میں ان انگریزوں سے لڑوں گا۔" عبداللہ نے جوش سے کہا۔

"صرف تم ہی نہیں میرے عزیز! ہم سبھی کارِ خیر میں دل و جان سے حصہ لیں گے۔"

والد کا یہ عزم دیکھ کر جعفر اپنے قلب و روح میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ایسا کوئی بھی وقت آنے پر والد نہایت جرأت اور بے مثال بہادری کا مظاہرہ کریں گے لیکن تقدیر نے یہ موقع ہی نہ دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اجل نے اس کے والد کو دبوچ کر اسے تپتی کی کڑی دھوپ میں جھلنے کے لیے چھوڑ دیا۔

وہ دور جعفر کی زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا۔ والد کے سایہ سے محروم ہوجانے کے بعد معاشی آسودگی کے باوجود زندگی بے حد مشکل ہوتی گئی۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ اس کا کوئی بڑا بھائی بہن بھی سمجھانے 'رہنمائی کرنے یا الجھنوں کا کوئی سرا تلاش کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ ایک چھوٹے بھائی کی عمر ابھی محض چھ ماہ تھی۔ والدہ بھی نیم خواندہ تھیں۔ وہ اسے پڑھانے یا کسی بہتر رہنمائی کی ذہنی صلاحیت سے محروم تھیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جعفر نے پڑھائی ترک کرکے بے مقصد گھومتے پھرتے رہنے کو اپنا شعار بنالیا۔

والدہ یہ صورتِ حال دیکھ کر کڑھتی رہتیں تاہم بیٹے کو کسی منزل کی مسافت فراہم کرنے سے قاصر بھی تھیں۔ بس دل و جان سے بیٹے کے حق میں دعائے خیر کردیا کرتیں پھر جانے کون سی دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ٹھہری اور جعفر کی زندگی نے نیا موڑ لے لیا۔

ان دنوں اس کے والد کے دوست عبدالودود کی تھانیسر دوبارہ آمد ہوئی۔ وہ جعفر کو اس طرح گلی کوچوں میں اپنا وقت ضیاع کرتے دیکھ کر برداشت نہ کرسکے اور اسے اپنی سرپرستی میں لے کر دوبارہ پڑھائی کی طرف مائل کرنا شروع کردیا۔ جعفر کے دل و دماغ پر چھائی یکسانیت' آوارہ گردی اور فراغت کی کائی چھٹنے لگی۔ اس نے ناقابلِ یقین انداز میں اپنی زندگی کی ان نئی سرگرمیوں کا ردِعمل دیا اور مختصر عرصہ میں ہی قرآن پاک کے تین پارے حفظ کرلینے کے بعد سینکڑوں احادیث بھی حفظ کرلیں۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو اس نے 'عرائض نویسی' میں ایسی شاندار مہارت حاصل کی کہ ماہر وکلاء بھی اس کے ہنر سے استفادہ کرنے کے لیے رجوع کرنے لگے۔ جعفر کی مہارت نے اس کے مربی و سرپرست کو بہت سرشار کیا۔ وہ ایک روز اسے اپنے پاس بلا کر کہنے لگے۔

"مجھے خوشی ہے فرزند! میں نے تمہارے والد کی کرم فرمائیوں کا قرض کسی نہ کسی حد تک چکا دیا ہے۔"

"آپ نے مجھ پر بہت احسانات کیے ہیں محترم! قرض تو اسی روز چکا دیا تھا جب میرے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا۔ اس کے بعد تو آپ نے عنایات کا ایک طویل سلسلہ روا رکھا ہے۔ ان احسانات و عنایات کا قرض تو میں کبھی بھی نہیں چکا سکتا۔" اس نے حقیقی ممنونیت سے جواب دیا۔

"جیتے رہو فرزند! میری دلی دعا ہے کہ پروردگار تمہیں سدا کامیابیاں اور اپنی نصرت عطا فرمائے۔ بس اب میری ایک ہی تمنا ہے کہ تم اپنے والد کی آخری خواہش کے مطابق انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز ضرور کرنا۔ اس سرزمین کو ان کے چنگل سے آزاد کروانے کی کوشش میں اپنا بھرپور کردار ضرور ادا کرنا۔ یہی میرے قرض کی ادائیگی ہوگی۔"

جعفر نے ان کی بات پر سرِ تسلیم خم کردیا۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبے کے ابتدائی خدوخال پروان چڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

برس ہا برس سے برطانوی استحصال سہنے کے بعد برصغیر کے عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا تو چشمِ فلک نے 1857ء کی 'جنگِ آزادی' اس جنگ میں ہندو اور مسلمانوں کی باہمی شرکت اور پھر غداری کے نتیجہ میں برصغیر کی شکست اور ہندوستان پر مکمل برطانوی تسلط کے مناظر بھی دیکھے۔

جعفر ان دنوں عیال دار ہوچکا تھا۔ معاشی آسودگی ماضی کی نسبت مزید قابلِ رشک تھی۔ وہ ملکی صورتِ حال سے ہر لمحہ باخبری رہا کرتا۔ اسے بہرحال ایک بات کا اطمینان بھی تھا کہ غیور اور باہمت عوام نے چھ سال گذر جانے کے باوجود برطانوی تسلط کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

اسی دوران ایک ہم راز و ہم نشین جعفر سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ اس کے پاس وافر مقدار میں خبریں اور اطلاعات موجود تھیں۔

"کہو! کیا احوال ہیں میرے عزیز؟" جعفر نے دریافت کیا۔

"پچھلے تین ماہ سے غربی ہند کی سرحد پر ملک یاغستان میں برطانیہ کے خلاف جنگ کا آغاز ہے۔" نووارد نے بتایا۔

"خوب! تو کیا صورتِ حال ہے انگریزوں کی اس جنگ میں؟" جعفر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"انگریزوں کی کمان جنرل چیمبرلین کے ہاتھ میں تھی۔ اچھا جنگ جو تھا وہ۔ ایبٹے کی گھاٹی میں برطانوی فوج کو خاصے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کے بتایا۔

"مقامی فوج کی کیا صورتِ حال رہی؟" جعفر نے اگلا سوال کیا۔

"ڈٹے ہوئے ہیں۔ ملا عبدالغفور اخوند سوات بھی اپنے لاتعداد مریدوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے۔ شہادت کی تمنا میں ہمارے مسلمان بھائیوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ ابھی تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ جنرل چیمبرلین شدید زخمی ہوا ہے۔ برطانوی سپاہیوں میں ہلاک شدگان کی تعداد سات ہزار ہوچکی ہے اور پنجاب بھر کی چھاؤنیوں سے فوج سرحد پر بھیجی جارہی ہے۔"

اس اطلاع پر جعفر نے مسرور سے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس نے جنگ میں مالی امداد کی بھرپور فراہمی یقینی بنا کر اپنے اس عزیز کو رخصت کردیا۔

کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ 'ونجے' کے پہاڑ پر جاری اس جنگ میں اپنی ہزیمت کے تناؤ میں وائسرائے ہند 'لارڈ ایلجن' کا انتقال ہوگیا۔ جعفر اس نئی صورتِ حال اور جنگ میں اپنے کردار پر بہت مطمئن تھا لیکن یہ خوشی و اطمینان جلد ہی گرہن کا شکار ہوگئے۔ اواخر 1863ء میں 'غزن خان' نامی ایک ولایتی افغان نے ضلع کرنال میں پانی پت کی چوکی تک ڈپٹی کمشنر کرنال کو یہ اطلاع پہنچا دی کہ تھانیسر کا نمبردار محمد جعفر زعدوی اور مالی امداد بہم پہنچا رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے بلاتاخیر بذریعہ تار یہ اطلاع ضلع انبالہ تک پہنچا دی۔

حالات نہایت تیزی سے کروٹ لے رہے تھے۔ غزن خان ابھی ڈپٹی کمشنر کو یہ خبر دے کر نکلا ہی تھا کہ ایک اور شخص ڈی سی سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ وہ اس سے کافی بے تکلف تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں غزن خان کی آمد کا مقصد اگلوا لیا اور حقیقت جان کر بے چین ہوگیا۔ سوئے اتفاق وہ جعفر سے واقف ہی نہیں بلکہ اس کے کام و اہلیت کا مداح بھی تھا۔ اس نے فوری طور پر 'کاوا' نامی ایک ملازم کو تھانیسر روانہ کردیا تاکہ جعفر کو اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا جاسکے۔

کاوا شب کے آخری پہر تھانیسر پہنچ پایا۔ وہ جعفر کی رہائش گاہ پر آیا تو مکین گہری نیند سوچکے تھے۔ ہر سو سناٹا اور دروازے مقفل تھے۔ کاوا کچھ لمحے وہاں کھڑا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں یہی خیال کلبلا رہا تھا کہ اس وقت بے آرام کرنے کی بجائے فجر کے وقت مطلع کرنا ہی مناسب ہوگا۔ تقدیر اپنی چالیں نہایت اطمینان سے چل رہی تھی۔ کاوا کو علم ہی نہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر کی برقی تار سے دی گئی اطلاع انبالہ پہنچ چکی ہے جس کے نتیجہ میں خانہ تلاشی کا وارنٹ جاری کروا کے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس' کپتان پارسن' اہلکاروں کی ایک کثیر تعداد کے ہمراہ اسی لمحہ جعفر کے مکان پر آن دھمکا۔

پارسن نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر کر جعفر کو باہر بلوایا اور خانہ تلاشی کا وارنٹ دکھا دیا۔ جعفر اس صورتِ حال پر لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا۔ اسے گھر کی تلاشی دینے میں کوئی عار نہیں تھا۔ قباحت صرف بیٹھک میں رکھے اسی کے لکھے ہوئے ایک خط میں تھی۔ خط کے مندرجات بھی خاصے تباہ کن ثابت ہوسکتے تھے۔ اس کی برآمدگی کی صورت میں جعفر کے خلاف مزید کسی ثبوت کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

یہ خط جعفر نے تقریباً چھ گھنٹے قبل لکھا تھا۔ امیر قافلہ کے نام لکھے گئے اس نامہ میں اصطلاحی طور پر ان ہزاروں اشرفیوں کی روانگی کا ذکر تھا جو اس نے جنگ میں اپنے ہم وطنوں کی مدد کے لیے ارسال کرنی تھیں۔

"ٹھیک ہے! لے لیجیے تلاشی۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"میں اس شمالی دروازے کی تلاشی پہلے لوں گا۔"

پارسن کے یہ الفاظ مزید دھماکا ثابت ہوئے۔ دہلیز کا وہ دروازہ بیٹھک کی جانب ہی کھلتا تھا۔ جعفر کا سر لمحہ بھر کے لیے چکرایا تاہم اس نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے متوازن انداز میں دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"منشی عبدالغفور! باہر میرے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب مکان کی تلاشی کے لیے کھڑے ہیں۔ جلدی دروازہ کھولو!"

"زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" پارسن اس کا مقصد بھانپ گیا۔

جعفر متانت سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں یہی سوچ رواں تھی کہ بیٹھک میں موجود افراد اس کا مدعا سمجھ کر خط چاک کردیں لیکن تقدیر نے ان کی عقل و فہم گویا سلب ہی کرلی تھی۔ اندر موجود نفوس میں سے کسی نے بھی جعفر کا اشارہ نہ سمجھا اور اگلے ہی لمحہ دروازہ کھل گیا۔

جعفر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس صورت حال میں کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا اور معجزے بھی کہاں عام ہوتے ہیں؟ پارسن نے اس خط کے علاوہ بھی کئی ایسے مکتوب برآمد کرلیے جن میں 'محمد شفیع انبالوی' سے بات چیت کی گئی تھی۔ گو یہ بات چیت معمولی نوعیت کی ہی تھی لیکن نقصان یہ ہوا کہ پارسن نے شفیع انبالوی اور اہل پٹنہ کو بھی اپنا ہدف بنالیا۔ اس نے جعفر کے محرر منشی عبدالغفور اور عباس نامی ایک بنگالی ملازم کو گرفتار کرلیا۔ جعفر کی گرفتاری فی الوقت وارنٹ نہ ہونے کے باعث ممکن نہیں تھی لہٰذا اسے وقتی طور پر آزاد ہی رہنے دیا گیا۔

☆☆☆

پولیس کی اس وقتی پسپائی نے جعفر کو متفرق سوچوں میں مبتلا کردیا۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ سرحد کی جنگ کا تناؤ اور غصہ کسی نہ کسی صورت اسی پر نکالا جاتا۔ برآمد شدہ خط ناقابل تردید ثبوت تھا۔ اس کے بل بوتے پر اسے کامیابی سے عبرتناک سزا دلوائی جاسکتی تھی۔

جعفر نے اس موقع پر اپنی والدہ اور اہلیہ سے مشورہ کرکے کم تھانیسر سے فرار ہوجانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا منظر عام سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔ وہ بارہ دسمبر 1863ء کو تھانیسر سے روانہ ہوکر موضع پپلی میں اس مقام پر آیا جہاں تحصیل اور تھانہ موجود تھے۔ اس نے تحصیل کے ملازمین اور پولیس کو بھی تمام تر صورت حال سے آگاہ کیا۔ ان سب کا متفقہ مشورہ یہی تھا کہ اس کا انبالہ چلے جانا ہی بہتر ہے تاکہ وہ اس بات کی تفتیش کرسکے کہ مقدمہ کی اصل ماہیت کیا اور مخبر کون ہے؟

یہ مشورہ جعفر کے دل کو لگا لیکن اس کے باوجود وہ اپنا اصل فیصلہ اور منزل سب سے پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ خوش دلی سے رخصت ہوکر گھوڑے پر سوار ہوا اور انبالہ روانہ ہوگیا۔ دن کی روشنی جب تاریکی میں ڈھلی تو وہ ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں دور تک کوئی اور مسافر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جعفر کو ایسے ہی کسی موڑ کی تلاش تھی۔ اس نے انبالہ جانے والی سڑک چھوڑی اور جنگل کی راہ سے اپنی زمینداری کی زمین کے ایسے مخصوص مقام پر پہنچ گیا جو تھانیسر سے متصل تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں اپنے اہل خانہ کو تلاشنے لگیں۔

کچھ ہی دیر بعد اس کی والدہ، بیوی بچے اور چھوٹا بھائی محمد سعید دکھائی دے گئے۔ وہ سب آخری ملاقات کے لیے وہاں آئے تھے۔ جعفر نے کچھ دیران سے تشفی بھری باتیں کیں اور واپس روانہ ہوگیا۔

روانگی کے وقت اسے بھرپور اطمینان تھا کہ راستہ بدل لینے کے باعث پولیس اس کی گرد بھی نہ پاسکے گی۔ اسی اطمینان میں وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہوکر ہر قسم کی احتیاطی تدبیر فراموش کر بیٹھا اور دہلی روانہ ہوگیا۔ دہلی کے بعد اس کی اگلی منزل علی گڑھ تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں حاکم انبالہ نے کن قیامت خیز کارروائیوں کا آغاز کررکھا ہے۔

وہاں صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ پارسن اگلے ہی روز گرفتاری کا وارنٹ لے آیا تھا۔ جعفر کو غائب پاکر اس نے تھانیسر میں ڈھنڈیا مچادی۔ اس کی والدہ، چھوٹے بھائی اور بھاوج کو گرفتار کرلیا گیا۔ سعید اور اس کی اہلیہ پر تو خاصہ تشدد بھی آزمایا گیا تھا۔ پارسن ہی کے ایماء پر جعفر کی اہلیہ کو بھی نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تاہم اپنے بیوی بچوں کو اکسی کسی بھی صورت حال کے خدشہ کے تحت وہ آخری ملاقات کے بعد پانی پت چھوڑ آیا تھا۔ پارسن نے اپنے اہلکاروں کو پانی پت بھی روانہ کیا لیکن وہاں ان کے مربی مولوی رضی الاسلام اور اس کی والدہ نے خوب دلیری کا مظاہرہ کیا اور پولیس کو اس کی اہلیہ تک پہنچنے ہی نہ دیا۔

پارسن نے پنجاب بھر میں جعفر کی تلاشی مہم شروع کروا رکھی تھی۔ اس کی گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے انعام مقرر کیا گیا۔ پارسن کو اس سمت میں تو کامیابی نہ ملی البتہ محمد سعید پر کیا گیا تشدد بارآور ثابت ہوا۔ وہ اس انسانیت سوز سلوک کے بعد اپنی زبان بندی برقرار نہ رکھ سکا اور پارسن کو بتا دیا کہ جعفر کی منزل دہلی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی پارسن نے دہلی میں بھی جعفر کی ڈھنڈیا مچادی۔ ہر سرائے کے بعد شہر کے دروازے بھی بند کردیے گئے۔ ہزارہا آدمیوں کی تلاشی اور بچاسیوں کو گرفت میں لینے کے بعد بالآخر اسے علم ہوگیا کہ جعفر ایک شکرم پر سوار ہوکر دو آدمیوں کے ہمراہ علی گڑھ روانہ ہوا ہے۔ اس نے بالتاخیر یہ خبر برقی تار کے ذریعے علی گڑھ پہنچادی۔

دوسری جانب انبالہ میں محمد شفیع کے مکان کی تلاشی بھی کروائی گئی۔ اتفاق سے محمد شفیع لاہور میں موجود تھا۔ انبالہ میں اس کے بھائی محمد رفیع اور مولوی محمد تقی، منشی عبدالکریم نامی کارندے گرفتار کرلیے گئے۔ ان افراد پر بھی بے پناہ تشدد کیا گیا۔ زندگی بچانے کی جبلی خواہش کے تحت محمد رفیع اور محمد تقی وعدہ معاف گواہ بننے پر راضی ہوگئے۔ عبدالکریم البتہ ثابت قدم رہا۔

تقدیر ہر لحاظ سے جعفر کے ساتھ بدترین آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ وہ علی گڑھ تک پہنچا ہی تھا کہ پولیس نے سڑک کے کنارے پر ہی اسے گرفتار کرلیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے بنگلے پر لے گئے۔ ڈی ایس نے اسے فوراً مجسٹریٹ کے پاس روانہ کردیا۔ تشویش اور خدشات کے باوجود جعفر اور اس کے ساتھیوں نے کسی قسم کے انتشار کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ نہایت سکون اور اطمینان سے اپنا وقت گذارنے لگے۔

اس شام جعفر نے تیمم کرکے نماز کی ادائیگی کا آغاز کیا ہی تھا کہ پارسن وہاں چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک اور چہرہ غرور و فرعونیت کا عکس بنا ہوا تھا۔

"انہیں پھانسی گھر میں بڑی حفاظت سے بند کردو۔ ان سے بہت اہتمام سے نمٹا جائے گا۔" اس نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا اور تن کر چلتا ہوا لوٹ گیا۔

پارسن کے حکم پر من و عن عمل کیا گیا۔ اس قید خانے کے دیگر لوگ اور پہریداران کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور اہلکاروں کے تیور دیکھ کر خاصے متجسس تھے۔ رات گئے ایک پہریدار نے جعفر سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا جرم کرکے آئے ہو بھئی؟ میں ایک طویل عرصہ سے یہاں پہریدار ہوں۔ میں نے پھانسی پانے والے مجرموں پر بھی صرف ایک ہی پہرہ دیکھا ہے۔ تم پر تین پہرے لگائے گئے ہیں۔ ایسا کیا کرآئے ہو تم؟"

جعفر اس کے تجسس اور انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور متانت سے کہنے لگا۔

"بہت بڑا جرم کیا ہے میں نے۔ اپنے مالک و آقا کی مرضی و رضامندی کے بغیر فرار ہوا تھا۔ میری اس خطا پر آقا بہت خفا ہیں اسی لیے مجھے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں پکڑوا دیا۔"

"اوہ! کون ہیں تمہارے آقا؟ کیا کہیں کوئی بادشاہ ہیں؟" پہریدار بیک وقت حیرت زدہ اور مرعوب تھا۔

"ہاں! وہ بادشاہوں کے بھی بادشاہ ہیں۔" جعفر نے محض اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

اسی اثناء میں ایک اور پہریدار ان کے لیے کھانا لے آیا۔ یہ اس جیل میں جعفر کا اوّلین طعام تھا۔ اسے دو روٹیاں اور تھوڑا سا ساگ تھمایا گیا۔ ساگ ہر قسم کی پتی سے عاری ایسے موٹے موٹے ڈنٹھلوں پر مشتمل تھا جن کے چبانے کے لیے لوہے کے دانت درکار ہوتے۔ روٹیوں میں بھی

مراسلات:

جعفر کے ایک اہم رفیق مولانا یحییٰ کا ذاتی کردار کسی نگینے سے کم نہیں تھا۔ ان کا صبر و استقلال قابل دید تھا۔ شب کے پچھلے پہر نماز اور دعا میں مصروف رہتے۔ اکثر اشعار عاشقانہ دیوان شاہ نیاز و حافظ وغیرہ پڑھا کرتے۔ اس دوران ان پر ایک وجدی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ حضرت خبیبؓ کے اشعار دہراتے رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ تقریباً ڈھائی ماہ کی قید تنہائی بھی نہایت صبر و استقلال سے برداشت کی۔ اس دوران جب کوئی سپاہی، قیدی یا پہریدار سامنے آجاتا تو اسے توحید کا وعظ لازمی کیا کرتے۔ آخرت کی زندگی اور قبر کے عذاب سے ڈراتے۔ پہرے کے لیے آنے والے سکھ، گورکھے ان سے ملاقات کے بعد مسلمان ہوجاتے تھے۔ اس کے علاوہ جیل میں حکم عدولی اور بدمعاشی کرنے والے قیدی بھی ان کی بات چیت اور نرم گفتاری سے متاثر ہوکر ایسے نیک چلن ہوجاتے کہ جیل انتظامیہ بھی حیران ہوجاتی۔

تقریباً ایک چوتھائی پاؤ دال اور مٹی تھی۔

''کیا ہم یہ سب کھائیں گے؟'' اس کے بنگالی ساتھی نے حسرت سے دریافت کیا۔

''جو بھی ملا ہے اسے خدا کا شکر ادا کرکے کھالو۔ ہم گناہ گاروں کے پاس کسی شکوہ یا مطالبہ کا حق نہیں ہے۔'' جعفر نے جواب دیا۔ اسے شدت سے پارسن کے اگلے اقدام کا انتظار تھا۔

دوسرے دن پارسن ان تینوں کو لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔ قبل ازروانگی انہیں بیڑی، ہتھکڑی اور طوق پہنائے گئے۔ جعفر کے طوق میں بطور ہانک دو ڈھائی اوٹ زنجیر ڈال کر اس کا سرا پولیس کے مسلح سپاہی کے ہاتھ میں دیا اور اسے جعفر کے پیچھے بٹھا دیا۔ پارسن اور دوسرا پولیس انسپکٹر اس کے دائیں بائیں بھرے ہوئے پستول لیے بیٹھ گئے۔ ان کے بدن جعفر میں پیوست تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کے حوالے سے شدید خوفزدہ ہیں۔ جعفر ان کی کیفیت سے حظ اٹھانے کے لیے ذرا سی حرکت کرتا تو پارسن فوراً کہنے لگتا۔

''اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو اس تمنچے سے تمہیں مار دوں گا۔''

علی گڑھ سے دہلی تک کا یہ سفر ان کے لیے ہر لحاظ سے کٹھن تھا۔ کھانا پینا تو درکنار انہیں کسی سخت ضروری حاجت کے لیے بھی کہیں نہ اتارا گیا۔ نماز کے اوقات میں جعفر تیمم کرکے بیٹھے بیٹھے ہی اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔

اس سفر کا اختتام ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے بنگلے پر ہوا۔ انہیں پہلے تو بنگلے کے تہ خانے میں قید کیا گیا۔ اس کے بعد کرنال اور پھر انبالہ پہنچا دیا گیا جہاں ظلم و تشدد کا ایک ہولناک دوران کا منتظر تھا۔

انبالہ پہنچنے کے دوسرے روز پارسن، سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس میجر ٹکفیل اور ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی اس کی کوٹھری میں چلے آئے۔ ان کے بشروں سے واضح تھا کہ وہ اپنی حکمت عملی پہلے ہی طے کرچکے ہیں۔

''اگر تم اس مقدمہ کا مکمل حال بتادو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا ورنہ بہت برا ہو جائے گا۔'' پارسن نے اسے تنبیہ کی۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

پارسن اسے مختلف حیلوں سے گھیرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ناکامی پر تشدد کا ایک طویل سلسلہ شروع کردیا گیا۔ جعفر بھی اپنی زبان بندی پر برقرار رہا۔ اس تشدد کے بعد اس کے ذہن میں یہی سوچ ابھر رہی تھی کہ اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس سوچ کے بعد فوری ردِعمل کے طور پر اس نے اپنے رمضان کے کچھ قضا روزے رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلے روز پارسن کی حکمت عملی قدرے مختلف تھی۔ وہ ہلکے سے تشدد کے بعد جعفر کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا جہاں میجر ٹکفیل بھی موجود تھا۔ ان سب نے یکے بعد دیگرے اس سے ایک ہی بات کی۔

''اگر تم اپنے دوسرے ساتھیوں اور معاونین جہاد کے متعلق بتادو تو ہم تمہیں سرکاری گواہ بنا کر نہ صرف رہا کر دیں گے بلکہ بعد میں کوئی بڑا سرکاری عہدہ بھی دے دیں گے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا!'' جعفر مصر رہا۔

''عقل مندی سے کام لو ورنہ پھانسی پر چڑھا دیے جاؤ گے۔'' پارسن جھنجلایا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس کی رٹ برقرار تھی۔

پارسن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے مار پیٹ کا آغاز کردیا۔ جعفر ہر تشدد سکون اور ظرف سے سہتا رہا۔ اس مار پیٹ میں وقفے کے دوران اس نے کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دینے والے ایک درخت کے پتوں سے روزہ افطار کیا۔ پارسن نے اسے رات آٹھ بجے کے بعد دوبارہ جیل پہنچا دیا جہاں اس کے ساتھیوں نے کھانے کا حصہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جعفر نے وہ کھانا تناول کیا اور خدا کا شکر ادا کرکے سو گیا۔

☆☆☆

جعفر کی جانب سے مایوس ہو جانے کے بعد پارسن نے اپنی اگلی حکمت عملی کے تحت محمد رفیع اور مولوی محمد تقی کو مخبر بنا کر رہا کردیا۔ ان کے تعاون سے لاہور میں مقیم محمد شفیع کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بعد انہی کی رہنمائی میں پارسن نے پٹنہ میں ایشری پرساد نامی پولیس اہلکار اور پٹنہ کے سابق کمشنر ٹیلر سے ملاقات کی۔ یہ دونوں افراد پارسن ہی کے ہم خیال تھے۔ ان کے تعاون سے مولوی یحییٰ علی، مولوی عبدالرحیم، الٰہی بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کرکے انبالہ بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد پارسن نے بنگال میں بھی گرفتاریوں اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کردیا۔ ان گرفتارشدگان کو ذہنی وجذباتی طور پر شکستہ کرنے کے لیے اپنے معاونین پر عنایات کی برسات کردی گئی۔ ایشری پرساد ڈپٹی کلکٹر متعین ہوا۔ مخبر

غزن خان کو سرکاری طور پر دو گاؤں فراہم کیے گئے۔

ان حالات سے جزوی طور پر بے خبر جعفر اپنے مقدمہ کے فیصلے کا منتظر تھا۔ مقدمہ کا آغاز ماہِ اپریل میں ہوا۔ پہلی پیشی میں جعفر کو علم ہوا کہ محمد سعید اور محمد رفیع کو ان کے خلاف گواہ بنالیا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر پچاسیوں افراد بھی اسی انداز میں گواہی کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ ان افراد کا یہ عالم تھا کہ وہ گواہی دیتے وقت جعفر اور شفیع کی جانب دیکھ کر زار و قطار رونے لگتے تھے۔ جعفر کو بہرحال اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ گواہی نہ دینے کی صورت میں ان پر ظلم و تشدد کے بے مثال پہاڑ توڑے جائیں گے۔ اس کے گھر میں پرورش پانے والے ایک لڑکے عباس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ عباس نے عدالت میں آموختہ بیان دینے سے گریز کیا تو اس پر اسی رات ایسا تشدد کیا گیا کہ وہ اذیت سے ہی جاں بحق ہوگیا۔

جعفر ہر صورتِ حال کا متانت اور وقار سے سامنا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے پاس سعید کا بھیجا گیا ایک سپاہی آیا اور راز داری سے کہنے لگا۔

''تمہارا بھائی کہہ رہا ہے کہ اسے مار پیٹ کر تمہارے خلاف گواہ بنایا گیا ہے۔ وہ مقدمے کے دوران اپنے بیان سے منحرف ہو جائے گا۔''

''اس سے کہنا میری قید یا رہائی تمہارے بیان پر موقوف نہیں ہے۔ یہ معاملات صرف اور صرف خدائے واحد کے اختیار میں ہیں۔ اگر اس نے گواہی دینے کے لیے کوئی حلف اٹھایا ہوا ہے تو اب اپنے بیان سے نہ پھرے اور یہ گواہی مکمل کرے۔''

سپاہی نے یہ بیان من و عن سعید تک منتقل کردیا لیکن وہ بھی اپنے دعوے پر قائم رہا۔ اس نے برسرِ اجلاس اظہار سے انکار کردیا۔ پارسن کی حالت اور طیش دیدنی تھے۔ اس طیش میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب مجسٹریٹ نے سعید کی منحرفی کے باعث کسی قسم کی سزا دینے کی بجائے اس کا نام گواہان کی فہرست سے خارج کردیا۔

گواہوں کی کثرت کے باعث یہ مقدمہ اگلے ایک ہفتے تک کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ اس دوران انہیں نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ جعفر دورانِ مقدمہ ہی تیمم کرکے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا۔

ایک ہفتہ بعد یہ مقدمہ سیشن کے سپرد کردیا گیا۔ اس وقت تک وہ پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے تاہم بعد ازاں انہیں ایک ہی جگہ حوالات میں بند کردیا گیا۔ چار ماہ کی قید تنہائی کے بعد دوبارہ ملاقات ایک انوکھا اور دلگیر تجربہ تھی۔ جعفر اپنے ساتھیوں سے مل کر اکثر شیخ سعدی کا ایک ہی شعر دہرایا کرتا۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

وہ اس ظلم و ستم اور مقدمہ کی کارروائی کو اپنے لیے نہایت خوش قسمتی تصور کرتا تھا کیونکہ وہ خدا کی راہ میں امتحان دے کر ثابت قدمی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ مولوی یحییٰ علی کی کیفیت جعفر سے بھی سوا تھی۔ اس کی زبان پر اکثر وہ اشعار رواں رہتے جو حضرت خبیبؓ کفارِ مکہ کی جانب سے پھانسی دیے جانے سے قبل دہراتے تھے۔

''لست ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان فی اللہ مصرعی
وذلک فی ذات الالہ وان یشاء
علی اوصال شلو ممزع''

''نہیں پروا کرتا ہوں میں جبکہ مارا جاؤں میں مسلمان کسی کروٹ پر ہو
پھر کر جانا میرا خدا کی طرف ہے اور یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے
اور اگر چاہے برکت دیوے
او پر ملادیے ٹکڑوں پراگندہ کے۔''

اس کے علاوہ ایک اور شعر بھی اکثر دہرایا جاتا۔

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گذرے

☆☆☆

سیشن کورٹ میں مقدمہ جاری ہوئے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ اس دوران پٹنہ میں مقیم چند ساتھیوں نے ان کے لیے ایک جہاں دیدہ اور گرگ دباراں وکیل 'پلوڈن' کا تقرر کروادیا۔ پلوڈن کے وکالت نامے پر آٹھ افراد نے تو دستخط کردیے البتہ جعفر نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ اپنی وکالت خود ہی کرے گا۔ اس نے اگلی ہر پیشی میں گواہان کے بیانات کی دھجیاں اڑادیں۔ سیشن جج اور وکیل استغاثہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کرتے۔ ایک پیشی پر جج نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اسے کہا۔

''تمہارے کسی تحریری یا تردیدی بیان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنا جرم قبول کرکے عدالت کی

مہربانی اور رحم سے اپنی معافی طلب کرو۔"
جعفر یہ تجویز سن کر پہلے تو خاموش ہوا پھر اعتماد سے کہنے لگا۔
"مجھے انصاف کے سوا کسی شے کی طلب نہیں ہے اور انصاف کی اُمید پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔"
اس دوٹوک جواب نے جج کو مزید برافروختہ کردیا۔ اس نے جعفر کی جانب سے اپنی برءیت کے لیے درجن بھر گواہان طلب کرنے کا مطالبہ رد کردیا۔ صفائی کے دیگر گواہوں کا بیان بھی درخور اعتناء نہ سمجھا گیا۔ جعفر کے لیے اب یہ بات سمجھنی مشکل نہ تھی کہ انہیں بہرصورت سزا دے کر انصاف کے اس ادارے میں بے انصافی کی نئی مثال قائم کی جائے گی۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔
دو مئی 1864ء کو جج نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے سب سے پہلے جعفر کو مخاطب کیا اور کہنے لگا۔
"تم بہت عقل مند، ذی علم، قانون دان، اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی سرکار کی مخالفت میں خرچ کی۔ تم سرکار مخالف عناصر اور باغیوں کو نقدی و مالی تعاون فراہم کرنے کے سہولت کار بنے رہے۔ تم صریحاً پھانسی کے حق دار ہو۔ تمہاری کلی جائیداد ضبط سرکار ہوگی۔ تمہاری لاش وارثوں کے سپرد کرنے کے بجائے نہایت ذلت سے گورستان جیل میں گاڑ دی جائے گی۔ مجھے ذاتی طور پر تمہیں پھانسی پر لٹکتے دیکھ کر بہت خوشی ہوگی۔"
جعفر یہ بیان نہایت صبر و سکون سے سنتا رہا اور اختتامی فقرہ کے ردِعمل میں متانت سے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "زندگی اور موت کا کلی اختیار اللہ رب العزت کے پاس ہے۔ کیا علم کہ مجھ سے پہلے تم ہی راہی عدم ہو جاؤ۔"
(جعفر کی یہ بات شاید قدرت کی جانب سے ایک اشارہ ہی تھی۔ اس کی پھانسی پر ابھی عمل ہونے بھی نہ پایا تھا کہ وہ جج ناگہانی موت کا شکار ہوگیا)
جعفر کے بعد مولوی یحییٰ علی، محمد شفیع، نمبردار کو پھانسی کی جبکہ دیگر افراد کو دائمی قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کی جائیداد بھی سرکاری طور پر ضبط کرلی جانی تھی۔ اس فیصلے کے بعد یحییٰ تو بے حد بشاش رہا البتہ شفیع کی رنگت حیرت زدہ ہوگئی تھی۔
پارسن کی نگاہیں جعفر پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ اسے پُرسکون پاکر تلملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم کو پھانسی کا حکم ہے۔ تمہیں تو رونا چاہیے۔ تم کس واسطے اتنا بشاش ہے؟"
جعفر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بے نیازی سے بولا۔ "میں شہادت کی اُمید پر اتنا بشاش ہوں۔ ایک مسلمان کے لیے شہادت سب سے بڑی نعمت ہے لیکن تمہیں اس بات کا کبھی ادراک نہیں ہوسکتا۔"
پارسن اس جواب پر کینہ توز نظروں سے اسے دیکھنے لگا پھر اس نے ان افراد کو ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کا نشانہ بنانا شروع کردیا جو کہ اس عدالت میں یہ حکم سننے کے بعد زار و قطار رو رہے تھے۔ جعفر کی کیفیت میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ کچھ ہی دیر میں ان سب کو جیل خانہ پہنچا کر کیدی لباس پہنا دیا گیا۔ اس کے بعد یحییٰ، شفیع اور جعفر کو تین علیحدہ پھانسی کمروں میں مقفل کرکے دیگر افراد کو جیل خانہ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔ ان تینوں کے لیے سرکاری بغض میں کمی ہوکے ہی نہ دے رہی تھی۔ ان کے لیے ایک خصوصی حکم جاری کیا گیا کہ انہیں شب بسری کے لیے میدان میں سلایا جائے۔ ان کے لیے نہایت اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور اس کے ریشمی رسے بھی تیار کروائے جانے لگے۔
جعفر کے احباب نے اس پھانسی کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل دائر کی۔ وہاں بھی پلوڈن نے ہی ان کی پیروی کی اور بھرپور دلائل دیتے ہوئے واضح کیا کہ
"یہ لوگ زیر دفعہ 121 ہرگز قید نہیں کیے جا سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا خلاف قانون ہے۔"
عدالت نے تعصب اور ناانصافی کی روش برقرار رکھتے ہوئے یہ دلائل بھی مسترد کردیے۔ جعفر کو ایسے ہی کسی اقدام کی توقع تھی۔ وہ خود کو مکمل طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ کر پُرسکون انداز میں جیل انتظامیہ کی سرگرمیاں ملاحظہ کرتا رہا۔ ان تینوں کی سزا اور جوابی رویہ انگریزوں کے لیے خاصہ چٹ پٹا موضوع بن چکا تھا۔ اعلیٰ افسران اپنی بیگمات کے ہمراہ انہیں 'دیکھنے' کے لیے پھانسی گھر آتے اور سزائے موت کے دیگر قیدیوں کے برعکس مطمئن و پُرسکون پاکر اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکتے۔
"تم کو تو بہت جلد پھانسی ہوجائے گی۔ تو تم اتنا خوشی کس واسطے کرتے ہو؟"
شفیع، یحییٰ اور جعفر اس استعجاب پر محظوظ ہوکر کم و بیش ایک ہی جواب دیتے۔ "ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر شہادت کا رتبہ ملتا ہے۔ ہم خوشی نہ منائیں تو اور کیا کریں؟"
وہ بھی ان تینوں کو دنیا کے آٹھویں عجوبے کی طرح دیکھنے لگتے۔
کچھ ہی روز گزرے تھے کہ ایک شب جیل کے چند محافظ رازدارانہ انداز میں ان کے پاس چلے آئے۔ وہ تینوں اس وقت ایک ہی کوٹھری میں موجود تھے۔ ایک محافظ نے محتاط انداز میں چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔ "رات بہت اندھیری ہے۔ آج پہرہ بھی قدرے نرم ہے۔ تم تینوں فرار ہوجاؤ۔ ہم تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔"
"اور بعد میں تم کیا کرو گے؟ کیسے جواب دہی کر پاؤ گے؟" جعفر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
"ہمیں غفلت کے جرم میں کچھ عرصہ قید کی سزا ہو جائے گی۔ وہ ہم بھگت لیں گے۔ اس وقت تمہاری جان بچانا بہت ضروری ہے۔" وہی محافظ کہنے لگا۔
دیگر اہلکار چوکنا انداز میں ہر سمت کا جائزہ لے رہے تھے۔
"ہم تمہاری نیت اور ہمت کے قدردان ہیں میرے عزیز! پروردگار تمہیں اس نیک نیتی کا اجر دونوں جہانوں میں ہی عطا فرمائے لیکن فرار کوئی حل نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری برءیت اور زندگی کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے کوئی نہ کوئی راہ ضرور پیدا ہوجائے گی۔" جعفر نے جواب دیا۔
"ایک بار پھر سوچ لو میاں! اپنا نہیں تو اپنے اہل خانہ کا ہی کچھ خیال کرلو۔ آج تھانیسر سے خبر آئی تھی کہ تمہاری والدہ سانپ کے کاٹنے سے جانبر نہیں ہوسکی ہیں۔"
محافظ اعلیٰ کی اس بات پر جعفر شل رہ گیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی ایک باڑ رواں ہوگئی۔
"بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔" وہ دکھی اور بوجھل دل سے محض اتنا ہی کہہ سکا۔
صبر بے حد مشکل مگر ناگزیر تھا۔ بصورت دیگر اس کی افسردگی اور کرب کو سزائے موت کے خوف سے منسوب کرلیا جاتا۔ اسے اپنی یہ ہزیمت کسی بھی طور قبول نہیں تھی۔ ان کا استقلال اور ہمت بالآخر رنگ لے آئی۔ حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ وہ خود بھی حیران رہ گئے۔

انڈمان کے اصل باشندوں کے چند خواص

☆ یہ لوگ چار فٹ سے پانچ انچ تک طویل اور حبشیوں کی طرح سیاہ فام تھے۔ گول سر، آنکھیں ابھری ہوئی، سر کے بال بھیڑ سے مشابہ اور جسامت سخت مضبوط۔ جزائر انڈمان میں ان کی بارہ ذاتیں آباد تھیں۔ ایک ذات کی زبان دوسری سے بہت کم ملتی ہے۔
☆ انڈمان کے یہ قدیم باشندے اس بات کے قائل تھے کہ بھگوان آسمان میں رہتا ہے۔ وہی ہر شے کا خالق اور سب سے بڑا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا محل بہت عمدہ اور نفیس آسمان میں ہے۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے گھر سے پانی برستا ہے۔ بجلی کا شعلہ اور کڑک بھی اسی کے پاس سے آتی ہے۔ موت بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ بھلائی اور روزی بھی وہی دیتا ہے۔ سماۃ چانا پالک ایک اس کی بیوی بھی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی فنا نہیں اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوئی مگر اس کا درجہ بھگوان سے کم ہے۔ اس کا کام سمندر میں مچھلیاں پیدا کرنا ہے۔ وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔

☆☆☆

☆ انڈمان کے باشندے شیطان کے بھی قائل تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ سب برے کام شیطان کرواتا ہے۔ ان کے خیال میں شیطان دو ہیں۔ زمین کے شیطان کا نام 'ارم چوگا' اور سمندری شیطان کا نام 'جورووِنڈا' ہے۔ زمین پر ہونے والی کسی ناگہانی موت کے بارے میں کہا جاتا کہ اسے ارم چوگا نے مار ڈالا ہے جبکہ ڈوبنے کے نتیجے میں ہونے والی اموات کے بارے میں کہتے کہ اسے جرو ونڈا نے ہلاک کیا ہے۔
☆ فرشتوں کے بارے میں ان باشندوں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ مرد و عورت دونوں جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی رہائش جنگل میں ہے اور وہ انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ انڈمانی باشندے بھوت پریت کے بھی قائل تھے۔ تاہم ان بھوتوں کے اختیارات محدود تصور کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ خدا یا غیر خدا کی کسی بھی شے کی عبادت نہیں کرتے تھے۔

ان سے ملاقات کے لیے آنے والے افراد کی شادمانی اور اطمینان کی خبریں سن کر مقدمہ کے ذمہ داران مضطرب تر ہونے لگے۔ ان کا خیال و نظریہ اب یہ تھا کہ ان تینوں مجرمان کو 'شہادت' دے کر انہیں خوشی نہیں دینی چاہیے۔ ایسے افراد کو تو 'کالے پانی' بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے آشنا کرواتے ہوئے ہر پل ایک نئی موت سے ہمکنار کرنا چاہیے۔

عدالتی نظام ایک بار پھر تیزی سے حرکت میں آیا اور انہیں پھانسی گھروں سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملانے کا نیا حکم جاری کردیا۔ جیل خانہ کے دستور کے مطابق ان کی داڑھی مونچھ اور سر کے بال یکسر تراش دیے گئے۔ یحییٰ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بال اٹھاتا اور مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب کرتا۔ "افسوس نہ کرا تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی واسطے کتری گئی۔"

ان مشکلات و مصائب سے قطع نظر ہر گزرتے دن کے ساتھ جعفر کا اعتقاد اور ایمان مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ چند ہی روز بعد اسے خبر ملی کہ اس کے لیے تیار شدہ ریشمی رسہ اور پھانسی کی مضبوط ترین لکڑی پر کسی انگریز کو ہی قتل کے جرم میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ پارسن کو بھی اجل نے دبوچ لیا ہوا تھا۔

پھانسی کے اس حکم کی تنسیخ کے بعد اگلی ہی صبح انہیں دیگر قیدیوں کے ساتھ مشقت کے لیے بھیج دیا گیا۔ پہلے روز کاغذ کوٹنے کا کام ملا۔ اس کے بعد شفیع اور یحییٰ کو سوت کھولنے کے کام میں لگایا گیا اور جعفر کو تاؤگلی بھیج دیا گیا جہاں اسے کاغذ پھاڑ کر بھگونے تھے۔ جعفر نے پُرسکون انداز میں اپنے یہ نئے فرائض سرانجام دینے کا آغاز کردیا۔

کچھ عرصہ متوازن انداز میں بیت گیا۔ ان حالات میں تلاطم اس وقت پیدا ہوا جب انبالہ جیل میں وبائی بخار اور سرسام نہایت سرعت سے پھیلنے لگا۔ اموات کا تناسب و رفتار تشویش ناک حد تک بڑھ گئے۔ جعفر بھی بخار کی لپیٹ میں آیا تاہم اس کی درخواست پر چند ہندوستانی ادویات منگوا دی گئیں جن سے اسے خاصہ افاقہ ہوا۔

اس اثناء میں اس کی تمام تر جایداد بھی ضبط کرلی گئی تھی۔ ورثاء کو اتنا موقع بھی نہ دیا گیا کہ قبل از قرقی کوئی جایداد ہی علیحدہ کرلیں۔ سعید نے اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے دعویٰ دائر کیا تو اسے محض ایک کوٹھری دے کر بقیہ ماندہ منقولہ و غیر منقولہ جایداد ضبطی کے بعد نیلام کردی گئی۔

ایک طرف ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا یہ عالم تھا تو دوسری سمت جیل کی زندگی اخلاقیات کو نگلتے ہوئے نفس حاوی کرنے لگی تھی۔ نفس کی یہ شرارتیں اسے اپنی ہی نظر میں گرا رہی تھیں۔ اس کشمکش میں ان کا انبالہ جیل سے لاہور منتقلی کا وقت چلا آیا۔

روانگی سے قبل اہلیہ اور بچے بھی ملاقات کے لیے آئے۔ جیل کے باہر ایک کوٹھری میں کافی دیر تک گفتگو ہوئی جو حسرتوں اور اُمیدوں پر ہی مشتمل تھی۔ دونوں فریقین کے دل ایک دوسرے کی دید سے سخت دکھی اور رنجیدہ تھے۔ جعفر کے گیروے لباس، کمبل کے کرتے اور پاؤں کی بیڑیاں دیکھ کر اس کے عزیز و اقارب سخت تاسف زدہ اور متعجب تھے۔ وہ اپنی بساط کے مطابق انہیں تسلی دے کر صبر اور ثابت قدمی کے فضائل سمجھاتا رہا۔

اس گفتگو کے دوران اس کی مضطرب اور تشنہ نگاہیں اپنے بیٹے صادق کو دیکھ رہی تھیں۔ جعفر نے تقریباً سوا برس بعد اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ گذرے وقت میں نہ صرف نقوش کافی تبدیل ہوگئے تھے بلکہ قد و قامت میں بھی واضح اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت جعفر کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ بیٹے سے آخری ملاقات ہوگی اور وہ اسے کبھی دوبارہ زندہ حالت میں نہیں دیکھ سکے گا۔

☆☆☆

جعفر، شفیع اور یحییٰ بائیس فروری 1865ء کو تقریباً تین درجن مزید قیدیوں کے ہمراہ لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ جوگیانہ گیروے لباس اور سیاہ کمبل میں ملبوس تھے۔ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کا زیور الگ انہیں آراستہ کیے ہوئے تھا۔

ان کا سفر پاپیادہ تھا۔ جیل انتظامیہ کی جانب سے البتہ دو گاڑیاں بھی ساتھ تھیں۔ کسی بھی قیدی کے بہت زیادہ تھک جانے کی صورت میں اسے گاڑی پر سوار کرلیا جاتا جبکہ دیگر قیدی خالی نظروں سے ان گاڑیوں کو دیکھتے خلخال چھن چھناتے چلتے جاتے تھے۔ ان کی نگاہیں کھلے آسمان اور آزاد فضاؤں کو بھی حسرت سے دیکھنے لگتیں۔ یہ کھلا آسمان اور فضائیں سوا برس بعد دوبارہ دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔

اس سفر میں انہیں بس اتنی ہی رعایت نصیب ہوئی تھی کہ راستے میں جو دل چاہتا اپنی مقدور بھر نقدی کے مطابق خرید کر کھا لیتے۔ لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر سے

ہوتے ہوئے وہ سب سہ پہر تین بجے کے قریب 'سینٹرل جیل لاہور' پہنچ گئے۔ جلد ہی ان کی ملاقات سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر گرے سے ہوئی۔ اس نے سب قیدیوں کا خشمگیں نگاہوں سے بغور معائنہ کرتے ہوئے غصے سے چلا کر کہا۔ "ان سبھی لوگوں کے پاؤں میں ایک ایک آڑا ڈنڈا ڈال دو۔"

ڈاکٹر گرے کے حکم کی فوری تعمیل کردی گئی۔ ایک لوہار نے ان سبھی کے دونوں پاؤں کے کڑوں کے درمیان تقریباً ایک فٹ طویل آڑا ڈنڈا ڈال دیا۔ اس لمحہ جعفر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ غالباً لاہور جیل کی کوئی رسم ہوگی تاہم بعد ازاں اسے علم ہوا کہ یہ حکم صرف انہی کے لیے لاگو ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا تو ایک طرف رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال ہوگیا۔

لاہور جیل ان کے لیے کٹھنائیوں کا ایک نیا دور ثابت ہوئی تھی۔ اس جیل کے درمیان ایک برج اور اس کے چاروں اطراف میں آٹھ علیحدہ بارکیں تھیں۔ ان بارکوں میں صحن اور مشقت کے لیے کارخانے بھی بنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر گرے کے نئے حکم کے مطابق اس مقدمہ کے سب قیدیوں کو علیحدہ بارکون اور نمبروں میں منتقل کردیا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے بالکل کوئی ملاقات نہ کرسکیں۔

جعفر اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ امر آہنی ڈنڈے سے بھی سخت تر ثابت ہوا تاہم یہاں بھی انہیں قدرت کی جانب سے ہی مدد میسر آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نیا حکم صادر کردیا گیا جس کی رو سے انبالہ جیل سے آنے والے قیدیوں کو وبائی بخار اور سرسام کے ممکنہ جراثیموں کے خدشے کے تحت دیگر قیدیوں سے علیحدہ رکھا جانا تھا۔ مبادا یہ جراثیم اس جیل میں بھی کسی ہنگامی صورتِ حال کا باعث نہ بن جائیں۔

جعفر کو ساتھیوں سمیت ایک بار پھر اسی بارک میں منتقل کردیا گیا۔ اس کٹھن وقت میں یوں دوبارہ یکجائی کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ قدرت ان کے لیے ہر موڑ پر آسانیاں پیدا فرما رہی ہے۔

لاہور جیل میں آٹھ ماہ بسر کرنے کے بعد انہیں ملتان روانہ کردیا گیا۔ جعفر کے مقدمہ سے صرف اسے 'مولوی یحییٰ' اور میاں عبدالغفار کو ملتان بھیجا جانا تھا۔ سرکاری اہلکاروں کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قیدیوں کے پاؤں میں بیڑی، سر پر ایک ہاتھ سے بستر تھما کر دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی کھونٹ پہنا دی گئی۔ اسٹیشن پہنچنے سے قبل راہ بھر انہیں مار پیٹ کا نشانہ بنایا جاتا رہا تاکہ وہ کسی بھی لمحہ سست روی کا شکار نہ ہو سکیں۔ اس کے بعد انہیں ریل کی کوٹھریوں میں جانوروں کی مانند مقفل کردیا گیا اور لاہور سے ملتان کے اس سفر میں کسی بھی مقام پر کھولنے کی زحمت ہی نہ کی گئی۔

ملتان میں دو روزہ قیام کے بعد کراچی روانگی کے سفر کا آغاز ہوگیا۔ اس سفر کے دوران ان کے آہنی زیور میں تقریباً آدھا من مزید اضافہ کردیا گیا۔ بیڑیوں کے درمیان ایک بڑی موٹی زنجیر پھنسا دی گئی جس کے باعث وہ اپنی جگہوں پر بیٹھ کر ہی رفع حاجت کرنے پر مجبور تھے۔ آبی سفر کے باوجود انہیں وضو کی اجازت نہ تھی۔ وہ تیمم کرکے اشاروں سے ہی نماز پڑھا کرتے۔ ان کٹھنائیوں کے باوجود دل نے یہ خوش کن پہلو سوچ کر خود کو بہلا رکھا تھا کہ وہ آزاد فضا میں دریا کی روانی اور قریبی جنگلوں کا سبزہ دیکھ رہے ہیں۔

کراچی جیل پہنچنے کے بعد انہیں ہتھکڑی اور آہنی ڈنڈے سے آزاد کرکے محض آہنی بیڑی ہی پہنائے رکھی گئی۔ کراچی جیل خانہ اب تک کی تمام جیلوں سے بہتر بلکہ عمدہ مہمان سرا تھا۔ رات کے اوقات میں قیدیوں کو بارک یا کوٹھریوں میں ٹھونس دینے کی بجائے قدرے کھلے مقامات پر چٹائی کے فرش بچھا دیے جاتے۔ قیدی اپنی خواہش سے مطلوبہ مقامات پر گھوم پھر اور سو سکتے تھے۔ کھانے کا معیار بھی دیگر جیلوں کی نسبت بہتر تھا۔ گھی سے چپڑی ہوئی گیہوں کی روٹیاں، عمدہ ترکاری اور گوشت صبح و شام میسر آجاتے۔ ان سہولیات کے باوجود ایک کٹھنائی سب پر حاوی تھی۔ رفع حاجت کے لیے چوبی پیپے میدان میں رکھوا دیے گئے تھے۔ قیدی ان پیپوں پر بدقت چڑھ کر سب کے سامنے ہی اپنی حاجت دور کرپاتے تھے۔

کراچی میں قیام ایک ہفتہ پر ہی محیط رہا۔ اس کے بعد انہیں ایک بادبانی جہاز 'بنگلہ' میں سوار کردیا گیا۔ اس سمندری سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے وہ بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی جیل کی دید ان کے لیے کافی دلچسپ ثابت ہوئی۔ جیل کی عمارت درحقیقت مرہٹوں کے دور کا ایک مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا۔ اس کے چاروں اطراف ایک بڑی گہری خندق بنی ہوئی تھی۔ رات کے کھانے میں جوار کی دو روٹیاں اور تھوہر کی دال فراہم کی گئی۔ فجر کے بعد ان سب کو پتھر توڑنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔

اس نے کام کو سنبھالے ابھی دو ہی روز ہوئے تھے کہ وہاں 'دری پانی' کا آغاز ہوگیا۔ جعفر کے چالان کے سبھی دیگر پنجابی قیدی اس کام کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس نئی معروفیت میں انگا ایک مہینا بڑے پُرسکون انداز میں بیت گیا۔ اس کے بعد انہیں دسمبر کے ابتدائی عشرے میں 'جمنا' نامی جہاز پر بمبئی سے کالے پانی روانہ کر دیا گیا۔ چونتیس روز کے ایک طویل سفر کے بعد وہ گیارہ جنوری 1866ء کو دوپہر کے وقت 'پورٹ بلیر انڈمان' پہنچ گئے۔

انڈمان۔ خوف، دہشت اور سزائے موت سے بھی بدتر تاثر کا دوسرا نام۔ کیونکہ اس جزیرے سے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا اور قید خانے میں ہر ظلم روا تھا۔ بیرونی دنیا سے کوئی رابطے کا ذریعہ بھی نہ تھا۔

☆☆☆

سمندری سفر کا اختتام ہونے سے قبل ہی انہیں قدرے دور سے سمندر کے کنارے چہرے دکھائی دینے شروع ہوگئے۔ ان کی ہیئت کچھ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے پانی میں بھینسوں کے ڈھیروں جھنڈ پھر رہے ہوں۔ لنگر ڈالنے کے کچھ ہی لمحوں بعد چند بڑی کشتیاں کنارے سے آگئیں اور انہیں سوار کیے انڈمان کے صدر مقام 'روس' کو ٹاپو پر لے گئیں۔ کنارے پر بیسیوں سفید لباس فاخرہ میں ملبوس افراد دکھائی دیے۔

کشتی کے کنارے پر پہنچنے سے قبل ہی ایک آدمی نے بآواز بلند دریافت کیا۔

"کیا محمد جعفر اور مولوی یحییٰ بھی اس جہاز میں آئے ہیں؟"

یہ سوال سن کر جعفر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہم دونوں آئے ہیں۔"

یہ جواب سنتے ہی وہ لوگ پانی میں کودے اور انہیں نہایت محبت و احترام سے نیچے اتار لیا۔ مجمع کے دیگر افراد ان کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرنے لگے۔ جعفر کو اپنے چالان کے قیدیوں سے الگ کر کے منشی غلام نبی (محرر شعبہ میرین) کے مکان پر پہنچا دیا گیا جہاں اس کی ملاقات مولوی احمد اللہ اور چند دوسرے معززین سے بھی ہوئی۔ تینوں افراد کو اب اسی مکان میں رہنا تھا۔

جعفر کی بیڑیاں کٹوا کر اسے پہلے ہی سے تیار شدہ لباس تھما دیا گیا۔ اس نے تمام جلسے کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس لمحہ وہ جزائر انڈمان نامی جیل میں آزاد قیدی تھا۔ اس شام اسے بہت سے افراد نے اپنی اپنی رہائش گاہوں پر طعام کی دعوت بھی دی جنہیں جعفر خوش دلی سے قبول کرتا رہا۔

اگلے روز سے جزیرہ کی سیر اور تجربہ کا آغاز بھی ہوگیا وہاں ہزار ہا قیدی مرد و خواتین موجود تھے۔ ان سب میں مشترک پہلو یہ بھی تھا کہ پیشانی پر نام کھود کر جرم کے ساتھ لفظ 'دائم الحبس' بھی کندہ کیا گیا تھا۔

"کہیں ہماری پیشانی پر بھی تو یہ سب نہیں کھودا جائے گا؟" جعفر کے دل میں ایک لمحہ کے لیے خدشہ بیدار ہوا اور اس نے اپنے ساتھی احمد اللہ سے دریافت کیا۔

"نہیں! بے فکر رہیے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے سرکار نے یہ حکم معطل کر دیا ہے۔"

احمد اللہ کے اس جواب نے جعفر کو قدرے پُرسکون کر دیا اور وہ اطمینان سے جزیرے کے کل وقوع و خواص کا جائزہ لینے لگے۔ جزائر انڈمان خلیج بنگال کے مشرق میں 92 درجہ 470 دقیقہ طول شرقی اور 11 درجہ 43 دقیقہ عرض شمالی پر کلکتہ سے تقریباً چھ سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ انڈمان کے نام سے مشہور یہ مقام درحقیقت مجموعہ جزائر اور تقریباً 1746 میل کے گھیرے میں واقع تھا۔ انڈمان کے جزائر کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار تھی۔ جزائر کا جغرافیہ پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ ہموار زمین بہت ہی کم تھی۔ یہاں بلند ترین پہاڑ 'موئٹ ہریٹ' تھا جو سطح سمندر سے ایک سو سولہ فٹ اونچا تھا۔ میٹھے پانی کا کوئی بھی ندی نالہ نہ تھا۔ برسات کے موسم میں بعض اونچے ٹیکروں اور ٹیلوں سے پانی کے جھرنے بہا کرتے تھے تاہم خشک ایام میں وہ بھی بند ہو جاتے۔

جزائر میں پورٹ بلیر کے اندر گندھک کا بھی ایک پہاڑ تھا جہاں سے ہمہ وقت آتشیں شعلے برآمد ہوا کرتے۔ آم، املی، جامن، کٹھل، بیدھل، جائفل، ناریل اور پان وغیرہ کے درخت خودرو تھے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی ترکاری اور گرم آب و ہوا والے ممالک کے پھل، دھان، مکئی، جوار، مونگ، ماش، اوکھ وغیرہ خوب پیدا ہوتے۔ گیہوں، چنا، رتیع اور سرد آب و ہوا والے ممالک کا اناج بالکل پیدا نہیں ہوتا تھا۔

انڈمان کی آب و ہوا لاثانی تھی۔ جعفر نے اپنے قیام کے دوران اس آب و ہوا کو ہمیشہ عمدہ اور صحت بخش ہی پایا۔ ہیضہ، چیچک، وبائی بخاروں اور آشوب چشم جیسے متعدی امراض کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ خط استوا کے قریب ہونے کے سبب بارشیں ہمیشہ جاری رہتیں۔ دن اور رات کی طوالت یکساں تھی۔ موسم کا یہ عالم تھا کہ دسمبر، جنوری کے مہینوں میں بھی رات کو صرف ایک چادر اوڑھنے کی نوبت ہی آتی۔ سرمائی کپڑے بنوانے کا بالکل کوئی دستور نہ تھا۔ رضائی، دلائی، روئی اور دھنیا کا تصور بھی محال تھا۔ خزاں اور بہار یہاں طلوع ہی نہ ہوتے۔ درخت سال بھر ہرے بھرے ہی رہتے تھے۔ ان درختوں کی اونچائی فلک بوس تھی۔ کسی بھی درخت کو کاٹنے کی صورت میں اس کی ڈالیاں اور شاخیں دور دور تک پھیل جاتیں۔

ایک اور عجیب تر بات یہ تھی کہ سانپ اور بچھوؤں میں زہر نام کی کوئی شے ہی نہ تھی۔ ہاں البتہ کن کھجورے بہت زہریلے تھے۔ جعفر کے لیے یہاں کے قدیم باشندوں کی دید بہت دلچسپ تھی۔ یہ باشندے جنگل میں مقیم اور قدرے وحشی تھے۔ مرد و خواتین برہنہ ہی پھرا کرتے۔ انہیں کپڑا میسر ہی نہیں تھا۔ ابتدائی باغیانہ سرگرمیوں کے بعد یہ باشندے اب سرکار کی حکمت عملی کے تابع ہو چکے تھے۔ جنگل یا بستی میں جہاں کہیں ملتے نہایت خاطرداری سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی مزاحمت اور خونی سرگرمیوں کے بعد یہ روش بالکل ترک کر دی تھی۔ مگر دیگر جزائر میں آباد قدیم باشندے غیر مقامی کو قبول کرنے پر کسی طور تیار نہ ہوئے۔ (آج 2022ء میں بھی وہ غیر مقامی کو قبول نہیں کرتے۔ اب بھی کپڑوں سے نفرت کرتے ہیں اگر کوئی بھولا بھٹکا چلا جائے تو اسے فوراً قتل کر دیتے ہیں۔ انڈین گورنمنٹ نے انڈمان سے آگے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔)

جعفر انڈمان میں گھومنے پھرنے کے دوران قیدیوں کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیتا رہا۔ اسے وہاں رسالہ دار، صوبہ اور جمعدار قید دکھائی دیے۔ اس کے علاوہ وہاں ہندوستان کی وہ اعلیٰ اشرافیہ بھی تھی جن کے آگے پیچھے ہزار ہا نوکر پھرا کرتے تھے لیکن اب وہ چوہڑے چماروں کی طرح جھوٹا کھانا کھاتے اور عام لوگوں کے ساتھ مشقت کیا کرتے تھے۔ ان شرفاء اور امراء کو ایسی عبرت ناک حالت میں دیکھ کر جعفر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھیوں کے دل بھی گداز ہو جاتے تھے۔

ابتدائی کچھ روز اس سیاحت اور تجزیے میں بسر

انڈمان کے اصل باشندوں کے چند خواص

☆ انڈمان کے ان رہائشیوں کا ماننا تھا کہ ایک بار زمین میں ایسا طوفان آیا تھا کہ ساری دنیا ڈوب گئی تھی۔ اس وقت ان جنگلیوں کے کوئی بزرگ ایک کشتی بنا کر اس میں سوار ہو گئے۔ وہ ایام طوفان میں بہت دنوں تک اس کشتی میں سوار رہے۔ جب طوفان رفع ہوا تو وہ کشتی جزائر انڈمان کے کسی پہاڑ پر آٹھہری تھی۔

☆☆☆

☆ انڈمان کے باشندوں کا گھر بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ ساخت کچھ اس طرح ہوتی کہ صرف چار کھمبے کھڑے کر کے اس کے اوپر تھوڑی سی درختوں کی چھال ڈال کر عارضی سہارا بنا لیا جاتا۔ ان کی جائیداد و ملکیت میں تیر کمان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

☆ ایک ٹاپو سے دوسرے ٹاپو تک جانے کے لیے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں بنایا کرتے تھے۔ اپنے مردوں کی کھوپڑیاں بھی ہمہ وقت ساتھ لیے پھرا کرتے۔

☆ ان کی مہمان نوازی کا عالم بھی نرالا ہی تھا۔ جب کوئی مہمان دوسرے ٹاپو سے ان کے یہاں آتا تو پہلے ان کی رہائش گاہ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا کرتا۔ میزبان اسے وہیں کھانا پہنچا دیتے۔ بعد از طعام وہ اپنے مطلوبہ گھر میں جاتا اور پھر سب اس سے مل کر رونے لگتے۔

☆ انڈمان کے ان قدیم رہائشیوں میں کسی طبیب سے علاج معالجہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کسی کے بیمار ہونے کی صورت میں اس کا کوئی عزیز نہایت بے دردی اور اناڑی پن سے خود ہی علاج کر لیتا۔ علاج کا طریقہ یہ تھا کہ بوتل کے ٹکڑوں سے زخم لگا کر خون نکالا جاتا۔ مریض کی موت کی صورت میں اس کی لاش ایک ٹوکری میں اس طرح رکھی جاتی کہ گھٹنوں کو مروڑ کر چھاتی تک لا کر باندھ دیا جاتا۔ اس کے بعد سارے اعضاء درخت کے چھلکوں سے کس کر قبر کھودی جاتی اور لاش کو گاڑ دیا جاتا۔ قبر کے نزدیک اگلے ایک سے دو ماہ تک آگ جلتی رہتی تھی۔ بعد ازاں قبر کھود کر ماتم کرتے ہوئے اس کی ہڈیاں سب عزیز و اقارب آپس میں تقسیم کر لیتے۔ یہ ہڈیاں وہ اپنے ساتھ بھی لیے پھرا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بسا اوقات لاش کو گاڑنے کی بجائے مچان پر رکھا جاتا یا کسی درخت کی شاخ پر لٹکا دیا جاتا۔

کرنے کے بعد جعفر کے دل ودماغ میں ایک ہی خیال گردش کرنے لگا کہ وہ اپنی قید کا عرصہ کس حیثیت سے بسر کرے گا؟ اس الجھن کا جواب بھی قدرت کی جانب سے اسے بہت جلد مل گیا۔ ایک ہفتہ بعد جزیرہ سراوک کے راجا بروکس کی فرمائش پر جنگ آزادی کے پچاس قیدی سنگاپور کے مشرق میں واقع کسی ملائی ملک میں بھیج دیے گئے۔ ان قیدیوں میں اکثریت منشیوں اور جمعداروں کی تھی۔ ان کی روانگی کے بعد منشیوں کے عمدہ ترین عہدے اب خالی تھے۔ اس موقع پر انتظامیہ اخبارات اور مولوی احمد اللہ کے توسط جعفر کی اہلیت کے متعلق ملنے والی معلومات پر سنجیدگی سے تبادلہ خیال کرنے لگے۔ جلد ہی اسے نائب میر منشی مقرر کر کے رہائش کے لیے گھر اور بلا تنخواہ ایک نوکر فراہم کردیا گیا۔ اس کے علاوہ اسے انڈمان میں آزادانہ نقل وحرکت کی بھی اجازت تھی۔

روزگار میں معروف ہوتے ہی جعفر اپنی زندگی کے سونے پن سے ناجز آنے لگا۔ اس وقت جعفر کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی اور ایک بھرپور ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد تجرد کی زندگی بسر کرنا مشکل ہی نہیں بے حد محال بھی تھا۔ چند ماہ تو اسی کیفیت اور کشمکش میں بیت گئے۔ اہلیہ اور بچوں کو انڈمان بلوانے کی درخواست جب قانونی طور پر مسترد کردی گئی تو اس نے وہیں مقیم ایک کشمیری خاتون سے عقد کرلیا۔ یہ خاتون کسی بلائے ناگہانی میں پھنس کر یہاں قید ہوئی تھی۔

کچھ عرصہ مزید گزرا تو مولوی عبدالرحیم کو بھی انڈمان بھیج کر پہلے منشی اور پھر اسپتال کا محرر بنادیا گیا۔ زندگی قید میں ہی سہی تاہم متوازن انداز میں بیت رہی تھی۔

☆☆☆

جعفر کی یہ پُرسکون ازدواجی اور پیشہ وارانہ زندگی کچھ عرصہ تو یونہی جاری رہی۔ اس کے بعد یک لخت تلاطم خیز سانحات کا شکار ہونے لگی۔ دوبار تو کشتی میں سواری کے دوران طوفان نے گھیرلیا۔ طوفان کی شدت ایسی بلا خیز تھی کہ مسافروں کے بمشکل کودتے ہی کشتی ہی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ موت کو اس قدر قریب دیکھ کر جعفر کے قلب و روح تھرا کر رہ گئے تھے۔

تیسری بار صورتِ حال مزید ابتر ثابت ہوئی۔ کچہری کا سارا عملہ ایک کشتی پر سوار ایبرڈین کی جانب گامزن تھا۔ مسافت ابھی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک سخت طوفان نے انہیں گھیرلیا۔ طوفان کی شدت اور خونخواری دیکھ کر مسافروں کو اپنی موت یقینی دکھائی دینے لگی۔ بارش اور ہوا بھی مکمل زوروں پر تھی۔ ساحل بہت پیچھے رہ چکا تھا۔ قرب وجوار سے کسی مدد کا امکان کا تصور بھی حماقت تھی۔ دوپہر کے وقت میں شدید تاریکی کا سماں تھا۔ اسی وقت کشتی کا سکان بھی ٹوٹ گیا اور سوراخ سے پانی بڑی سرعت سے کشتی میں داخل ہونے لگا۔ جعفر نے گڑگڑا کر سب کی زندگی وسلامتی کی دعا کی۔ وہ لمحہ شاید قبولیت کا ہی تھا۔ کچھ ہی پل گذرے تھے کہ انہیں اپنے آس پاس کسی کشتی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ کشتی درحقیقت سپرنٹنڈنٹ سردار بھسل سنگھ کی تھی۔ اس نے کچہری کے عملے کو دگرگوں حالت میں دیکھ کر کسی نہ کسی طور اپنی کشتی میں سوار کیا اور بخیر وعافیت ساحل پر پہنچادیا۔

ان سانحات کے کچھ عرصہ بعد جنوری 1868ء میں جعفر کا تبادلہ بحیثیت اسٹیشن محرر جزیرہ ہدوکو میں کردیا گیا۔ اپنی نئی پیشہ وارانہ معروفیات میں اسے علم ہی نہ ہوسکا کہ یحییٰ علی صاحب فراش ہے۔ بیس فروری 1868ء کو اس دیرینہ ساتھی کے انتقال کی خبر اعصاب پر بجلی بن کر گری۔ وہ کسی نہ کسی طور تجہیز وتکفین میں شریک ہوکر بوجھل دل لیے واپس چلا آیا۔ تقدیر اس کے عقب میں اپنا ترکش سنبھالتی گامزن تھی۔ یحییٰ علی کی وفات کو تقریباً دو ماہ ہی گذرے تھے کہ جعفر کی اہلیہ نے بھی عدم کی راہ لی۔ اسے یحییٰ علی کی وفات کا بے پناہ صدمہ تھا۔ بطور مرید یہ محبت وعقیدت دل کا ناسور بن کر اس کے لیے دائمی آزادی کا سبب بن گئی۔

اہلیہ کی وفات کے بعد جعفر نے زیورات فروخت کر کے تین سو روپے دہلی میں اپنی پہلی زوجہ کے پاس بھیج دیے تاکہ وہ اس رقم سے جوتے وغیرہ جیسا مال خرید کے اسے روانہ کردے۔ جعفر نے یہ مال ایک سوداگر کے نام سے منگوایا تھا تاہم تجارت کی یہ کوشش اس پر عائد سرکاری پابندیوں اور پھر مخبری کے باعث بری طرح ناکام ہوگئی۔

اس ناکامی کے بعد جعفر نے تجارت کی کوئی کوشش نہ کی۔ ان دنوں یوں بھی وہ ایک بار پھر سابقہ کشمکش اور اذیت میں مبتلا ہوچکا تھا۔ اہلیہ کے انتقال کو دو برس بیت چکے تھے۔ جعفر کی رہائش بحیثیت افسر ہدوناپو میں تھی۔ قدرت کی کرنی ایسی تھی کہ اس ناپو کی آبادی زیادہ تر خواتین پر مشتمل تھی۔ ان خواتین میں اکثریت نے جعفر کو کئی بار اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش بھی کی۔ کئی ایک تو اس کے عہدہ کے سبب گھر چلی آتیں اور اصل کام ترک کرکے اسے رجھانے کی

کوشش کرنے لگتیں۔

جعفر اس نئی آزمائش سے خوفزدہ ہونے لگا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی اہلیہ کو پانی پت سے انڈمان بلوانے کی درخواست دائر کی لیکن اس بار بھی ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ احباب اس کی الجھن سے آگاہ تھے۔ وہ اسے کسی بھلی خاتون سے عقد کی صلاح دینے لگے۔ ان دنوں جعفر کا ایک ہی معمول تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد سربسجود ہوکر دعا مانگتا۔

''الٰہی! میں تیرا عاجز اور گناہ گار بندہ ہوں۔ خطاؤں سے لبریز ہوں۔ مجھے ایسی کسی آزمائش میں مبتلا نہ کرنا جس کا بار اٹھانے کی تاب مجھ میں نہ ہو۔ میری مدد فرمانا معبود! میرے حق میں وہی فرمانا جو بہتر ہے۔ غیب سے میری مدد فرمانا اور کسی نیک بخت سے میرا نکاح کروانا۔''

جعفر کی یہ تلاش حیران کن طور پر ایک ہندو برہمن عورت پر منتج ہوئی۔ یہ خاتون ضلع الموڑہ کی رہائشی اور کچھ ہی عرصہ پہلے قید کے بعد بھیجی گئی تھی۔ جعفر نے اسے خاصہ خوش چلن اور شرم وحیاء سے لیس ہی پایا تھا۔ قباحت صرف یہ تھی کہ وہ مذہبی طور پر نہایت متعصب تھی۔ کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑے ہونا یا ان کا اپنے کپڑوں سے چھونا تک اسے گوارا نہ تھا۔ بارک کی مسلمان خواتین اس کے تعصب سے سخت نالاں تھیں۔

جعفر پہلے پہل تو اس کے اطوار دیکھتا رہا۔ اس کے بعد باہمی گفتگو کا فیصلہ کرلیا۔

''کس جرم میں بھیجا گیا ہے تمہیں یہاں؟'' اس نے دانستہ طور پر بے تکلف تذکرہ دریافت کیا۔

''بھاگ کی خرابی اور ماتا پتا کی بات نہ ماننے کے جرم میں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیا بات نہیں مانی تھی تم نے اپنے والدین کی؟'' جعفر چونکا۔

''میں الموڑ میں ڈھیٹے کنویں پر ایک لڑکی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ کنویں میں گر کر سخت زخمی ہوگئی۔ حادثے میں میرا کوئی دوش نہیں تھا۔ اصل سمسیا صرف یہ تھی ہم دونوں کے پریواروں میں سخت دشمنی تھی۔ اس لڑکی کے ماتا پتا نے اقدام قتل کا مقدمہ درج کروادیا۔ لڑکی کے زخم بھر گئے تھے لیکن مجھے پھر بھی یہاں بھیج دیا گیا۔ میں آج بھی وہ وقت یاد کرکے پچھتاتی ہوں کہ میرے ماتا پتا اس سے ملنے جلنے سے منع کرتے تھے۔ میں نے ان کی بات کیوں نہ مانی؟'' وہ آزردگی سے بولی۔

جعفر اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ ایک معمولی لڑکی کا اقدام قتل کوئی ایسا بڑا جرم نہ تھا جس کی پاداش میں اسے انڈمان بھیج دیا جاتا لیکن قسمت کے کھیل اور قلابازیاں بھلا کوئی سمجھ بھی پایا ہے۔ اس کے بھیدوں کی حقیقت تو بعد ازاں ظاہر ہوا کرتی ہے۔

''مسلمانوں سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہو؟ کیا بگاڑا ہے انہوں نے تمہارا؟'' جعفر نے نرمی سے دریافت کیا۔

''خوف کی وجہ سے۔'' وہ تذبذب سے بولی اور قدرے توقف سے دوبارہ گویا ہوئی۔

''میں برہمنوں کے گھر میں ایسے پہاڑی علاقہ میں پیدا ہوئی تھی جہاں آج تک کوئی مسلمان آباد نہیں ہوا۔ برہمن زادی ہونے کے باوجود میں بتوں کی پوجا میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟ دل ہی نہیں مانتا تھا کہ ایسے بتوں کے آگے جھکوں جنہیں انسانی ہاتھوں نے ہی بنایا ہے۔ مجھے تو یہ بات بھی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ پرماتما کو رہنے کے لیے پتھر کی یہ مورتیاں ہی کیوں ملتی ہیں؟ کچھ سے بعد کسی جوتشی برہمن نے میرے ماتا پتا سے کہا کہ یہ لڑکی بہت جلد تم سے جدا ہوجائے گی۔ اسے مسلمانوں سے دور رکھنا ورنہ یہ اپنا دھرم بدل لے گی پھر جب میں ہندوستان میں گرفتار ہوئی تو پہلی ہی رات سپنے میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ ان کے چہرے کی چمک ہی انوکھی تھی۔ انہوں نے خواب میں مجھے ٹھوکر ماری اور کہنے لگے۔ 'اٹھ! نماز پڑھ!' اس کے بعد کہنے لگے۔ 'تیرے واسطے قید ہونا بہت اچھا ثابت ہوگا۔ تو بھی دعا کر تیرا نصیب تجھے جلد مل جائے۔'

میں نے ایسی چمک اور رعب پہلے کبھی کسی چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔ دعا اور نماز بھی میرے لیے نئے شبدھ تھے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت باہر پہرہ دینے والے ایک سپاہی نے میری حالت دیکھی تو حیرانی سے پوچھنے لگا:

'کیا ہوا ہے؟'

میں نے اسے اپنا سارا سپنا سنادیا۔ وہ کہنے لگا۔ 'تو قید ہونے کے بعد ضرور مسلمان ہوجائے گی۔'

اب مجھے تو بچپن سے ہی مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا۔ اس سپنے کے بعد یہ نفرت اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔

جعفر یہ سب کچھ سن کر لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر مزید نرمی سے کہنے لگا۔

''میں تجھے مسلمان ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تو

مسلمان ہو جائے تو تیرے لیے دنیا اور آخرت میں بھلا ہو گا۔ دوزخ کی آگ سے بھی محفوظ رہے گی۔''

جعفر کی اس پیشکش پر وہ حیران ہوئی۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ اس کے دل کے کواڑوں پر زوردار دستک ہوئی اور وہ بے اختیار اپنا سر اثبات میں ہلانے لگی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ انہی دنوں رمضان کی آمد بھی ہو گئی۔ جعفر نے ستائیسویں شب کو اپنے احباب کی شاندار ضیافت کا اہتمام کیا اور اسے کلمہ پڑھا کر دائرہ اسلام میں داخل کر دیا۔

اس کے بعد وہ ارکان اسلام اور نماز سیکھنے کی طرف راغب ہوئی۔ جعفر نے حاکم وقت کو مطلع کر کے پندرہ اپریل 1870ء کو نکاح کر لیا۔

☆☆☆

غداری جیسے مقدمہ میں گرفتاری کے بعد جعفر کی انڈمان آمد، منشی کے عہدے پر تقرری، پیشہ ورانہ کامیابیاں اور ایک ہندو عورت کو مسلمان کرنے کے بعد پُرسکون ازدواجی زندگی گذارنا ایسے عوامل ہرگز نہیں تھے جنہیں انڈمان کے غیر مسلم قیدی آسانی سے برداشت کر لیتے۔ ان کے بغض اور عناد میں ہر گذرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا اور پھر بالآخر انہیں جعفر کو زک پہنچانے کا ایک موقع مل گیا۔

1879ء کے ماہ اپریل میں عیدالاضحی کے تہوار کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ جعفر نے ایک بیل کی خریداری کی۔ قربانی کے وقت چند ہندو بلوائی یکایک کہیں سے نمودار ہوئے اور وہ بیل چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ جعفر اور اس کے ساتھ وہاں موجود افراد نے حملہ کا کامیابی سے دفاع کیا اور بلوائیوں کے سامنے ہی بیل ذبح کر دیا۔ بیل کا لہو بہتے دیکھ کر بلوائی مزید آپے سے باہر ہو گئے۔ اگلے چند ہی لمحوں میں صورت حال اس قدر بگڑی کہ خونریزی کا احتمال ہونے لگا۔ عین ممکن تھا کہ وہاں درجنوں لاشیں بچھ جاتیں لیکن پولیس کی آمد سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس ناکام حملے کے بعد بھی مقامی ہندوؤں نے اپنی انتقامی روش ترک نہ کی۔ ذبیحہ کی پاداش میں جعفر پر پہلے مالی بدعنوانی اور پھر فوری طور پر چوری کا الزام عائد کر کے مقدمے بھی دائر کروا دیے لیکن قدرت کو اس کی رسوائی منظور نہ تھی اس لیے وہ ان مقدمات سے مکھن میں بال کی طرح بری ہو گیا۔ اس کے بعد جعفر ہندوؤں سے مزید محتاط رہنے لگا۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو جعفر کو جزیرہ بُدو سے صدر مقام روس کو منتقل کر دیا گیا۔ اسی دوران جعفر کے ایک دیرینہ شناسا مولوی محمد حسین کو بھی انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور تغیر یہ بھی رونما ہوا کہ اکتوبر 1871ء میں جنرل اسٹوارٹ کی بحیثیت چیف کمشنر انڈمان آمد ہوئی۔ اس کے ایماء پر لارڈ میو نے پورٹ بلیر میں قیدیوں کے لیے بھنڈارہ کا کھانا مقرر کر دیا۔ لارڈ میو نے ایک اور قانون یہ بھی جاری کروایا جس کی رو سے پورٹ بلیر کی قید ہندوستانی اور ولایتی جیل خانوں سے بھی زیادہ سخت ہو گئی۔

اس تمام تر دورانیے میں سازشوں نے جعفر کا تعاقب ترک نہیں کیا تھا۔ آٹھ فروری 1872ء کو گورنر جنرل لارڈ میو کی انڈمان آمد کے بعد اسے کسی خنجر بردار نے قتل کر دیا۔ قاتل ایک ادنیٰ قیدی تھا جس نے صدہا پہریداروں کی موجودگی میں بھی اسے قتل کرنے کی راہ نکال ہی لی تھی۔ چند ہندو عہدیداران نے اس قتل کی سازش میں جعفر کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں کئی جھوٹے گواہ بھی بنا لیے گئے تاہم قدرت کی کرنی ایسی ہوئی کہ جنرل اسٹوارٹ ذاتی طور پر جعفر کی اہلیت اور کردار کا معترف ہو چکا تھا۔ اس نے ناجائز کارروائی اور جھوٹی شہادت کا یہ کھیل کامیاب نہ ہونے دیا اور اس طرح اصل مجرم ہی کیفر کردار تک پہنچا۔

☆☆☆

لارڈ میو کے الزام قتل سے بریت کے بعد جعفر کے دماغ میں ایک نیا خیال کلبلانے لگا۔ وہ اپنی انگریزی سے ناواقفیت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ 1872ء میں 'سروپ' نامی ایک انگریزی خواں نے اس کے خیال کو مزید تحریک دی اور جعفر نے انگریزی سیکھنے پر کمر کس لی۔ اگلے ایک برس میں سروپ ہی کی زیر نگرانی اسے انگریزی بول چال کے علاوہ لکھنے پڑھنے میں بھی خاصی دسترس حاصل ہو گئی۔

دھیرے دھیرے اس نے انگریز عہدیداران کو اپنی فرصت کے اوقات میں فارسی اور اردو سکھانی شروع کر دی۔ ان کے ساتھ شب و روز بات چیت کرنے اور اسباق کو انگریزی قالب میں ڈھالنے کی بھی خاصی مشق ہو گئی۔ ان تراجم کے نتیجہ میں اس کی انگریزی استعداد میں خاصہ اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد جعفر نے عرائض بھی انگریزی زبان میں لکھنا شروع کر دیں۔ اس معلمی اور عرائض نویسی کے عوض اسے ایک سو روپیا ماہوار حاصل ہوتا۔ اس استعداد کا ایک فائدہ بہرحال یہ بھی ہوا کہ وہاں جعفر کے واحد مسلمان انگریزی خواں ہونے کے باعث کئی مسلمانوں کو اہم

مقدمات میں بہت مدد ملی۔ جعفر نے انہیں پھانسی جیسے کٹھن ترین حالات سے بھی سرخرو کروا دیا۔ اس کے بعد وہ کئی بڑے کتب خانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کتب خانوں میں آمد و رفت اور مطالعہ سے اسے اندازہ ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسی زبان نہ تھی جس کی صرف و نحو انگریزی قالب میں نہ ڈھالی گئی ہو۔ انگریزی زبان درحقیقت علم و فنون کا گھر تھی۔ جعفر کو ان کتب کے مطالعہ کی بے طرح لت لگ گئی۔

کتب بینی کا یہ شوق جعفر کی زندگی کا بھیانک ترین دور ثابت ہوا۔ مغربی علوم کی لت نے اس پر ناقابل یقین اثرات مرتب کیے۔ وہ دنیاوی معلومات کے سحر میں اس قدر غرق ہوا کہ بچپن کی عادت 'نماز تہجد' یک دم چھوٹ گئی۔ وہ شب بھر بیدار رہ کر مطالعہ ضرور کرتا تھا۔ اذان فجر تک چارپائی پر بیٹھا بھی رہتا لیکن اٹھ کر وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی کوئی تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ نماز جمعہ کی باجماعت ادائیگی میں بھی تعطل آنے لگا۔ قرآن و احادیث پڑھنے کی رغبت بھی زائل ہونے لگی۔ دل میں ہمہ وقت انگریزی کتب پڑھنے کا سودا سمایا رہتا تھا۔ رمضان میں بھی معمولات ماضی کی نسبت حیران کن ہی رہے۔ وہ تلاوت قرآن کے لیے کلام پاک کھول کر بھی بیٹھتا لیکن زبان پر گویا قفل ہو جاتا۔ اس سے بھی بدتر حالت یہ تھی کہ ماضی میں دعا کے لیے گھنٹوں اٹھے رہنے والے ہاتھ عجیب بوجھل کیفیت کا شکار ہو جاتے۔ متواتر ذکر الٰہی کرتی رہنے والی زبان سے چار کلموں کی ادائیگی تک ممکن نہ ہو پاتی۔ نماز پنجگانہ کی تکمیل ہی بمشکل ہوتی تھی۔ ذہن میں انہی کتب اور اس سے کشید ہونے والا وہ ناقابل فہم خمار طاری رہتا۔ کبھی یہ بھی نوبت چلی آتی کہ نماز کی ادائیگی کے لیے اٹھنا ہی محال محسوس ہوتا۔ دھیرے دھیرے حالات اس نہج تک چلے آئے کہ جعفر کے حفظ شدہ تین سپارے ذہن سے محو ہو گئے۔ دل پر نقش سینکڑوں احادیث بھی یکسر فراموش ہو گئیں۔

یہ صورت حال شدید تکلیف دہ تھی۔ بسا اوقات جعفر کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا دل روگی اور مریض ہو گیا ہے۔ یہ ناسور اس قدر تیزی سے سرایت کر گیا کہ وہ ملحد اور دہریوں کے دلائل کی جانب مائل ہو گیا پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب جعفر اور کفر میں محض بال برابر ہی فرق رہ گیا تھا۔ جعفر اس کیفیت سے نجات اور اپنی سابقہ روش اختیار کرنے کے لیے ایک ہی دعا مانگتا تھا۔

''اے بصیر و کریم! اس اندھے کا ہاتھ پکڑ لے۔ مجھے گمراہی کے اس دلدل میں غرق نہ ہونے دیجیو!''

وقت تیزی سے گذرتا بالآخر ایسے موڑ پر چلا آیا جب اسے جانگھ پر ایک سخت دنبل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ مختصر عرصہ میں ہی مرض اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ اس کا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔

اگلے ڈیڑھ ماہ میں اس دنبل سے سیروں پیپ جاری رہی۔ پانچ ہفتے اسپتال میں گزارنے کے بعد بھی جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو بھی احباب اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگے۔ اس بے بسی میں جعفر کو اپنی بے راہ روی شدت سے پشیمانی میں مبتلا کرنے لگی۔ وہ گڑگڑا کر ایک ہی دعا مانگتا۔

''الٰہی! مجھے توبہ کا ایک موقع فراہم کر دے۔ میں عہد کرتا ہوں اس مرض سے شفا پاتے ہی نماز تہجد ہی نہیں قرآن و حدیث کے مطالعہ کا آغاز بھی کر دوں گا۔''

جعفر کی یہ گریہ زاری رنگ لے آئی۔ اس کی قلبی ماہیت میں تبدیلی در آنے لگی۔ فراموش شدہ تین سپارے، احادیث اور مختلف دعائیں بھی ذہن کی سلیٹ پر از خود ابھرتی چلی گئیں۔ نماز میں بھی لذت اور گداز محسوس ہونے لگا۔ مرض میں ناقابل یقین رفتار سے افاقہ در آیا۔ اسپتال سے آنے کے بعد جعفر نے حدیث اور تفسیر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ دعا مانگنے میں سرور، گداز اور گریہ بھی بحال ہو گیا۔ وہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے نہ تھکتا کہ پروردگار نے اپنے فضل سے اسے عبادت اور اطاعت کی توفیق دی ہے۔

☆☆☆

جعفر کے مکتبہ فکر سے برطانوی عناد کا جو آغاز 1863ء میں ہوا تھا وہ اتنے برس گذر جانے کے بعد بھی جوں کا توں برقرار تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہی ہوگا کہ اس عناد کی آتش مزید فروزاں ہوئی تھی۔ کئی عاقبت نااندیش مسلمان اور ہندو بھی اس آتش کو بھڑکانے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب Our Indian Muslims تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ صادق پور، پٹنہ، بنگال میں گرفتاریوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کر کے کئی قیدیوں کو انڈمان روانہ کر دیا گیا۔ مولوی تبارک علی، مولوی امیرالدین بھی انہی قیدیوں میں شامل تھے۔

ہندوستان بھر میں جب علماء و شرفاء کی گرفتاریوں اور بدترین سزاؤں کا سلسلہ نہ تھما تو جعفر کے دل میں ہزار ہا ملال اور ان گنت خلشیں ڈیرے جما کر اپنے نوکیلے پنجوں

نے غسل ونماز کے بعد جسد خاکی دفاس چینٹ میں واقع ایک بے نام قبرستان میں دفن کردیا جو جیر سے تھوڑی ہی دور واقع تھا۔

جعفر کا دل بے طرح بوجھل اور دکھی تھا۔اس اذیت اور کرب وخلش میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب ستمبر 1882ء میں ہندوستان سے اہلیہ نے خط میں لکھا۔

''ہماری بڑی لڑکی اب جوان ہوگئی ہے۔آپ کی رہائی کی اُمید پر میں نے آج تک اس کی شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چلایا لیکن اسے کب تک... یوں بٹھا کر رکھا جا سکتا ہے؟ اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی مناسب جگہ پر شادی کا بندوبست کردیتی ہوں۔آپ اخراجات کے لیے حسب مقدور کچھ رقم بھجوا دیں۔''

جعفر نے ہمت اور حوصلہ مجتمع رکھتے ہوئے اکتوبر 1882ء میں اسے تین سو روپیا نقد اور زیور د پارچہ بھی پانی پت بھیج کر خط میں لکھا۔''کسی دین دار مسلمان سے اس کا عقد کردو۔''

☆☆☆

جعفر کے بھیجے گئے اس سامان کی وصولی کے بعد اس کے گھر میں ایک سوگوار اور کہرام نما کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اہلیہ اور بیٹی کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''حوصلہ سے کام لو عزیزہ! تقدیر پر کس کا زور چلا ہے؟ اب قدرت کو یہی منظور تھا۔''ایک رشتہ دار نے دلاسہ دیا۔

''اتنے برسوں سے حوصلہ ہی تو کررہی ہوں۔اب ہمت کی چادر تار تار ہونے لگی ہے۔''اس کے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔

''اسے وہاں رہ کر بھی اپنے فرائض کا مکمل احساس ہے۔اس نے بہترین اسباب فراہم کردیے ہیں تمہیں۔'' ایک اور خاتون نے لقمہ دیا۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے خالہ! لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی نعمت ایسے موقع پر شوہر اور والد کا متبادل ثابت نہیں ہوسکتی۔''جعفر کی بیٹی نے سوگواری سے جواب دیا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بٹیا! بس دعا کرو کہ پروردگار اپنی جناب سے اس کی رہائی کا کوئی وسیلہ پیدا فرمادے۔'' اسی خاتون نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''آمین! میں تو دن رات یہی دعا مانگتی ہوں کہ میری بچی والد کے سائے میں ان کی دعاؤں اور شفقت کا خزانہ لیے رخصت ہو۔''اہلیہ نے تڑپ کر آسمان کی جانب دیکھا۔

وہ لمحہ شاید قبولیت کا ہی تھا۔جعفر کو خود بھی علم نہ ہوسکا کہ تیس دسمبر 1882ء کو اس کی رہائی کی خبر پانی پت میں اہل خانہ تک پہنچ گئی۔جعفر نے اس رہائی کے لیے کوئی درخواست یا سفارش نہیں کی تھی اس لیے جب بائیس جنوری 1883ء کو اسے یہ اطلاع ملی تو وہ اسی وقت سجدہ شکر ادا کرنے لگا۔

مزید تفصیلات کے بعد علم ہوا کہ بغاوت کے جرم میں قید اس کے مکتبہ فکر کے سبھی افراد کی رہائی کا حکم جاری ہوا ہے۔ان کی مقامی حکومت رہائش وملازمت کے بندوبست کی ذمہ دار ہوتی۔اس رو سے جعفر، مولوی عبدالرحیم، میاں عبدالغفار، مولوی تبارک علی، مولوی امیرالدین اور میاں مسعود ہندوستان جانے کے لیے آزاد تھے۔

جلد ہی یہ خبر ہندوستان کے اخبارات میں بھی شائع ہوگئی۔لارڈ رپن کے اس تاریخی فیصلے کو خوب سراہا گیا اور ہندوستانی عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔قدرت کی کرم نوازی یہ بھی ہوئی کہ انبالہ میں کپتان ٹمپل نامی مجسٹریٹ نے جعفر کو پنجاب حکومت کی اجازت سے اپنے پاس رہنے کی پیشکش کردی۔ٹمپل اس کا شاگرد بھی رہ چکا تھا۔اس نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ضامن بننے اور نگرانی کی سبھی شرائط کی ہامی بھرلی۔

یہ خبریں بے حد خوش کن سہی لیکن جعفر کے سامنے ایک بڑی قباحت اب بھی موجود تھی۔رہائی کا پروانہ صرف جعفر کے لیے جاری ہوا تھا۔اس کی اہلیہ تاحال دائم الحبس قیدی تھی۔اسے یہاں قید ہوئے ابھی صرف چودہ برس ہی بیتے تھے۔جعفر کے ایماء پر حکومت کو مطلع کردیا گیا کہ وہ اپنی اہلیہ اور بچوں کے بغیر ہندوستان نہیں لوٹ سکتا۔اس لمحہ جعفر بھی عجیب وغریب صورت حال کا شکار ہوچکا تھا۔اس نے برس ہا برس اپنی آزادی اور ہندوستان روانگی کے خواب دیکھے تھے اور اب یہ وقت آتے ہی وہ الجھنوں اور کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ایک بہترین ملازمت، اہل وعیال اور جمی جمائی زندگی کو یکدم چھوڑ دینے کا تصور حیران کن طور پر دل میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔اسی کشمکش سے مغلوب ہوکر جعفر نے پنجاب حکومت کو ایک مکتوب ارسال کیا۔

''انڈمان میں میرا نہایت عمدہ گھر موجود ہے۔میں سو روپیا ماہوار پر ملازم ہوں۔ہندوستان میں میرا گھر ہے نہ مکان۔غالب امکان یہی ہے کہ پنجاب حکومت کے اعلیٰ

عہدیداران میری وہاں آمد کے بعد مجھ سے ناحق چھیڑ چھاڑ کریں اور سابق قیدی ہونے کی حیثیت سے ملازمت وغیرہ کے لیے بھی نااہل سمجھیں۔انہی حالات وحقائق کے پیش نظر میں درخواست گذار ہوں کہ وقتاً فوقتاً ہندوستان جاکر اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا مجاز قرار دے دیا جاؤں۔''

پنجاب حکومت نے اس کی یہ درخواست مسترد کردی۔ مارچ 1883ء میں مولوی عبدالرحیم، میاں عبدالغفار، تبارک علی اور مولوی امیرالدین ہندوستان روانہ ہوگئے۔اپریل میں میاں مسعود کی روانگی بھی عمل میں آگئی۔جعفر کا انتظار بھی جلد رنگ لے آیا اور مئی میں اس کی اہلیہ کو اذن رہائی مل گئی۔اب بظاہر سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی لیکن قسمت کو ابھی ان کی چند مزید آزمائشیں مقصود تھیں۔ جعفر کے ہاں ایک بار پھر ننھے مہمان کی آمد متوقع تھی۔اسی اثناء میں سمندری طوفان نے بھی زور پکڑلیا۔ان عوامل کے پیش نظر یہ روانگی نومبر تک ملتوی رہی۔اس دورانیہ میں جعفر نے اپنے گھر کا اسباب اونے پونے فروخت کردیا۔

گھریلو اسباب کی فروخت کے بعد اس نے اکتوبر میں اپنی رہائش گاہ بھی مسجد کے قالب میں ڈھال کر فی سبیل اللہ وقف کردی۔پورٹ بلیر میں مسجد نہ ہونے کے سبب مسلمان بہت دشواری محسوس کرتے تھے۔وہ جعفر کے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے لیکن یہ خوشی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ڈپٹی کمشنر میجر ہرچ نے جعفر اور اس کے مکتبہ فکر سے تعصب کی بناء پر اعلیٰ حکام کو رپورٹ کردی کہ یہ مسجد کسی بھی صورت نہ بنانے دی جائے۔

☆☆☆

جعفر اور اس کے اہل خانہ کا انڈمان سے رخصتی کا وقت آچکا تھا۔اس نے روانگی سے قبل نو نومبر 1883ء کو اپنے سبھی احباب کو گھر مدعو کرکے ایک عام دعوت کا انعقاد کیا۔دعوت نامہ پر جلی حروف میں لکھا گیا۔

''یہ خاکسار اٹھارہ برس انڈمان میں قیام کے بعد ہمیشہ کے لیے ہندوستان جارہا ہے۔آپ سے اپنے عنایت فرما ہونے کی حیثیت سے اُمید ہے کہ وہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرماکر خاکسار کے ساتھ آخری ماحضر تناول کرکے مشکور و ممنون فرماویں گے۔''

یہ دعوت ملنے پر سبھی شرکاء بلاعذر خوش دلی سے چلے آئے۔جعفر کی روانگی بھی اسی دوپہر ہونا تھی۔طعام کے بعد سبھی حاضرین جذباتیت کا شکار ہوگئے۔وہ اس 'جلسہ مفارقت' میں بطور تقریر اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن چند الفاظ بولتے ہی ان پر رقت سی طاری ہوجاتی۔ خود جعفر کا بھی یہی عالم تھا۔اس کی نصیحت آمیز تقریر کی خواہش دھری کی دھری رہ گئی۔وہ جذباتی تلاطم میں ایک بھی لفظ ادا نہ کرسکا تھا۔

لمحے تیزی سے سرک رہے تھے۔جعفر نے مولوی لیاقت علی کے ساتھ انڈمان میں آخری بار نماز جمعہ کی ادائگی کی اور مخصوص رتھ پر سوار ہوکر اپنے لواحقین کے ہمراہ جزیرہ روس کو چلا آیا۔

اس نے چند روز قبل ہی سفر کے ممکنہ اخراجات اپنے پاس رکھ کر بقیہ نقد روپیا اور اسباب خیرات کردیا تھا۔اب اس کے پاس چند کتابوں اور چند جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔اہلیہ اور آٹھ بچوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہونے سے قبل اسے بے اختیار وہ لمحات یاد آئے جب وہ گیارہ جنوری 1866ء کو محض ایک لنگوٹی میں تن تنہا ایک جہاز سے اسی مقام پر اترا تھا۔قدرت کی کرم فرمائیوں پر وہ اپنی ہر آتی جاتی سانس میں شکرانہ ادا کرنے لگا۔

شام پانچ بجے وہ 'اگبوٹ مہارانی' پر سوار ہوکر ایک پہلک پہنچ گئے۔اس جہاز میں ان کے علاوہ بھی کئی رہائی پانے والے مرد وخواتین، کچھ ہندوستانی اور یورپی مسافر بھی سوار تھے۔موسم نہایت عمدہ اور سمندر بالکل ٹھنڈا تھا۔موج اور تلاطم کا کہیں کوئی نام ونشان نہ تھا۔

غروب آفتاب کے بعد جہاز کا لنگر اٹھا دیا گیا اور دسویں محرم کے اس روز انہوں نے نم آنکھوں، پرمسرت دل کے ساتھ جزائر انڈمان کو یکے بعد دیگرے خیرباد کہنا شروع کردیا گیا۔مجموعی مسافت بہت خوش گوار گذری۔علی رضا نامی ایک مشہور تاجر نے جعفر اور اس کے اہل خانہ کی بہت خاطر تواضع کی۔دونوں اوقات میں عمدہ کھانا، مچھلی، چائے، پھل اور مختلف انواع کے میوؤں مٹھائیوں سے اس کا دسترخوان سجا دیتا۔ یہ سفر اگلے چار دن اور چار راتوں تک جاری رہا اور تیرہ نومبر 1883ء کو وہ جہاز کلکتہ میں داخل ہوگیا۔

جعفر نے اگلے دو روز مولوی عبدالرحیم کے بھائی مولوی عبدالرؤف کی رہائش گاہ میں بسر کیے اور تیسری شب تقریباً نو بجے بذریعہ ریل کلکتہ سے الہ آباد، کانپور، علی گڑھ، سہارنپور اور انبالہ کی منازل طے کرتے ہوئے اکیس نومبر کی شب انبالہ کے اسٹیشن کیمپ پہنچ گیا۔اس سفر میں کلکتہ سے دو

سپاہی اور ایک نائیک بھی اس کے اہل وعیال اور مال کی حفاظت کے لیے بطور اردلی انبالہ تک آئے تھے۔

ہندوستان آمد کے بعد یہ آٹھ روز جعفر کے بچوں پر بلحاظ موسم خاصے گراں گذرے تھے۔ اپنی پیدائش کے روز اوّل سے ہی انڈمان جیسے دائمی معتدل آب وہوا کے حامل علاقہ میں رہنے والے ان افراد نے 'سرما' کا تجربہ زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔

اگلے کچھ عرصہ میں وہ ہندوستانی موسموں کے عادی ہو گئے۔ جعفر کی انبالہ آمد کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ رہ سکی۔ اس کے حکام ضلع سے اجازت لے کر ٹمپل سے بھی ملاقات کی۔ ٹمپل نے اسے بصد احترام اپنے گھر میں بہترین نشست پر بٹھایا اور کچھ دیر کی گفتگو کے بعد کہنے لگا۔

''ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آج کی تاریخ سے تم بیس روپیا ماہوار تنخواہ حاصل کرو گے۔''

''لیکن ملازمت؟'' جعفر نے حیرانی سے کہا۔

''اس کا تو کوئی بندوبست نہیں ہوا تھا لیکن وہ بھی جلد ہی ہو جائے گا۔'' ٹمپل پُراعتماد تھا۔

اس نے اپنا یہ دعویٰ جلد ہی پورا کردیا اور مختلف افسران کو مقامی زبانیں پڑھانے دکھانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ جلد ہی تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہو گئی۔ جعفر نے کیمپ انبالہ کے صدر بازار میں کرائے کا ایک مکان لیا اور اپنے اہل خانہ سمیت وہاں منتقل ہو گیا۔ نئے مکان کے لیے اسباب کی خریداری اور اسے ترتیب دینے سے فراغت کے بعد اس نے گیارہ دسمبر 1883ء کو ایک ہفتے کی رخصت لی اور بذریعہ ریل دہلی چلا آیا۔

دہلی میں ایک رات قیام کے بعد وہ اگلے روز یکہ پر پانی پت پہنچا۔ سوئے اتفاق اس روز وہی تاریخ تھی جب برسوں قبل وہ اپنی رہائش گاہ سے فرار ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ایسا بھی محسوس ہوا کہ یہ درمیانی عرصہ کوئی خواب تھا۔ ایک طویل اور بھیانک خواب۔

مغرب کی نماز کے بعد جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اہلیہ اور بچے اس کی دید سے باغ باغ ہو گئے۔ جعفر اپنے اس بیس سالہ بیٹے کو دیکھ کر آبدیدہ ہونے لگا جو بروز فرار محض چند ماہ کا تھا۔ اس نے اہل وعیال کے ساتھ پانچ روز بسر کیے اور براستہ کرنال پہلے تھانیسر پہنچا جہاں چند گھنٹے قیام کے بعد انبالہ لوٹ آیا۔ اس تمام تر سفر میں اس سے ہزار ہا افراد ملاقات کے لیے چلے آتے رہے۔ وہ دوران مقدمہ اس کی استقامت، طویل قید اور واپسی کو خدا کی قدرت سمجھتے ہوئے اپنے ایمان میں ایک عجیب تقویت محسوس کرنے لگتے۔

تھانیسر مختصر قیام کے دوران جعفر اپنا آبائی مکان دیکھنے کے لیے گیا۔ نیا مکان مالک اس سے غائبانہ طور پر واقف تھا لہٰذا خوش دلی سے اجازت دے دی۔ اس نے مستورات کو ایک کمرے میں علیحدہ کر کے جعفر کو مکان کے اندرونی قطعات کی زیارت کروادی۔

یہ بھی قدرت کی عجب ستم ظریفی تھی کہ وہ برس ہا برس اس مکان کا حقدار ہونے کے بعد اب وہاں از خود قدم رکھنے کا مجاز نہیں تھا۔

''الٰہی! تیرا شکر ہے! تو جس حال میں بھی رکھے میں راضی ہوں۔'' اس نے بوقت رخصت آسمان کی جانب نظریں اٹھا کر دعا کی۔

☆☆☆

ہندوستان واپسی کے بعد ٹمپل نے جعفر کا ہر قدم پر ساتھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب ٹمپل کا تبادلہ ہندوستان سے کہیں اور کر دیا گیا تو جعفر کی کسی بھی خصوصی کوشش یا سفارش کے بغیر اسے ریاست ارنولی میں ملازمت مل گئی۔ ٹمپل نے اپنے وعدے کے مطابق جعفر کی نگرانی بھی ختم کروادی تھی۔ اس کے تبادلے کے بعد بھی نگرانی کا سلسلہ موقف ہی رہا۔ البتہ دوسری جانب اس کے پانچوں رفقائے جیل پر تاحال یہ نگرانی مسلط تھی۔

جزائر انڈمان سے رہائی کے بعد جعفر نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی بہت متوازن انداز میں گذاری۔ اس نے ریاست ارنولی کے ایک مقدمہ کی پیروی میں ولایت جانے کا قصد بھی کیا جہاں ڈاکٹر ہنٹر اور دوسرے مخالفین سے ایک بار ملاقات کر کے انہیں قدرت کے اختیارات کا ثبوت دے سکے۔ اس کے بعد جعفر نے اپنی تلاطم خیز زندگی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے انعامات واحسانات کے شکرانے میں ایک خودنوشت لکھنے کا آغاز کیا۔ کتاب کی تکمیل کے بعد وہ اپنے ذاتی اور پیشہ وارانہ فرائض جانفشانی سے ادا کرتے بالآخر ایک روز اجل کا ہمراہی بن گیا۔

(مولانا محمد جعفر تھانیسری کی تاریخ وفات کا اندراج کہیں کسی کتاب میں نہیں ہے۔)

ماخذات:

کالا پانی۔ تواریخ عجیب

از: مولانا محمد جعفر تھانیسری

باکمال شخص

سید ساجد یزدانی

بالی ووڈ سے لالی ووڈ تک فلمی دنیا میں ہلچل مچادینے والی شخصیت جس نے دہلی سے لاہور تک ادبی میدان میں اپنا پرچم بلند رکھا لیکن ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

ایک باکمال شخصیت کا مختصر سا تعارف

23 مارچ 1990ء کو لاہور میں جشن قرار داد پاکستان منایا جارہا تھا۔ ہر طرف جوش وخروش کا ایک سمندر تھا۔ حب الوطنی کا مظاہرہ تھا۔ ہر کوئی یوم پاکستان کی خوشی سے سرشار تھا۔ ایسے وقت میں مجھ پر ایک الگ کیفیت طاری تھی۔ میں میو اسپتال کے میڈیکل وارڈ میں گم صم سا کھڑا تھا۔ قبلہ یزدانی جالندھری بستر علالت پر نیم بے ہوشی میں تھے کہ انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "بیٹا آج 23 مارچ ہے؟"

"جی ہاں آج 23 مارچ کا دن ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا آج اخبار نہیں لیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں! یہاں تو اخبار نہیں لیا البتہ گھر پر اخبارات موجود ہیں!"

"میں نے اسی بستر علالت پر 23 مارچ کے حوالے سے ایک نظم لکھی تھی غالباً امروز میں شائع ہوئی ہوگی اور ہاں آج رات ریڈیو پر بھی یہی نظم آئے گی اس لیے کہ ریڈیو پروڈیوسر مجھے بیماری کی حالت میں ہی مشاعرہ پڑھنے کے لیے لے گئے تھے۔"

میں نے ان کی تسلی کے لیے کہا۔ "میں آپ کو بازار سے امروز کا ایڈیشن لا دیتا ہوں اور ہاں رات کو ریڈیو سے نظم ٹیپ بھی کرلیں گے، جب آپ صحت یاب ہو کر گھر آئیں گے تو

لیجیے گا۔"

میں اخبار لینے کے لیے وارڈ سے باہر آ گیا۔ میو اسپتال کے مین گیٹ کے سامنے ایک اسٹال تھا، وہاں سے اخبار لیا اور تیزی سے واپس آ گیا۔

میرے جانے آنے کے دوران ان کی طبیعت اس قدر بگڑ گئی کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ڈاکٹر کو بلایا انہوں نے خوب اچھی طرح دیکھا کر بینے کا درد انہیں چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سکون کے لیے انجیکشن بھی دیے مگر وہ تو دل کا دورہ تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انہوں نے چند لمحوں میں ہی رخت سفر باندھ لیا۔ بقول انہی کہ

سانس کے قافلے کا رُک جانا
ابتداء اک نئے سفر کی ہے

ان کی وفات کے بعد ادیبوں شعراء کرام اور دانشوروں نے ان کے فن اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا مگر میں ایک فلمی صحافی ہونے کی حیثیت سے ان کی فلمی سرگرمیوں کا ذکر کروں گا۔ اس لیے کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ گیت نگار، مکالمہ نگار اور ہدایت کار کی حیثیت سے بھی فلمی دنیا سے منسلک رہ چکے ہیں۔

وہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ بچپن ساہیوال میں گزارا۔ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ اسلامیہ کالج میں دوران تعلیم ہی شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ کالج میں ادبی ماحول میسر آیا یہاں حمید نظامی، سید ضمیر جعفری، شورش کاشمیری اور مرزا ادیب جیسے دوست میسر آئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مختلف اخبارات و جرائد میں لکھنے لگے۔ ان کا کلام لاہور، دہلی، لکھنو اور بمبئی کے رسائل میں شائع ہوتا تھا۔

لاہور میں سید عطا اللہ شاہ ہاشمی نے ان کے قلم کی کاٹ مدِنظر رکھ کر اپنے ہفت روزہ "اداکار" کی ادارت ان کے سپرد کر دی تھی۔ وہ ہفت روزہ مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، جی ایل کاوش، قمر اجنالوی جیسے شعراء کی کاوشیں تواتر سے شائع ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے ان سب سے قربت دوستی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

سید عطا اللہ شاہ ہاشمی نے لاہور کے ساتھ ساتھ اپنے جریدے "اداکار" کو بمبئی سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا، وہ واحد فلمی ہفت روزہ تھا جو بیک وقت لاہور اور بمبئی سے شائع ہونے لگا تھا۔ بمبئی میں انہیں فلم "طلسمی دنیا" کے گیت لکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس کے بعد ہدایت کار و اداکار نواز نے اپنی فلم "خوفناک آنکھیں" کے گیت انہی سے لکھوائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں معاون ہدایت کار کے طور پر بھی انہوں نے کام کیا۔

1947ء میں سید عطا اللہ شاہ ہاشمی نے اپنی ذاتی فلم "کنیز" کا آغاز کیا اس فلم کی ہدایات کے لیے "کے خورشید" کو لیا جو ان دنوں کے کمار کے نام سے ہدایتکاری کرتے تھے۔ کنیز نامی اس فلم کے اسکرین پلے و مکالمے یزدانی جالندھری نے ہی لکھے پھر 1948ء میں فلم طلسمی خنجر کے اسکرین پلے و مکالمے اور گانے تحریر کیے۔ اس کے بعد "یہ ہے دنیا" اور "کسان" کے اسکرین پلے مکالمے اور گانے تحریر کیے۔ ان فلموں کے ایسوسی ایٹ ہدایت کار بھی تھے۔ بمبئی میں مکمل ہونے والی فلم "آزادی" کا یہ گیت بے حد مقبول ہوا تھا۔

تم تو جاتے ہو پردیس سجنوا جاتے ہو پردیس
کہو میرا کون سہارا میرا کون سہارا

اس گیت کو ماضی کی مشہور گلوکارہ حمیدہ بانو نے گایا تھا، اس کے بعد بننے والی فلم جگر کے موسیقار نثار بزمی تھے جو ان دنوں بمبئی میں ایس جلگاؤں کر کے نام سے موسیقی ترتیب دیتے تھے۔ اُن کے لیے بھی یزدانی جالندھری نے بہت کام کیا۔

موسیقار نثار بزمی اور ہدایتکار اے پی آزاد کے ساتھ یزدانی جالندھری کے اچھے مراسم تھے۔ انہی دنوں ساحر لدھیانوی بھی پاکستان سے فرار ہو کر بمبئی آ چکے تھے۔ بمبئی میں انہیں خوش آمدید کہنے والے صرف یزدانی صاحب تھے جس کا ذکر مشہور بھارتی ادیب سی ایل کاوش اپنے اکثر خطوط میں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بمبئی سے شائع شدہ کے جاں نثار اختر نمبر میں تفصیل سے ذکر ملتا ہے کہ کس طرح یزدانی صاحب نے ساحر لدھیانوی کو بمبئی کے فلمی حلقوں میں متعارف کرایا اور خود فلمی دنیا چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ ان کے ایک دیرینہ دوست تھے خوشتر گرامی، معروف قلم کار، مزاح نگار وہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ ان کا ادبی جریدہ بیسویں صدی اردو دنیا میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ دہلی سے شائع ہونے والا یہ پرچہ قیام پاکستان سے قبل لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یزدانی جالندھری اس وقت اس پرچے کے معاون ایڈیٹر تھے۔ ان کے دہلی پہنچنے پر خوشتر گرامی نے نہایت خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور انہیں جریدے کی ادارت سونپ دی۔ 1950ء سے 1951ء تک یزدانی دہلی میں رہے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ یزدانی کا سارا خاندان پہلے ہی ساہیوال منتقل ہو چکا تھا۔ اس دوران یزدانی صاحب کو والد کی علالت کی اطلاع ملی اور وہ دہلی سے ساہیوال چلے

آئے۔ یہاں آتے ہی والدین نے ان کی شادی کر دی یوں پھر وہ دہلی نہ جا سکے۔ شادی کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے فلم "الزام" اور "شکار" کے گیت لکھے۔ انہی دنوں سید جعفری بخاری نے نئی فلم "نتیجہ" کا آغاز کیا جس کے اسکرین پلے، کہانی اور مکالمے یزدانی صاحب سے لکھوائے۔ ان دنوں یزدانی صاحب چٹان لاہور سے وابستہ تھے۔

چٹان میں ان کے ساتھ ریاض شاہد بھی کام کرتے تھے، جنہیں فلم رائٹر بننے کا بے حد شوق تھا۔ یزدانی صاحب نے انہیں مختلف فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے ملوایا اور فلم نتیجہ کے مکالمے لکھتے وقت انہیں اپنے ساتھ رکھا۔

1960ء میں کراچی کی فلمی صنعت میں بھی کام کی رفتار بڑھی تو کراچی میں یزدانی صاحب کے شاگرد فدا شاہ جہاں پوری نے فلم "مسکہ پالش" کا آغاز کیا۔ صاحب کو بھی کراچی بلوالیا۔

فدا شاہ جہاں پوری جو بعد میں فدا یزدانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ خود کو یزدانی صاحب کے قابل ترین شاگرد کہا کرتے تھے۔ اپنی شاگردی کا واسطہ دے کر انہوں نے "مسکہ پالش" میں مدد دینے کی گزارش کی تھی۔ ان کے اصرار پر ہی یزدانی صاحب نے ان کی فلم مسکہ پالش کے مکالمے اور گیت لکھے۔

مسکہ پالش 1955ء سے 1956ء میں بنی پھر کراچی میں ہی رہ کر نادان کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر رہے۔ انہوں نے کراچی میں ایک درجن کے قریب فلموں کے گیت لکھے۔ کراچی میں قیام کے دوران وہ ماہنامہ "افکار" کے معاون ایڈیٹر بھی رہے۔

شروع سے ہی وہ فلمی مزاج کے آدمی نہیں تھے اسی لیے انہیں فلمی صنعت راس نہ آئی۔ بنیادی طور پر شریف النفس اور کم گو انسان تھے، اس لیے بھی فلمی دنیا میں ان کی کامیابی کے امکانات کم تھے۔ بعدازاں انہیں دوستوں کی طرف سے فلموں کے اسکرپٹ اور گیت لکھنے کی آفرز ہوئیں مگر وہ اپنی ادبی زندگی اور ادبی ماحول سے باہر نہ آئے۔ اس دوران ان گنت لوگوں نے فلم کے اسکرین پلے کے حوالے سے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے پرانے دوست آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یزدانی صاحب کو اسکرین پلے لکھنے پر ملکہ حاصل تھا۔

1964ء کے بعد انہوں نے متعدد ادبی جریدوں میں کام کیا جن میں ہفت روزہ کتابانت روزہ چٹان، ہفت روزہ اسکرین لائٹ ہفت روزہ نیا راستہ، پندرہ روزہ امداد باہمی، روزنامہ سیاست، پندرہ روزہ انقلاب نو، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور کے نام شامل ہیں۔

وہ بلند پایہ شاعر ادیب اور مایہ ناز صحافی تھے مگر ایک درویش منش انسان تھے انہوں نے زندگی بھر دوستوں کی خدمت کی اور اپنے کام سے مخلص رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسمپرسی کی زندگی بسر کی مگر دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ کلام بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ان کا نعتیہ مجموعہ توصیف خیر البشر بھی شائع ہو چکا ہے۔

جس طرح اُن کی وفات پر ادبی حلقوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اُسی طرح فلمی صنعت میں بھی ان کے انتقال کی خبر نہایت افسوس سے سنی گئی۔ اس موقع پر میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح انہوں نے ریاض شاہد، رشید ساجد اور سعید ساحلی کو متعارف کرایا اُسی طرح گلوکار مہدی حسن کو پہلی مرتبہ فلم کے لیے گانے کے لیے یزدانی صاحب ہی لائے تھے۔ یہ بات معروف مدوین کار رشید حبیب نے بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ میں ان دنوں یزدانی جالندھری کے ساتھ کام کرتا تھا، یزدانی جالندھری کے مہدی حسن سے دیرینہ مراسم تھے۔ جن دنوں یزدانی جالندھری فلم "شکار" بنانے کے لیے کراچی میں تھے انہوں نے اس فلم کا ایک گیت مہدی حسن کی آواز میں ریکارڈ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ خود میرے ہمراہ مہدی حسن کو لینے لاہور آئے مہدی حسن اپنے پہلے فلمی گانے کا سن کر بے حد خوش ہوئے۔ اس طرح یزدانی جالندھری کا لکھا گیت گا کر مہدی حسن باقاعدہ پلے بیک سنگر بن گئے۔

رشید حبیب کہتے ہیں کہ میرے علاوہ یزدانی جالندھری ہدایتکار رزاق خان کو فلم انڈسٹری میں لائے۔ ہم طویل عرصہ ان کے ہمراہ رہے اور ان سے فن کے اسرار و رموز سیکھے۔ یاد رہے کہ یزدانی جالندھری نے پہلی مرتبہ ریاض شاہد کو فلم کا اسکرپٹ لکھنے کی طرف مائل کیا تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب یزدانی جالندھری ہفت روزہ چٹان سے وابستہ تھے انہی دنوں ریاض شاہد بھی چٹان میں لکھتے تھے۔ یزدانی جالندھری ہدایتکار جعفر شاہ بخاری کی فلم "نتیجہ" کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے اسی سلسلے میں جعفر شاہ بخاری کا دفتر چٹان آنا جانا رہتا تھا ایک دن یزدانی صاحب نے جعفر شاہ بخاری سے ریاض شاہد کا تعارف کرایا اور کہا کہ میں آج معروف ہوں یہ سین آپ ریاض شاہد سے لکھوالیں، یہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اس طرح ایک سین لکھنے کے بعد ریاض شاہد اور جعفر شاہ بخاری میں گہری دوستی ہو گئی بعد

ازاں ریاض شاہد نے جعفر شاہ بخاری کی فلم "بھروسا" کا اسکرپٹ لکھا۔ اسی طرح بتایا جاتا ہے کہ معروف نغمہ نگار ساحر لدھیانوی کو بمبئی کی فلمی صنعت میں متعارف کرانے والی شخصیت بھی یزدانی جالندھری تھے۔ جب ساحر لدھیانوی لاہور کو خیرباد کہہ کر پہنچے تو بمبئی میں ان کا خیر مقدم کرنے والے صرف یزدانی جالندھری تھے۔ جنہوں نے بمبئی کے فلم سازوں سے ساحر لدھیانوی کا تعارف کرایا جہاں سے وہ باقاعدہ نغمہ نگار کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔ تدوین کار رشید حبیب کہتے ہیں کہ یزدانی جالندھری صاحب ہر کسی سے شفقت و محبت سے پیش آتے انہیں فلم کی تکنیک پر بھی عبور حاصل تھا اور علمی سطح پر تو ہر کوئی ان کا معترف ہے مگر وہ ہمیشہ سے گوشہ نشین رہے شرافت اور وضع داری نے انہیں فلم لائن سے دور کر دیا ورنہ وہ اپنی تحریروں اور ڈائریکشن سے ایسے شاہکار تخلیق کرتے کہ آنے والی نسلیں ان کی تقلید کرتیں، بہرحال انہوں نے اپنا آپ ظاہر کیے بغیر اتنا نام کمایا تو اگر وہ فلمی دنیا داری سے واقف ہوتے تو یقیناً ان کی مزید خوبیاں سامنے آسکتی تھیں، یزدانی صاحب کا شمار ہمارے اساتذہ اور سینئرز میں سے ہوتا ہے، میں نے زندگی کا بہت سا حصہ ان کے ساتھ گزارا، وہ اپنے کام سے مخلص ایک دیانتدار انسان اور عظیم تخلیق کار تھے۔

معروف صحافی اور ادیب حمید اختر نے یزدانی جالندھری کے انتقال پر کہا تھا، ایک اخبار میں میں نے یزدانی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھی تو مجھے دلی صدمہ پہنچا اور یہ صدمہ اس وقت دوچند ہو گیا جب میں نے یہ پڑھا کہ ساحر لدھیانوی یزدانی جالندھری کے ہمعصر تھے میں تو ان کی زندگی کا چشم دید گواہ ہوں، یزدانی صاحب ساحر کے ہم عصر نہیں بلکہ ان سے بڑے اور سینئر شاعر تھے۔ بمبئی میں میں اور ساحر اپنے شعروں کی اصلاح کے لیے اکثر یزدانی صاحب کے پاس جایا کرتے تھے فن شاعری اور صحافت میں انہیں جو کمال حاصل تھا وہ صرف انہی کا خاصہ ہے میں تو کہوں گا ان کی وفات کے ساتھ ہی کلاسیکل شاعری کا آخری چراغ بھی بجھ گیا۔

پاکستان فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری رشید ساجد کہتے ہیں یہ 1958-59 کے عرصے کی بات ہے جب سعید ساحلی، خواجہ پرویز اور میں مشہور فلمی ہفت روزہ "ممتاز" سے وابستہ تھے، صحافت میں ہمارا ابتدائی دور تھا۔ رشید جاوید جو اس جریدے کے پبلشر تھے، بڑے دبنگ اور کھرے قسم کے آدمی تھے وہ جس کھرے انداز میں معاوضہ دینے کے عادی تھے اسی کھرے انداز میں عین وقت مقررہ پر لکھنے والوں سے پہلے مضامین کا تقاضا بھی کرتے تھے۔ میں، خواجہ پرویز اور سعید ساحلی چونکہ ابھی ابتدائی دور میں تھے لہٰذا صحافتی انداز و عادات سیکھنے کے لیے ہمیں ایک مہربان مشفق رہبر کی ضرورت تھی یہ ہماری خوش قسمتی کہ یزدانی جالندھری صاحب کی صورت میں ہمیں وہ رہبر مل گیا۔ یزدانی صاحب وقت کے بڑے پابند تھے مگر وہ ہماری بہت سی کوتاہیوں اور خامیوں پر پردہ ڈال لیا کرتے تھے اور رشید جاوید کے دبنگ لہجے کا مقابلہ بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی سے کر لیتے تھے۔ ممتاز کے دفتر میں شام کو پانچ بجے کے بعد علم و ادب کی ایک چھوٹی سی محفل ہر روز جمتی تھی۔ ہم لوگ سننے والے اور یزدانی صاحب اپنے تجربات بیان کرتے جس سے ہماری رہنمائی ہوتی۔ وہ ہمیں مفید مشورے بھی دیتے اور جب رات گئے ہم وہاں سے اٹھتے تو یزدانی صاحب کہتے کہ یار تم لوگ ہر روز معصوم صاحب کا ایک کالم پی جاتے ہو۔ بات یہ تھی کہ اس محفل کی چائے معصوم صاحب ہیڈ کاتب ممتاز لاہور کے ذمے تھی۔

یزدانی صاحب اپنی بیسویں صدی سے وابستگی کا تذکرہ کچھ یوں کرتے کہ جیسے کوئی بچھڑی ہوئی محبوبہ کا ذکر کرتا ہو، اس وقت یزدانی صاحب نے مالی طور پر وہ اچھا وقت نہیں دیکھا جو آج کل کے اخبار نویسوں کا مقدر ہے مگر علم و صحافت اور شعر و سخن میں انہوں نے وہ مقام ضرور بنا لیا تھا جو آج بہت سے لوگوں کے لیے ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلم میں آنے سے پہلے مجھے اپنی مختصر سی صحافتی زندگی میں جتنے بھی لوگ ملے یزدانی جالندھری اپنی شرافت اور اپنی علمی قابلیت کے اعتبار سے ان سب میں ممتاز ہیں، ان کا کسی بات کو سکھانے کا انداز بالکل ایسے ہوتا جیسے وہ کسی دوست کو مشورہ دے رہے ہوں، کسی راستہ پوچھنے والے کی رہنمائی کر رہے ہوں۔ یہ احتیاط وہ اس لیے بھی روا رکھتے کہ پوچھنے والا کہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔ جب میں نے نغمہ صحرا فلم کا اسکرپٹ لکھا تو سب سے پہلے پڑھنے کے لیے یزدانی صاحب کو اسکرپٹ دیا جسے پڑھنے کے بعد انہوں نے مجھے بڑے مفید مشورے دیے جو آج بھی میرے لیے مشعل راہ ہیں۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جس سے یزدانی صاحب نے آخری دم تک پیار کیا۔ وہ میری خاطر فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے انتخابات میں ووٹ دینے ہر مرتبہ الیکشن کے موقع پر اسٹوڈیو تشریف لاتے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرے استاد کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے آمین

++

سینماؤں کا زوال

اعجاز احمد نواب

ہر ملک میں فلمی صنعت واحد صنعت تسلیم کی جاتی ہے جو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں فلمی صنعت کو قائم رکھنے میں ہر کوئی دلچسپی لیتا ہے لیکن ہمارے ہاں سب سے کمزور صنعت یہی ہے۔ سینما ہال اس صنعت میں ریڑھ کی ہڈی تھے مگر اب خال خال سینما ہال رہ گئے ہیں۔

راولپنڈی کے سینما ہالز پر ایک مختصر سی تحریر

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو یہ سنہ 70ء کا زمانہ تھا، اور یہ دور مکمل طور پر فلمی دور تھا، اولی وڈ کی فلمیں خوب پیسا کما رہی تھیں، نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ مشرقی پاکستان سے بھی خوب پیسا کما کر پروڈیوسروں، ہدایت کاروں، اداکاروں کی تجوریاں بھر رہی تھیں۔ تقسیم کاروں کو بھی راتوں رات امیر بنا رہی تھیں، غیر ممالک سے بھی زرمبادلہ لا رہی تھیں۔ فلموں کی کمائی کیسی ہوتی تھی یہ سمجھنے کے لیے تھے ان کی آمدن پر نظر ڈالیں۔ بمبئی کی کثیر رقم سے بنی فلموں کو بھی اکثر پچھاڑ کر ان سے زیادہ کا بزنس کرتیں۔ 70ء کی دہائی میں انگلینڈ کے شہر مانچسٹر کے دو سینما میں بیک وقت پاکیزہ اور امراؤ جان ادا کی... نمائش شروع ہوئی۔ امراؤ جان ادا نے پاکیزہ کے مقابلے میں ڈیوڑھا بزنس کیا۔ جب کہ راج کمار اور مینا کماری کی فلم پاکیزہ 15 ملین کے خرچ سے بنی تھی اور شاہد درانی اور آسیہ کی فلم امراؤ جان ادا ایک چوتھائی سے بھی کم خرچ پر بنی

تھی۔ گویا پاکستانی فلموں کی دھاک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی، چار سو فلمیں ہی فلمیں سینما پر فلمیں، ٹیلی ویژن پر فلمیں، ریڈیو پر فلمی گیت، ہوٹلوں پر باقاعدہ گراموفون پر فلمی گیتوں کے توے (ریکارڈ) چلتے تھے، ایک پیالی چائے پینے کے بہانے دو تین فرمائشی فلمی گانے سن لیتے۔

اخبارات میں فلمی اشتہارات کی بھرمار رہتی، چٹپٹی فلمی خبروں اور فلمی شخصیات کی آپسی محبتوں کے اسکینڈلز کی روداد، تمام روزنامے، ہفت وار فلم ایڈیشن باقاعدگی اور اہتمام سے شائع کرتے، فلمی ماہناموں کی ان گنت تعداد تھی۔ شمع لاہور، شمع کراچی، رومان، چترالی، شباب، فلمی دنیا، پلک، دھنک، ان کے علاوہ ہفت روزہ فلمی اخبارات اور رسائل الگ تھے۔ مصور، ممتاز، اجالا، سنگھم، اسکرین لائٹ، نگار، فلمستان، نور جہاں، عوام میں مقبولیت کے معراج پر تھیں۔

ہر ہفتے سینماؤں پر نئی سے نئی فلموں کی ریلیز کے اشتہارات اور ٹریلر چلتے، ریڈیو پاکستان پر روزانہ سہ پہر کے وقت دس منٹ دورانیہ کے ریڈیو پروگرام ہوتے تھے، جس میں نمائش پذیر فلموں کی کہانی کا خلاصہ، چیدہ چیدہ مکالمے اور گیتوں کے ٹکڑے سنائے جاتے۔ پنجاب بھر کے ان تمام سینماؤں کے نام بتائے جاتے، جہاں جہاں فلم لگی ہوتی۔

فلمی کہانیوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے پمفلٹ ٹائپ کتابچے جن میں فلموں کی کہانیوں کا خلاصہ، کاسٹ اور گانے لکھے ہوتے ہر بک اسٹال پر دستیاب ہوتے، ان کی قیمت فی کتاب ایک آنہ ہوتی تھی، یہ چھوٹی کتابیں، مختلف ادارے شائع کرتے لیکن سب سے زیادہ اور سب سے مشہور لوہار بکڈپو اندرون بھاٹی دروازہ تھا۔ اس کے روح رواں شاید ندیم صہبائی تھے، بے شمار اشاعتی ادارے فلمی گانوں پر مشتمل کتابیں بھی شائع کرتے تھے جو ہر بک اسٹال اور نیوز ایجنسیز پر دستیاب ہوتیں!

پاکستانی فلمی دنیا کے اس سنہرے دور میں صرف مغربی پاکستان میں 700 کے لگ بھگ سینما ہاؤسز تھے ایک اخباری ویب سائٹ کے مطابق قیام پاکستان کے بعد 15 اگست 1947ء آغا جی اے گل نے پشاور میں فردوس سینما کا افتتاح کیا یوں، فردوس سینما پاکستان بننے کے بعد شروع ہونے والا پہلا سینما قرار پایا، لیکن عقیل عباس جعفری اپنی کتاب پاکستان کرونیکل کے صفحہ نمبر 5 پر لکھتے ہیں کہ 18 ستمبر 1947ء کو قیام پاکستان کے بعد کراچی کے پہلے سینما گھر جوبلی کا افتتاح ہوا اور اس سینما گھر میں ریلیز ہونے والی پہلی فلم واحق عذرا تھی جو پاکستان بننے سے قبل ہی تکمیل کے مراحل میں تھی۔

میرا وقت بچپن سے پچپن تک راولپنڈی میں گزرا۔ ہوش سنبھالا، تب راولپنڈی کو ایک چھوٹا سا خاموش اور کم ضم سا شہر پایا، جبکہ اسلام آباد تو بالکل ہی نوزائیدہ تھا، آبادی ایک سے ڈیڑھ لاکھ تھی، ان دونوں جڑواں شہروں میں 25 کے قریب روایتی سینما گھر تھے، جبکہ آج شاید ایک سینما گھر بھی متحرک حالت میں نہیں ہیں! سوچ رہا ہوں کہ ان سینماؤں پر بھی چند سطریں لکھ دوں۔

روز سینما فوارہ چوک، یہ سینما اب بھی موجود ہے جو بہت ہی پرانا ہے، بلکہ شاید یہ راولپنڈی کا سب سے قدیم سینما ہے، اس کا افتتاح 1926ء میں ہوا تھا۔

میرے والد بزرگوار محترم اباجی کا کہنا تھا کہ برصغیر کی پہلی بولتی فلم عالم آرا انہوں نے روز سینما فوارہ چوک پر دیکھی تھی، یہاں اردگرد ہول سیل منڈیاں ہونے کی بناء پر مزدور طبقہ، ریڑھی بان دل بہلانے کی خاطر اور کٹھن زندگی سے خوشی کے چند لمحات کشید کرنے آتے تھے۔ اب روز سینما میں فلموں کی نمائش نہیں ہوتی، اس سے ملحقہ سول اسپتال ہے جس کے ساتھ کشمیری بازار ہے جس کے شروع میں آمنے سامنے کتب و رسائل کے دو مشہور ہول سیلر تھے شمع بک ایجنسی اور راولپنڈی نیوز ایجنسی آخر الذکر کے مالک امانت ندیم تھے جن کے پاس سسپنس سرگزشت، جاسوسی اور پاکیزہ ڈائجسٹ کی ڈسٹری بیوشن تھی۔ امانت ندیم صاحب 1994ء میں وفات پا گئے!

شبستان سینما کمیٹی چوک گزشتہ برس گرا دیا گیا، یہ سینما ہمارا عشق، ہماری ثقافت اور راولپنڈی کی پہچان تھی، اس کے بالکل سامنے ہمارے اباجی کی لائبریری تھی اشرف لائبریری۔

ڈائجسٹوں اور عمران سیریز کا کرایہ ایک آنہ روزانہ ہوا کرتا تھا، بہتر سالہ پرانی کتابوں کا یہ شوروم الحمدللہ اب بھی پوری آب و تاب سے موجود ہے، مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میں نے شبستان سینما کو زیر تعمیر حالت میں دیکھا ہے کیونکہ یہ ہمارے سب سے زیادہ قریب تھا۔ کمیٹی محلہ سے کمیٹی چوک کتنا دور ہے، کمیٹی محلہ کے ایک چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں ہم رہتے تھے۔ شبستان سینما مری روڈ پر کمیٹی چوک میں تھا، شبستان سینما پر ہم نے سب سے زیادہ فلمیں دیکھیں تھی، اس پر فلم دیکھنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ چونکہ بچپن لڑکپن میں گھر سے فلم دیکھنے کی اجازت نہ ملتی تھی، اور اس زمانے میں تین چار گھنٹے گھر سے باہر رہنے کا مطلب صرف فلم دیکھنے جانا ہی ہوتا تھا، لہٰذا ہم شبستان پر فلم دیکھتے اور وقفہ ہوتے ہی بھاگ کر گھر

پہنچ جاتے۔ شکل دکھاتے، اماں فوراً ہمیں دودھ یا دھنیا یا ہلدی مرچیں لینے بھیج دیتیں، اور وہ سودا فٹافٹ لا کر دیا، اور پھر رفو چکر ہو کر سینما پہنچ جاتے۔ یوں گھر والوں کو فلم دیکھنے جانے کا شبہ تک نہ ہوتا، شبستان سینما، ایورنیو اسٹوڈیوز لاہور کی ملکیت تھا اس کے مالک آغا جی اے گل تھے، بعد ازاں آغا اعجاز گل یہاں کے انچارج ہوئے، میری یادداشت کے مطابق آغا اعجاز گل نے فلم میکنگ اور فلم کی تکنیک پر دو کتابیں بھی لکھیں اور چھپوائی تھیں۔ 7×5 سائز میں 80 گرام آفسٹ پیپر پر دیدہ زیب چھپائی سے مزین تھا۔ کافی عرصہ یہ کتابیں میرے پاس بھی تھیں پھر کسی جاننے والے نے خرد برد کر لیں، اس کتاب کی خوبی یہ تھی کہ ایک عرصہ تک میں شبستان سینما کی عقبی داخلے کے بعد بڑے ہال میں جہاں انتظامی آفس اور گیلری باکس میں جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں وہاں شیشوں میں لگی ہوتی تھیں جہاں آنے والی فلموں کے پوسٹرز آویزاں ہوتے تھے، بلکہ سب سے زیادہ اور خوبصورت تصاویر یا پوسٹرز کا ڈسپلے شبستان سینما میں ہی تھا جہاں ماضی کی شاندار اور کامیاب فلموں کی تصاویر بھی دیکھنے کو ملتیں۔ ستر اور اسی کی دہائی میں یہ اردو فلموں کا مین تھیٹر تھا، بعد ازاں نوے کی دہائی میں پنجابی فلمیں بھی یہاں لگتی رہیں۔

شبستان سینما، پاکستان میں پہلی رنگین اردو فلم نائلہ کے منافع سے بنایا گیا تھا، اس فلم کی رائٹر معروف مصنفہ رضیہ بٹ تھیں۔ انہی کے ناول نائلہ پر اسی نام سے فلم بنی تھی، نائلہ غالباً 1964ء میں بنی تھی اور راولپنڈی کے ناولٹی سینما موہن پورہ پر لگی تھی یہ اتنی کامیاب رہی کہ فلم ساز نے اتنا پیسا اکٹھا کر لیا کہ مین مری روڈ کمیٹی چوک پر ایک اور بہت بڑا سینما تعمیر کر لیا، کیا آج کسی خاتون مصنفہ کے قلم میں اتنی طاقت ہے کہ اس کی کہانی پر بنی فلم اتنا بزنس کرے؟ نہیں شاید ممکن ہی نہیں، نائلہ فلم ایورنیو پکچرز کی فلم تھی اور ایورنیو اسٹوڈیوز میں تیار کی گئی تھی۔

شبستان سینما کی تکمیل 1967ء میں ہوئی، افتتاح والے روز فلم انڈسٹری کی چیدہ چیدہ شخصیات مدعو تھیں۔ اس سینما میں جس پہلی فلم کی نمائش ہوئی اس کا نام چھوٹے صاحب تھا، جو مشرقی پاکستان میں تیار ہوئی تھی۔ ندیم اور شبانہ اس کے مرکزی کردار تھے۔ سینما اونر اعجاز گل صاحب نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ شبستان کا افتتاح منسٹر آف انفارمیشن شہاب الدین شہاب کے ہاتھوں ہوا تھا۔ شبستان کو لولی وڈ کی بہترین فلمیں ریلیز کرنے کا اعزاز حاصل ہے جن میں دل لگی، ہم دونوں، زندگی، پاکیزہ، اصول، گھونگھٹ، زرقا، اف یہ بیویاں، دعدہ، رنگیلا اور منور ظریف، یہ زمانہ اور ہے، بجن بے پرواہ۔

بجن بے پرواہ جس دن ریلیز ہوئی تھی اس دن پورے سینما کو جگمگاتی روشنیوں سے سجایا گیا تھا جس کی وجہ اس فلم میں ملکہ ترنم کی ایک قلندری دھمال تھی۔ بری امام کا مزار اسلام آباد میں ہے، اس زمانہ میں یہ دھمال ہر گھر ہر گاڑی ہر ہوٹل پر چل رہی تھی۔

گلستان سینما کمیٹی چوک چند برس قبل زمیں بوس کر کے یہاں پنڈی ہال بنا دیا گیا، گلستان کی تعمیر میرے سامنے ہوئی تھی، اس کی تعمیر 1975ء میں مکمل ہوئی تھی، اور یہاں پہلی فلم۔ ''سرحد کی گود میں'' چلی تھی، لیکن پہلے دن ہی سینما میں آتشزدگی ہو گئی تھی، جس پر کافی جدوجہد کے بعد قابو پایا گیا تھا، اس سینما کے مالک لیاقت خان خٹک تھے جو پی ٹی آئی کے دور حکومت میں وزیر اعلیٰ اور وزیر دفاع رہنے والے پرویز خٹک کے بھائی ہیں۔ گلستان سینما بھی انتہائی خوبصورت اور مین تھیٹر تھا، مری روڈ پر دو کلو میٹر کی حدود میں یعنی سات سینما ہاؤس تھے۔

کہکشاں سینما کمیٹی چوک اب یہاں کہکشاں شادی ہال ہے۔ یہ راولپنڈی کا سب سے آخری سینما تھا جو تعمیر ہوا لیکن ایک آدھ عشرہ ہی چل پایا اس پر پہلی فلم بسیرا لگی تھی ندیم اور بنگلہ دیشی اداکارہ شبانہ کی، جس کا ایک گانا بہت مشہور ہوا تھا۔

مجھے کیا پتا میری منزل کہاں
جہاں تیری مرضی تو لے چل وہاں

کہکشاں سینما کی ایک جدت یہ تھی کہ اس کے گراؤنڈ سے گیلری اور باکس پر جانے کے لیے سیڑھیاں نہ تھیں جیسا کہ ہر سینما میں ہوتی تھی بلکہ ایک کارپٹڈ گھومتا ہوا اسلوب راستہ اوپر جا رہا تھا۔

کہکشاں سینما کے ساتھ ایک المیہ بھی رہا یہاں شاید ایک سے زیادہ بار آگ بھی لگی تھی، اس سینما کی عقبی باؤنڈری وال سے بالکل ملحق قبرستان ہے! جو ڈھوک کھبا کا قبرستان کہلاتا ہے۔ توہم پرست اس آتش زنی کو قبرستان میں مدفون کسی بزرگ کی ناراضگی کا شاخسانہ قرار دیتے تھے۔

ریالٹو سینما مری روڈ یہاں میں نے سب سے پہلی فلم حاتم طائی دیکھی تھی۔ ہمارے ماموں سب بچوں کو لے کر گئے تھے، میری عمر اس وقت کوئی سات آٹھ برس ہوگی، ہمارے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا، اور انتہائی امیزنگ بات تھی، کلاسیک کردار حاتم طائی کی کہانی پر مشتمل یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ جادوئی فلم تھی، بہت مزہ آیا تھا، پھر یوں ہوا کہ اس بات کے

کوئی پانچ چھ سال بعد ایک روز جمعہ والے دن جمعہ کی نماز پڑھ کر میں اور میرا ایک دوست آئے تو میرے اباجی نے روک لیا، کہنے لگے کیوں بھئی ہم نے بھی فلم دیکھی ہے تم لوگوں نے سینما پر جا کر؟

یہ سوال غیر متوقع بھی تھا اور اُمید افزا بھی۔ ہمارے ابا جی بڑے ابا جان سے ذرا مختلف تھے اس لیے ہمارا حوصلہ بڑھا اور میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"نہیں اباجی کبھی نہیں دیکھی۔" میں نے صریحاً جھوٹ بولا اور میرے دوست نے بھی ہاں میں ہاں ملا کر جھوٹ کی عملی تصویر بنتے ہوئے پورے اعتماد سے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا حالانکہ ہم دونوں کئی بار سکول سے بھاگ کر کئی فلمیں پی اے ایف سینما میں دیکھ چکے تھے، لیکن معصوم اور مسکین صورتیں بنائے کھڑے تھے کہ اباجی نے جیب سے ایک روپیہ اور ایک اٹھنی نکالی اور میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس زمانے میں تھرڈ کلاس کا سب سے سستا ٹکٹ بارہ آنے کا ہوتا تھا۔

"جاؤ دونوں فلم دیکھ آؤ۔" اباجی شان بے نیازی سے بولے تو میں نے جھٹ کہہ دیا۔

"اباجی آٹھ آنے اور دیں نا۔"

"وہ کیوں؟" اباجی نے حیرت سے پوچھا۔

"اباجی بارہ بارہ آنے کے تو ٹکٹ آئیں گے اور آٹھ آنے کی ہم دونوں پئیں گے کالا کوکا کی!"

یہ سن کر اباجی مسکرائے اور کہنے لگے، اوئے تم تو کہہ رہے تھے کبھی سینما نہیں گئے، پھر تمہیں ٹکٹوں کا ریٹ اور بوتلوں کی قیمت کا کیسے پتا ہے، اور ہاں، بچو اس کا نام کالا کوکا نہیں، کوکا کولا ہے۔"

یہ بات سن کر ہم چپ ہو گئے ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

"یہ پکڑو آٹھ آنے اور آئندہ اجازت لیے بغیر کبھی فلم دیکھنے نہ جانا۔"

میں نے ان کا آخری نصیحت آموز جملہ سنا ان سنا کیا اور اٹھنی پکڑ لی، بگٹٹ بھاگے۔

ان دنوں فلم ثریا بھوپالی کے گیت خوب خوب مشہور تھے لہٰذا ہم سیدھے ریالٹو سینما پہنچے۔ مریڑ چوک سے ذرا پہلے اس جگہ کو ریالٹو چوک بھی کہا جاتا تھا ہمارے گھروں سے فاصلہ ایک ڈیڑھ میل تھا، جو اس عمر میں محسوس ہی نہ ہوتا تھا، ثریا بھوپالی میں رانی، شاہد، وحید مراد نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

تھا یقین کہ آئے گی یہ راتاں کبھی
تم سے ہووے گی ملاقاتاں کبھی
جس طرف آنکھ اٹھاؤں تیری تصویراں ہے
نہیں معلوم کہ خواباں ہے کہ تعبیراں ہے
ہم آئے نہ تمہارا پیار کی رسوائی میں
ہائے مر جاؤں کسی گوشہ تنہائی میں

موتی محل سینما مری روڈ پر بڑا ہی خوبصورت سینما تھا بلکہ ابھی تک موجود ہے۔ جب بھی یہاں سے گزر ہوتا ہے تو میں اس کی سمت بغور دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا، ان دو تین سیکنڈز میں ہی سارا ماضی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سب سے بڑی ذاتی پارکنگ موتی محل کی تھی۔ سب سے زیادہ نشستیں بھی موتی محل میں تھیں، گیارہ سو سے زیادہ۔ اس سینما کے مالک گوجر خان سے تعلق رکھنے والے ملک محبوب ہیں۔ موتی محل سینما بھی میری آنکھوں کے سامنے ہی تعمیر ہوا تھا۔ راولپنڈی کا سب سے زیادہ گنجائش والا سینما جس میں دو گیلریاں تھیں، اس کی خاص بات اس سینما کی یہ تھی کہ ایک تو پردہ اسکرین بڑی خوبصورت تھی جو فلم شروع ہونے سے قبل پردے بڑے دلکش انداز میں کھلتے تھے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر موتی محل سینما کے اندر انتہائی خوبصورت رنگین شیشوں والا گلوب تھا جو گھومتا رہتا تھا، جس پر ایک جانب سے سرچ لائٹ سے روشنی ڈالی جاتی تو سینما کے اندر دائرے میں رنگ برنگی روشنیاں چکراتی پھرتیں، یہ دل خوش کن مناظر فلم کے دوران کسی خاص المیہ گانے کے دوران دیکھنے میں آتے، میں نے سب سے پہلے یہ مناظر فلم بہارو پھول برساؤ کے گیت "یہ گھر میرا گلشن ہے گلشن کا خدا حافظ" کے دوران دیکھے تھے، (فلم بہارو پھول برساؤ سے متعلق حیرت انگیز تفصیلات ان شاء اللہ اگلی کسی قسط میں)

ایک اور خاص بات کہ اس فلم کے ابتدائی دنوں میں جب شائقین ٹکٹ خرید رہے ہوتے تھے یا فلم دیکھ کر باہر نکل رہے ہوتے تھے تو سینما کی چھت سے شائقین پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں برسائی جاتی تھیں۔ یہ منظر آنکھوں کو اتنا بھلا لگتا تھا کہ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی آنکھوں کے سامنے محسوس ہوتا ہے، یہ پھول کیوں اور کون پھینکتا تھا اس کا بھی سراغ لگا لیا ہے (یہ تفصیل بھی سرگزشت میں ان شاء اللہ)

ملنے والی معلومات کے مطابق موتی محل پر پہلی فلم وحید مراد اور نشو بیگم کی "جال" تھی جو کہ عید الفطر پر نومبر 1973 میں ریلیز ہوئی تھی۔ جس میں احمد رشدی رونا لیلیٰ کا ایک بڑا ہی پیارا نغمہ تھا۔

دل کی دھڑکن مدھم مدھم نظریں ملیں اور جھک جائیں
یہ رنگین سماں یہ موسم کاش یہیں پر رک جائیں

یہاں ریلیز ہونے والی معروف و کامیاب فلموں میں شمع بھی تھی۔

کسی مہرباں نے آکے میری زندگی بنادی
نہ گھر ہے کھلتا یوں زلفیں بکھیرے

اس کے علاوہ سہیلی، بنکاک کے چور، سوسائٹی صاحب جی اور شانی تھی۔

موتی محل سینما میں جو فلم مجھے بہت زیادہ پسند آئی وہ شانی ہے، برصغیر پاک و ہند کی پہلی سائنس فکشن فلم قرار پائی۔ یہ فلم جو 10 مارچ 1989ء کو لولی ووڈ سینما کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز فلم تھی جو نہایت کروفر سے ریلیز ہوئی، اس فلم کی خاص خوبی ایلین کا زمین پر آنا تھا، جو اس سے قبل لولی ووڈ میں کبھی نہ ہوا تھا۔ وبجول ایفیکٹس کے خاص اثرات سے لبریز فلم شانی ایک کامیاب ترین سائنس فکشن فلم تھی جس نے سات نگار فلم ایوارڈ حاصل کیے، یاد رہے کہ نگار پاکستان کا سب سے بڑا غیر سرکاری فلم ایوارڈ ہے۔

اس فلم میں ایک خلائی انسان خلائی گاڑی یعنی اڑن طشتری سے زمین پر اترتا ہے، لوبناس فلمز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے ہدایت کار سعید رضوی تھے، کہانی آغا نیر نے لکھی تھی، فلم کے ستاروں میں شامل تھے محمد علی، بابرہ شریف، نیر سلطانہ، آصف خان، جبکہ شانی کا مرکزی کردار ایک نئے اداکار شیری ملک نے ادا کیا تھا! اس فلم کی ایک اور اضافی انفرادیت یہ بھی تھی کہ اس فلم میں تقریباً کوئی گانا نہیں تھا۔

شادی کے ایک گیت کے چند کلپس کے علاوہ یہ تجربہ بھی لولی ووڈ میں پہلی بار ہوا تھا، اور اس کے بعد بھی ابھی تک دوسری بار نہیں کیا گیا! شانی کے پروڈیوسر ہدایت کار سعید رضوی کے والد رفیق رضوی ایک سینیئر ڈائریکٹر اور پروڈیوسر تھے جو پاکستان بننے سے قبل بمبئی فلم انڈسٹری میں بھی بے شمار فلمیں بنا چکے تھے۔ جن میں آواز، کوشش، وعدہ، الہ دین کا بیٹا، اور کار...ان وغیرہ شامل ہیں، تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور یہاں بھی منفرد نوعیت کی شاہکار فلمیں تخلیق کیں، جن میں 1957ء میں جذبہ حب الوطنی پر مشتمل فلم بیداری تھی جس کے مشہور گیت:

آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی
جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی
اور
اے قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان

اس کے بعد 1959ء میں بطور فلم ساز ہدایت کار فلم سویرا بنائی جس میں: ایس بی جان: کا امر گیت......

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے

1963ء میں انہوں نے فلم شرارت تخلیق کی جس میں مسعود رانا کی کھنکتی آواز میں ایک اور سدابہار نغمہ تھا جو آج تک کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

اے دل تجھے اب ان سے یہ کیسی شکایت ہے
وہ سامنے بیٹھے ہیں کافی یہ عنایت ہے

رفیق رضوی کی کئی اور فلمیں بھی تھیں جن میں میرے بچے میری آنکھیں اور پھر صبح ہوگی بھی تھیں۔

وحید مراد کی فلم سمندر بھی انہی کی تھی جس میں مقبول ترین گانا ساتھی...... تیرا میرا ساتھی ہے لہراتا سمندر بھی تھا۔ سمندر اداکارہ شبنم کی مغربی پاکستان میں پہلی فلم تھی۔

جناب رفیق رضوی کے بڑے بیٹے مسعود رضوی نے بھی 1969ء میں فلم گھر داماد بنائی تھی، جو فلم شانی کے کو پروڈیوسر تھے۔ مسعود رضوی اور سعید رضوی کے علاوہ ان کے ایک اور بیٹے مشہور وکیل بھی ہیں جن کا نام رشید احمد رضوی ہے۔ آپ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں، ڈرامائی سائنسی فلم شانی کو روس، کوریا اور مصر کے فلمی میلوں میں بھی خوب سراہا گیا اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شانی کو روسی زبان میں بھی ڈب کر کے روس میں نمائش کے لیے پیش کیا گیا! شانی کے بعد مزید سائنس فکشن فلمیں سرکٹا انسان اور طلسمی جزیرہ بھی اسی ادارے لوبناس کے بینر تلے بنائی گئیں!

لیکن ہم بات کر رہے ہیں راولپنڈی کے سینما گھروں کی۔ اس لیے واپس اسی طرف چلتے ہیں۔

سنگیت سینما مری روڈ، یہ سینما اداکار اعجاز درانی کا تھا، جو شاید فلم ہیر رانجھا کی کمائی سے تعمیر ہوا تھا۔ سنگیت سینما، جنگ، دی نیوز (جیو) بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا۔

ریالٹو اور سنگیت سینما آمنے سامنے تھے مگر درمیان میں نالہ لئی تھا، یہاں ہم نے پرکھ، ہیر رانجھا، شیر خان اور ان گنت فلمیں دیکھیں۔ سنگیت پر ایک بھارتی فلم نور جہاں ایک سال سے زیادہ عرصہ تک مسلسل نمائش پذیر رہی، عین اسی طرح فلم شیر خان بھی مسلسل ایک سال سے بھی زیادہ وقت تک سنگیت سینما پر لگی رہی۔ ہمارے پڑوس میں ایک ذوالفقار صاحب رہتے تھے، جو سنگیت سینما میں ٹکٹوں کی فروخت پر مامور تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ تھرڈ پارٹی کے طور پر کچھ دوستوں سے مل کر سینما پر فلم بھی خرید کر لگاتے تھے۔ اب عرصہ دراز سے سنگیت سینما کی جگہ پر شاپنگ مال سنگیت آرکیڈ زیر تعمیر ہے، نجانے کیوں مکمل نہیں ہو رہا، کوئی وجہ تو ہوگی!

ناز سینما مری روڈ، یہ سینما بھی اب ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ گولڈ مارکیٹ بن گئی ہے، لیکن اب بھی اس جگہ کو ناز سینما چوک ہی لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ ناز سینما پر میں نے پہلی فلم ندیم شبنم کی بھول دیکھی تھی، جبکہ آخری فلم ہدایت کار الطاف حسین کی رستم تے خان دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ بات بھی کم از کم تیس بتیس سال پرانی ہے، کہیں کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ پاکستان کے سابق صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے بھی ناز سینما میں آکر فلم دیکھی تھی!

نادر سینما سیٹلائٹ ٹاؤن بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا اس کے بعد یہاں شہنائی شادی ہال بنایا گیا اب وہ بھی ختم ہو کر نیا مال پلازا بن گیا ہے، یہاں ہمیشہ پرانی فلمیں ہی لگتی تھیں، نادر سینما سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے C یا ڈی بلاک میں واقع تھا معروف کمرشل سینٹر اور پارک بچوں کی دنیا کے سامنے اور سیٹلائیٹ ٹاؤن پوسٹ آفس کے ساتھ خوبصورت لوکیشن پر واقع تھا، یہ راولپنڈی کی معروف شخصیت نادر پرویز صاحب کا تھا۔

شاہین سینما چک لالہ کینٹ، یہ سینما کی نئی بلڈنگ سنہ 85 کے بعد تعمیر ہوئی تھی اس سے قبل ایک چھوٹا آڈیٹوریم تھا جسے پی اے ایف آڈیٹوریم کہا جاتا تھا، یہاں نئی فلم نہیں لگتی تھی قبل مین سینما سے اترنے کے بعد فلمیں یہاں آتی تھیں، اور ہر فلم کی نمائش صرف ایک ہفتہ کے لیے ہوتی تھی یہاں ٹکٹیں فری ٹکٹ ہوتی تھیں۔ انتہائی سستی، ایک دو روپے میں مل جاتی تھی ماضی بعید میں (سنہ 85 سے قبل تک) یہاں ہر اتوار کو صبح نو بجے صرف خواتین کے لیے شو ہوتا تھا، جو بارہ بجے سے قبل ہی ختم ہو جاتا تھا، تاکہ خواتین واپس گھروں میں پہنچ کر ہانڈی روٹی کا بندوست بھی کر سکیں، اس دن اردگرد کے محلوں کی خواتین صبح انتہائی سرعت سے گھروں کے کام کاج سے فراغت پا کر پی اے ایف سینما پہنچ جاتیں کیونکہ فلم ساڑھے نو بجے شروع ہو جاتی تھی!

کیپٹل سینما بینک روڈ صدر یہاں بہت کم فلمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا کیونکہ یہ ہمارے گھر سے دور بھی تھا اور آؤٹ آف دے بھی، وہ اس لحاظ سے کہ یہاں کوئی بس وغیرہ نہیں آتی تھی اور ہم سارے کنگلے دوست تھے، بڑی مشکل سے فلم کا ٹکٹ خریدتے تھے، رکشے ہمارے شہر میں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے ہر جانب موٹر ٹیکسی چلتی تھی وہ آٹھ نو روپے کرایہ مانگتے تھے۔

اوڈین سینما مال روڈ، صدر راولپنڈی اس سینما کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ اس کا پرانا نام لینس ڈاؤن تھا، یہاں عام طور پر صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، میں نے یہاں سب سے پہلے انگریزی ہارر فلم دی ایگزارسسٹ دیکھی تھی۔

رات کو آخری شو تھا، سخت سردی کا موسم تھا، بڑے بھائی اور ان کے دوست تھے ہم بھی ساتھ گھس گئے، اس وقت یہ اتنی ڈراؤنی فلم محسوس ہوئی کہ واپس گھر پہنچ کر ساری رات مارے خوف کے کانپتا رہا۔ جب تک اذان کی آوازیں سنائی نہ دیں، مجھے نیند نہیں آئی، ستر کے عشرے میں اوڈین سینما کے منیجر ہمارے محلے میں رہتے تھے ان کا نام نصیر خان تھا، بعد میں ایک آدھ بار انہوں نے ہمیں اوڈین میں مفت پاس دے کر فلم بھی دکھائی تھی۔

پلازا سینما مال روڈ (مین جی ٹی روڈ) صدر میں تھا۔ اس سینما کا متروک نام الفنسٹن تھا، یہاں بھی انگلش فلموں کا راج تھا اور ہم نے انگریزی فلمیں بہت ہی کم دیکھی ہیں پھر بھی مختلف وقتوں میں پانچ سات انگریزی فلمیں پلازا سینما میں دیکھی ہیں۔

تاہم یہاں اردو پنجابی فلمیں بھی سائڈ تھیٹر یا سیکنڈ رن میں چلتی تھیں، 1975ء میں فلم "دلہن ایک رات کی" یہاں بالکل نئی فلم کے طور پر ریلیز ہوئی تو پورے سات مہینوں تک کھڑکی توڑ رش لیتی رہی اور شاندار سلور جوبلی منائی، پلازا بھی نسبتاً بڑا سینما تھا، گیلری کی دو سو سیٹ سمیت کل ایک ہزار نشستوں پر مشتمل تھا۔

سیروز سینما حیدر روڈ صدر، یہ بھی صرف انگریزی فلموں کے لیے سمجھا جاتا تھا، اس سینما کا شمار ان سینماؤں میں ہوتا ہے جن میں زوال کے بعد جب اکثر سینما بند ہو چکے تھے تب بھی ایک طویل عرصے تک فلموں کی نمائش جاری رہی، نیز سیروز سینما کا ساؤنڈ سسٹم بھی باقی تمام سینماؤں سے بہترین تھا، اس کا اے سی اور ہیٹنگ سسٹم بھی کمال تھا سب سے زیادہ صاف ستھرا سینما بھی راولپنڈی میں یہی تھا، اس کے مالک جموں سے ہجرت کر کے آئے کوئی خورشید صاحب تھے۔ خورشید سینما راجا بازار ڈنگی کھوئی، اس کا پرانا نام پرکاش سینما تھا۔ یہ پشتو فلموں کے لیے مخصوص تھا، اس کا حال بھی بہت برا تھا اور اس کا

ہال اس سے بھی برا تھا، صفائی کا انتظام ناگفتہ بہ، جنہیں مکمل طور پر کھٹمل پھوٹ کا شکار تھیں لیکن اس پر بہت زیادہ رش ہوتا تھا، اس کی وجہ تو آپ جان ہی سکتے ہیں، یہاں ٹکٹ بہت کم دی جاتی تھی۔ ہاتھ پر مہر لگا کر پیسے پکڑ کر ہال میں دھکیل دیا جاتا تھا۔

نولٹی سینما موہن پورہ بھی صرف پشتو فلمیں ہی ریلیز کرتا تھا، یہاں بھی اصل فلم کے علاوہ ٹکٹیں چلائے جاتے تھے اس لیے سینما خوب رش لیتا تھا۔ جنہیں ٹوٹی ہوتی تھیں، لیکن بہت پہلے یہ مین تھیٹر ہوا کرتا تھا یہاں نائلہ جیسی آرٹ مووی نے سنہ 64 میں گولڈن جوبلی بزنس کیا تھا، نولٹی سینما کا پرانا نام نولٹی تا کیز تھا۔

نشاط سینما لیاقت روڈ، راولپنڈی کے بین الاقوامی سطح پر مشہور لیاقت باغ سے راجا بازار کی سمت صرف چار سو میٹر کے فاصلے پر آتا ہے، گزشتہ پچیس برسوں سے بند پڑا ہے۔ یہ تقسیم سے قبل کا سینما ہے۔ بلڈنگ ابھی تک جوں کی توں موجود ہے لیکن اب یہاں یقینا کوئی پلازا وغیرہ ہی بنے گا، یہ بھی بہت بڑا سینما تھا، ہزار سے زیادہ نشستیں تھیں اس کی، کسی زمانے میں یہاں سنتوش کمار، صبیحہ، درپن وغیرہ کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں لیکن گزشتہ پچاس برسوں میں میری یادداشت اور مختلف ذرائع کے مطابق یہاں دکھائی جانے والی مشہور فلموں میں سلطان راہی کی مولا جٹ، منور ظریف کی جیرا بلیڈ، الیاس کشمیری کی بشیرا ٹھگ، سدھیر اور روزینہ کی شہادت۔ ہدایت کار یونس ملک کی شیر خان، شعلے، کالیا، شریف بدمعاش، الٹی میٹم، ماما بھانجا وغیرہ شامل ہیں۔ افسوس کہ پاکستان بننے سے لے کر بہتر سال تک جس جگہ اہلِ راولپنڈی نسل در نسل نشاط سینما دیکھتے آئے ہیں، اب وہ نہ رہے گا، وہاں کچھ اور ہوگا۔

امپیریل سینما راجا بازار، اب یہاں موبائل الیکٹرونکس مارکیٹ ہے جو امپیریل مارکیٹ کہلاتی ہے۔ یہ روز سینما کے بالکل سامنے تھا اس کو میں نے چالو حالت میں شاید ہی دیکھا ہو کچھ یاد نہیں پڑتا، آج کی نسل اس جگہ کو امپیریل الیکٹرونکس مارکیٹ ہی کے نام سے پہچانتی ہے۔

تاج محل سینما نشتر صدر روڈ، عرصہ ہوا ختم ہو گیا، مگر میں نے یہاں فلموں کی نمائش ہوتے دیکھا ہے۔ اس وقت بھی یہ انتہائی خستہ حال تھا، میرے خیال کے مطابق تاج محل سنہ 77/75 میں ختم ہو گیا تھا لیکن اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔

ایک اور سینما تصویر محل۔ لال کرتی بازار میں تھا۔ یہ راولپنڈی کی پرانی گنجان اور مشہور آبادی ہے، یہ علاقہ بھی کینٹ میں آتا ہے، آرمی کا رہائشی علاقہ ہے۔ تصویر محل پر بھی اکثر اوقات سیکنڈ رن فلمیں ہی چلتیں، ہم بھی یہاں بہت سی فلموں سے محظوظ ہوئے، اس سینما کی عمارت جوں کی توں موجود ہے تاہم عرصہ سترہ اٹھارہ سالوں سے یہ بھی گرنے کے انتظار میں کھڑا ہے۔

عابد مجید روڈ پر آرا ے بازار میں گریزن سینما تھا یہاں شاید 83/1982 میں ہم نے دو تین فلمیں دیکھی تھیں۔ اس زمانے میں میرے ایک دوست کا سسرال وہاں تھا، اس دوست کی شادی کم سنی میں ہی انجام پا گئی تھی۔ ان دنوں اس کی زوجہ روٹھ کر میکے گئی ہوئی تھی، وہ بھی کبھار کسی نہ کسی بہانے سے اسے منانے کے لیے جاتا تھا۔

تب میرے پاس ایک سوزوکی 50cc موٹر سائیکل ہوا کرتی تھی۔

ہمارا تیسرا دوست بھی ساتھ ہو لیتا، ہم دوست کو اس کے سسرال چھوڑ کر خود گریزن سینما فلم دیکھنے چلے جاتے، واپسی پر دوست کو سسرال سے پک کر لیتے، یہ سلسلہ ایک آدھ مہینے چلا، اس دوران ہم نے بھی گریزن سینما پر تین چار فلمیں دیکھ لیں جن میں "آنکھوں آنکھوں میں" اور شبنم شاہد کی فلم "نظر کرم" وغیرہ شامل تھیں، اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی گریزن سینما نہ جانا ہوا!

قاسم سینما دھمیال کیمپ۔ یہ راولپنڈی کا وہ سینما ہے جہاں مجھے فلم دیکھنے کا کبھی نہ تو اتفاق ہوا ہے اور نہ میں نے کبھی یہ سینما دیکھا ہے، اتنا علم ضرور ہے کہ یہ قاسم ایوی ایشن بیس کے پاس ہے۔

ویسٹریج کینٹ ایریا نزد پشاور روڈ (جی ٹی روڈ) میں ریکس نامی سینما گھر بھی آباد تھا، یہ بھی سائیڈ سینما تھا۔ پرانی یا سیکنڈ رن والی فلمیں ہی یہاں نمائش پذیر ہوتیں!

راولپنڈی شہر سے نزدیک واہ کا علاقہ ہے یہاں بھی ایک سینما گھر تھا جس کا نام عسکر یہ سینما تھا، عسکر یہ سینما بھی اب موجود نہیں!

شاید کچھ اور بھی ہوں تاہم مجھے یہی یاد ہیں لیکن یہ تمام راولپنڈی کے سینما گھر بتائے گئے ہیں اسلام آباد کو راولپنڈی سے ملحق ہے دونوں جڑواں شہر ہیں تاہم انتظامی طور پر تقسیم ہیں۔

اسلام آباد اس وقت نیا نیا آباد ہو رہا تھا، جہاں نیف ڈیک سینما کے دو ہال تھے، جو کہ سرکاری تھے۔ نیف ڈیک ہال

یعنی نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن جو فلم و ثقافت کی اشاعت و ترویج کا ادارہ تھا یا ہے، لیکن یہ بھی باقی سرکاری اداروں کی ہی طرح کوئی کرامت نہ دکھا سکا الٹا جب سے نیف ڈیک بنا، فلمیں تنزلی کا شکار ہی ہوئیں، آخرکار نیف ڈیک سینما شدید مالی بحران کے باعث بند کر دیے گئے۔

نیف ڈیک سینما کے ہال نمبر ایک میں اردو پنجابی فلمیں دکھائی جاتیں، جبکہ نیف ڈیک ہال نمبر دو میں صرف انگریزی فلموں کا راج تھا برلب جناح ایونیو اسلام آباد یہ انتہائی خوبصورت دو پرشکوہ سینماز تھے اب ان کی عمارتیں اپنی بربادی پر نوحہ کناں کھڑی ہیں!

علاوہ ازیں میلوڈی سینما تھا آب پارہ سے تھوڑا آگے، ہالی ڈے ان ہوٹل کے ساتھ! یہ سینما بھی سرکاری ہی تھا، CDA یعنی کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے 1966ء میں تعمیر کیا، کچھ عرصہ اسے خود چلایا بعد ازاں لیز پر دے دیا، 2003ء تک تقریباً فعال تھا پھر چھ اکتوبر 2003ء کو ایک بپھرے ہوئے جلوس کے مشتعل ہجوم نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا، عین اس وقت جب میلوڈی سینما میں فلم جناح چل رہی تھی، فلم میں بھی آزادی کے وقت کے فسادات کے مناظر دکھائے جا رہے تھے، ادھر سینما گھر کو بھی نذر آتش کیا جا رہا تھا، شائقین سینما نے بھاگ کر بمشکل جان بچائی، پھر بھی سینما کے اندر سینما کے رات کا چوکیدار سو رہا تھا جتنی دیر میں اس کی آنکھ کھلی، وہ آگ کے شعلوں میں گھر چکا تھا، اس ہنگامہ آرائی میں واحد موت اس چوکیدار کی ہوئی تھی، جس کا وجود جل کر بھسم ہو گیا۔

اس کے بعد یہاں کبھی فلم نہ چلی تک، اب یہ جگہ میلوڈی مارکیٹ کے نام سے مشہور ہے!

اسلام آباد میں کل چار سینماز تھے چوتھا سینما تھا کوہسار یہ اسلام آباد کے سیکٹر G/7 میں تھا، درحقیقت کوہسار سینما کچھ اس طرح کی جگہ پر تھا جہاں کبھی بھی اس نے رش نہیں لیا، کم بزنس کی وجہ سے وہ تھوڑا ہی عرصہ چلا اور بند ہو گیا۔ تاہم اب یہ علاقہ کوہسار مارکیٹ کہلاتا ہے۔

اب یوں سمجھ لیں کہ اسلام آباد شاید دنیا کا واحد دارالحکومت ہے جہاں ایک عرصہ تک کوئی سینما گھر نہیں تھا، لیکن دورِ جدید میں جب ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کر دیا، اور روایتی سینما دم توڑنا شروع ہو گئے تو سینما کی نئی قسم سامنے آ گئی، چونکہ اب فلمیں بھی 35Mm یا 70mm کی ریل پر بننے کے بجائے ڈیجیٹل فارمیٹ میں بننا شروع ہو گئی ہیں،

فتی

جمع فتیان۔ اصلی معنی "نوجوان" کے ہیں۔ عربی میں اس کے کئی معنی ہو گئے ہیں۔ ایک مفہوم، جو اندلس میں رائج تھا، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہاں امیر یا اس کے گھرانے یا کسی صاحب اقتدار صاحب کے ملازم غلام (خواہ وہ خواجہ سرا ہوں یا نہ ہوں) غلمان کہلاتے تھے۔ اور وہ غلام جو شاہی محل میں کسی اعلیٰ منصب پر مامور ہوں انہیں فتی کہا جاتا تھا۔ امرا کے گھرانے کا پورا انتظام وہ اعلیٰ ملازموں یا اہلکاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اندلس کی تاریخ شاہد ہے کہ بعض غلام کو جو بالعموم یورپی اصل کے ہوتے تھے، آزاد کر کے معاشرتی نظام میں بڑے سے بڑے مرتبے دے دیے جاتے تھے۔ یہ غلام نمایاں سیاسی کردار ادا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے خود مختار ریاستیں قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مراتب میں اس ترقی کا نتیجہ لازمی طور پر عرب امیر گھرانے کے جھگڑوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور آپس میں مار دھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔

مرسلہ: نثار اختر، پشاور

لہٰذا سینما بھی بدل گئے۔ سینما گھر نے نئی اسمارٹ صورت میں جنم لے لیا ہے، پوری جدید دنیا میں یہ رواج چل رہا ہے کہ کسی شاپنگ مال کے آخری فلور پر سو دو سو نشستوں پر مبنی تین چار ہال بنا کر ان میں بیک وقت تین چار فلمیں چلائی جاتی ہیں۔

جناح پارک کچہری چوک راولپنڈی میں ملٹی پلیکس سینما ہیں جہاں چار اسکرینیں ہیں جن پر مختلف فلمیں چلتی ہیں۔

یادش بخیر جناح پارک راولپنڈی عین اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں قبل ازیں پنڈی جیل ہوتی تھی، اسی پنڈی جیل میں 1979ء کو سابق صدر اور سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔

مال روڈ سے ریلوے اسٹیشن جانے والی شاہراہ پر ایم ایچ اسپتال کے سامنے اوڈین سنی پلیکس سینما ہیں جہاں دو اسکرینیں ہیں جو شائقین فلم کے لیے دم غنیمت ہیں۔

بحریہ ٹاؤن فیز 4 راولپنڈی سوک سینٹر میں انتہائی خوبصورت سینما گھر بنایا گیا ہے جو اریبہ سینما کہلاتا ہے جہاں

ہال اس سے بھی برا تھا، صفائی کا انتظام ناگفتہ بہ، سیٹیں مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں لیکن اس پر بہت زیادہ رش ہوتا تھا، اس کی وجہ تو آپ جان ہی سکتے ہیں، یہاں ٹکٹ بہت کم دی جاتی تھی۔ ہاتھ پر مہر لگا کر پیسے پکڑ کر ہال میں دھکیل دیا جاتا تھا۔

نادلٹی سینما موہن پورہ بھی صرف پشتو فلمیں ہی ریلیز کرتا تھا، یہاں بھی اصل فلم کے علاوہ ٹکڑے چلائے جاتے تھے اس لیے سینما خوب رش لیتا تھا۔ سیٹیں ٹوٹی ہوئی تھیں، لیکن بہت پہلے یہ مین تھیٹر ہوا کرتا تھا یہاں ناٹک جیسی آرٹ موی نے سنہ 64 میں گولڈن جوبلی بزنس کیا تھا، نادلٹی سینما کا پرانا نام نادلٹی ناٹک تھا۔

نشاط سینما لیاقت روڈ، راولپنڈی کے بین الاقوامی سطح پر مشہور لیاقت باغ سے راجا بازار کی سمت صرف چار سو میٹر کے فاصلے پر آتا ہے، گزشتہ پچیس برسوں سے بند پڑا ہے۔ یہ تقسیم سے قبل کا سینما ہے۔ بلڈنگ ابھی تک جوں کی توں موجود ہے لیکن اب یہاں یقیناً کوئی پلازا وغیرہ ہی بنے گا، یہ بھی بہت بڑا سینما تھا، ہزار سے زیادہ نشستیں تھیں اس کی، کسی زمانے میں یہاں سنتوش کمار، صبیحہ، درپن وغیرہ کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں لیکن گزشتہ پچاس برسوں میں میری یادداشت اور مختلف ذرائع کے مطابق یہاں دکھائی جانے والی مشہور فلموں میں سلطان راہی کی مولا جٹ، منور ظریف کی جیرا بلیڈ، الیاس کشمیری کی بنارسی ٹھگ، سدھیر اور روزینہ کی شاہ۔ ہدایت کار یونس ملک کی شیر خان، شعلے، کالیا، شریف بدمعاش، الٹی میٹم، ماما بھانجا وغیرہ شامل ہیں۔ افسوس کہ پاکستان بننے سے لے کر پچھتر سال تک جس جگہ اہلِ راولپنڈی نسل در نسل نشاط سینما دیکھتے آئے ہیں، اب وہ نہ رہے گا، وہاں کچھ اور ہوگا۔

امپیریل سینما راجا بازار، اب یہاں موبائل الیکٹرونکس مارکیٹ ہے جو امپیریل مارکیٹ کہلاتی ہے۔ یہ روز سینما کے بالکل سامنے تھا اس کو میں نے چالو حالت میں شاید ہی دیکھا ہو کچھ یاد نہیں پڑتا، آج کی نسل اس جگہ کو امپیریل الیکٹرونکس مارکیٹ ہی کے نام سے پہچانتی ہے۔

تاج محل سینما نشی صدر روڈ، عرصہ ہوا ختم ہو گیا، مگر میں نے یہاں فلموں کی نمائش ہوتے دیکھا ہے۔ اس وقت بھی یہ انتہائی خستہ حال تھا، میرے خیال کے مطابق تاج محل سنہ 75/77 میں ختم ہو گیا تھا لیکن اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔

ایک اور سینما تصویر محل۔ لال کرتی بازار میں تھا۔ یہ راولپنڈی کی پرانی گنجان اور مشہور آبادی ہے، یہ علاقہ بھی کینٹ میں آتا ہے، آرمی کا رہائشی علاقہ ہے۔ تصویر محل پر بھی اکثر اوقات سیکنڈ رن فلمیں ہی چلتیں، ہم بھی یہاں بہت سی فلموں سے محظوظ ہوئے، اس سینما کی عمارت جوں کی توں موجود ہے تاہم عرصہ سترہ، اٹھارہ سالوں سے یہ بھی گرنے کے انتظار میں کھڑا ہے۔

عابد مجید روڈ پر آراے بازار میں گریژن سینما تھا یہاں شاید 1982/83 میں ہم نے دو تین فلمیں دیکھی تھیں۔ اس زمانے میں میرے ایک دوست کا سسرال وہاں تھا، اس دوست کی شادی کم سنی میں ہی انجام پا گئی تھی۔ ان دنوں اس کی زوجہ روٹھ کر میکے گئی ہوئی تھی، وہ بھی کبھار کسی نہ کسی بہانے سے اسے منانے کے لیے جاتا تھا۔

تب میرے پاس ایک سوزوکی 50cc موٹر سائیکل ہوا کرتی تھی۔

ہمارا تیسرا دوست بھی ساتھ ہو لیتا، ہم دوست کو اس کے سسرال چھوڑ کر خود گریژن سینما فلم دیکھنے چلے جاتے، واپسی پر دوست کو سسرال سے پک کر لیتے، یہ سلسلہ ایک آدھ مہینے چلا، اس دوران ہم نے بھی گریژن سینما پر تین چار فلمیں دیکھ لیں جن میں ''آنکھوں آنکھوں میں'' اور شبنم شاہد کی فلم ''نظرِ کرم'' وغیرہ شامل تھیں، اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی گریژن سینما نہ جانا ہوا!

قاسم سینما دھمیال کیمپ۔ یہ راولپنڈی کا وہ سینما ہے جہاں مجھے فلم دیکھنے کا کبھی نہ تو اتفاق ہوا ہے اور نہ میں نے کبھی یہ سینما دیکھا ہے، اتنا علم ضرور ہے کہ یہ قاسم ایوی ایشن بیس کے پاس ہے۔

ویسٹریج کینٹ ایریا نزد پشاور روڈ (جی ٹی روڈ) میں ریکس نامی سینما گھر بھی آباد تھا، یہ بھی سائیڈ سینما تھا۔ پرانی یا سیکنڈ رن والی فلمیں ہی یہاں نمائش پذیر ہوتیں!

راولپنڈی شہر سے نزدیک واہ کا علاقہ ہے یہاں بھی ایک سینما گھر تھا جس کا نام عسکریہ سینما تھا، عسکریہ سینما بھی اب موجود نہیں!

شاید کچھ اور بھی ہوں تاہم مجھے یہی یاد ہیں لیکن یہ تمام راولپنڈی کے سینما گھر بتائے گئے ہیں اسلام آباد کو راولپنڈی سے ملحق ہے دونوں جڑواں شہر ہیں تاہم انتظامی طور پر تقسیم ہیں۔

اسلام آباد اس وقت نیا نیا آباد ہو رہا تھا، جہاں نیف ڈیک سینما کے دو ہال تھے، جو کہ سرکاری تھے۔ نیف ڈیک ہال

یعنی نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن جو فلم و ثقافت کی اشاعت و ترویج کا ادارہ تھا یا ہے، لیکن یہ بھی باقی سرکاری اداروں کی ہی طرح کوئی کرامت نہ دکھا سکا الٹا جب سے نیف ڈیک بنا، فلمیں تنزلی کا شکار ہی ہوئیں، آخر کار نیف ڈیک سینما شدید مالی بحران کے باعث بند کر دیے گئے۔

نیف ڈیک سینما کے ہال نمبر ایک میں اردو پنجابی فلمیں دکھائی جاتیں، جبکہ نیف ڈیک ہال نمبر دو میں صرف انگریزی فلموں کا راج تھا برلب جناح ایونیو اسلام آباد یہ انتہائی خوبصورت و پرشکوہ سینما تھے اب ان کی عمارتیں اپنی بربادی پر نوحہ کناں کھڑی ہیں!

علاوہ ازیں میلوڈی سینما تھا آب پارہ سے تھوڑا آگے، ہالی ڈے ان ہوٹل کے ساتھ! یہ سینما بھی سرکاری ہی تھا، CDA یعنی کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے 1966ء میں تعمیر کیا، کچھ عرصہ اسے خود چلایا بعد ازاں لیز پر دے دیا، 2003ء تک تقریباً فعال تھا پھر چھ اکتوبر 2003ء کو ایک بپھرے ہوئے جلوس کے مشتعل ہجوم نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا، عین اس وقت جب میلوڈی سینما میں فلم جناح چل رہی تھی، فلم میں بھی آزادی کے وقت کے فسادات کے مناظر دکھائے جا رہے تھے، ادھر سینما گھر کو بھی نذرِ آتش کیا جا رہا تھا، شائقین سینما نے بھاگ کر بمشکل جان بچائی، پھر بھی سینما کے اندر سینما کے رات کا چوکیدار سو رہا تھا جتنی دیر میں اس کی آنکھ کھلی، وہ آگ کے شعلوں میں گھر چکا تھا، اس ہنگامہ آرائی میں واحد موت اس چوکیدار کی ہوئی تھی، جس کا وجود جل کر بھسم ہو گیا۔

اس کے بعد یہاں کبھی فلم نہ چل سکی، اب یہ جگہ میلوڈی مارکیٹ کے نام سے مشہور ہے!

اسلام آباد میں کل چار سینما تھے چوتھا سینما تھا کوہسار یہ اسلام آباد کے سیکٹر G/7 میں تھا، درحقیقت کوہسار سینما کچھ اس طرح کی جگہ پر تھا جہاں کبھی بھی اس نے رش نہیں لیا، کم بزنس کی وجہ سے وہ تھوڑا ہی عرصہ چلا اور بند ہو گیا۔ تاہم اب یہ علاقہ کوہسار مارکیٹ کہلاتا ہے۔

اب یوں سمجھ لیں کہ اسلام آباد شاید دنیا کا واحد دارالحکومت ہے جہاں ایک عرصہ تک کوئی سینما گھر نہیں تھا، لیکن دورِ جدید میں جب ٹیکنالوجی نے انقلاب برپا کر دیا، اور روایتی سینما دم توڑنا شروع ہو گئے تو سینما کی نئی قسم سامنے آ گئی، چونکہ اب فلمیں بھی 35Mm یا 70mm کی ریل پر بننے کے بجائے ڈیجیٹل فارمیٹ میں بننا شروع ہو گئی ہیں، لہٰذا سینما بھی بدل گئے۔ سینما گھر نے نئی اسمارٹ صورت میں جنم لے لیا ہے، پوری جدید دنیا میں یہ رواج پنپ رہا ہے کہ کسی شاپنگ مال کے آخری فلور پر سو دو سو نشستوں پر مبنی تین چار ہال بنا کر ان میں بیک وقت تین چار فلمیں چلائی جاتی ہیں۔

جناح پارک کچہری چوک راولپنڈی میں ملٹی پلیکس سینما ہیں جہاں چار اسکرینیں ہیں جن پر مختلف فلمیں چلتی ہیں۔

یاد رہے جناح پارک راولپنڈی عین اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں قبل ازیں پنڈی جیل ہوتی تھی، اسی پنڈی جیل میں 1979ء کو سابق صدر اور سابق وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔

مال روڈ سے ریلوے اسٹیشن جانے والی شاہراہ پر ایم ایچ اسپتال کے سامنے اوڈین سنی پلیکس سینما ہیں جہاں دو اسکرینیں ہیں جو شائقین فلم کے لیے دم غنیمت ہیں۔

بحریہ ٹاؤن فیز 4 راولپنڈی سوک سینٹر میں انتہائی خوبصورت سینما گھر بنایا گیا ہے جو اریبہ سینما کہلاتا ہے جہاں

فتی

جمع فتیان۔ اصلی معنی ''نوجوان'' کے ہیں۔ عربی میں اس کے کئی معنی ہو گئے ہیں۔ ایک مفہوم، جو اندلس میں رائج تھا، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہاں امیر یا اس کے گھرانے یا کسی صاحب اقتدار صاحب کے ملازم غلام (خواہ وہ خواجہ سرا ہوں یا نہ ہوں) غلمان کہلاتے تھے... اور وہ غلام جو شاہی محل میں کسی اعلیٰ منصب پر مامور ہوں انہیں فتی کہا جاتا تھا۔ امرا کے گھرانے کا پورا انتظام وہ اعلیٰ ملازموں یا اہلکاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اندلس کی تاریخ شاہد ہے کہ بعض غلام کو جو بالعموم یورپی اصل کے ہوتے تھے، آزاد کر کے معاشرتی نظام میں بڑے سے بڑے مرتبے دے دیے جاتے ہیں۔ یہ غلام نمایاں سیاسی کردار ادا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے خود مختار ریاستیں قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ مراتب میں اس ترقی کا نتیجہ لازمی طور پر عرب امیر گھرانے کے جھگڑوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور آپس میں مار دھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔

مرسلہ: نثار اختر، پشاور

چار بڑی اسکرینیں ہیں اور بیک وقت چار مختلف فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ وسیع وعریض اور دلکش سینما ہے لیکن سفید پوشوں کے لیے نہیں، مہنگی ٹکٹ ہے۔

ارینے سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر بحریہ ٹاؤن فیز 8 میں گارڈن سٹی جیسے انتہائی پوش اور مہنگی سوسائٹی میں سنی گولڈ سینما بنایا گیا ہے، اس کا ٹکٹ ہزار روپے سے بھی زیادہ ہے لیکن اس جیسا خوبصورت ہال شاید پورے پاکستان اور بعض بینی شاہدین کے مطابق پورے جنوبی ایشیا میں کہیں نہیں۔ یہاں بھی بیک وقت چار ہال ہیں اور چار مختلف فلمیں ایک وقت میں دکھائی جاتی ہیں اس سینما کا داخلی کوریڈور بہت وسیع وعریض ہے۔ ساؤنڈ سسٹم زبردست اور مثالی ہے، اس سینما کا گولڈ ہال تو آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے، اس کی نشستیں اتنی کھلی اور آرام دہ ہیں، جتنی پی آئی اے میں بھی نہیں، پوری کی پوری نشست پیچھے کی جانب اتنا جھک جاتی ہے کہ آدمی مکمل لیٹ کر بھی پوری فلم دیکھ سکتا ہے۔ سنی گولڈ میں خال خال ہی لولی ووڈ فلم لگتی ہے یہاں عام طور پر ہالی ووڈ فلموں کا راج ہے، ٹاپ گن، جراسک ورلڈ وغیرہ وغیرہ۔

بلیو ایریا اسلام آباد میں پرشکوہ سینٹورس مال کے دو عظیم الشان ٹاور اسلام آباد کی شان بڑھاتے نظر آتے ہیں شاید اس کے چھٹے فلور پر سینما ہال قائم ہیں، سینٹورس میں بھی چار کے لگ بھگ ہال ہیں۔

لاہور سے راولپنڈی آتے ہوئے ٹی چوک سے ذرا آگے DHA (ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی) فیز 2 اسلام آباد گیگا مال میں برلب جی ٹی روڈ اسلام آباد میں بھی سنی پیلکس سینما ہیں جو جکرانڈا کلب میں ہیں۔

صفا گولڈ مال سنی پیکس Cinepax ہال موجود ہیں۔

اسلام آباد کلب سینما بھی ہے، اسلام آباد کلب راولپنڈی سے اسلام آباد جاتے ہوئے راول ڈیم چوک سے چند سو میٹر آگے ہیں۔

گزشتہ سال کورونا کووڈ کے دنوں میں ایف 9 پارک اسلام آباد کے اندر ایک ڈرائیو ان سینما بنایا گیا تھا، بہت بڑی اسکرین پر بالکل نئی فلم چلتی۔ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے ٹکٹ خریدتے اور گاڑیوں میں بیٹھے بٹھائے ہال یعنی گراونڈ میں پہنچ جاتے، سامنے اسکرین نصب تھی ایک ڈیوائس کے ذریعہ آپ کی گاڑی کے اسپیکرز فلم سے کنکٹ ہوجاتے تو لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں آواز گاڑی کے اسپیکروں سے سنتے اور فلم سامنے نصب بڑی اسکرین پر دیکھتے۔

گو سینما کا بنیادی مقصد فلم دکھانا ہوتا ہے، اور بظاہر ہر جگہ نظر آتا ہے کہ فلم دکھائی جارہی ہے، لیکن کچھ گڑبڑ تو ضرور ہے ماضی میں ہمیں راولپنڈی میں ہر جگہ ہر خاستے میں بڑے بڑے سینماز دکھائی دیتے تھے ان کی تعداد بھی لاتعداد تھی چھوٹے چھوٹے بجٹ کی مختلف الموضوعات فلمیں لاکھوں کے بجٹ سے تیار ہوتیں اور پروڈیوسرز کی جھولیاں کروڑوں سے بھردیتیں۔

انڈین فلمیں بھی نہ ہوتیں تھیں، صرف اردو پنجابی اور پشتو فلمیں ہی پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے 700 سے زیادہ سینما گھروں کو شائقین فلم سے کھچا کھچ بھرا رکھتیں۔ ہر سینما تین شو روزانہ کرتا تھا لیکن رش کھڑکی توڑ ہوتی جس کی وجہ سے ہر سینما اتوار والے دن صبح گیارہ بجے اسپیشل شو چلانے پر مجبور ہوتا، بلکہ بعض سینما اتوار کو پانچ شو بھی چلاتے تھے۔ مارننگ شو صبح ساڑھے نو بجے ہوتا۔ اسپیشل شو ساڑھے گیارہ بجے، ساڑھے تین بجے میٹنی شو ساڑھے چھ بجے پہلا شو اور دوسرا شو رات ساڑھے نو دس بجے شروع ہو پاتا۔

لیکن کچھ سمجھ نہیں آتی کہ موجودہ دور میں جب کہ پورے پاکستان میں ڈیجیٹل اسکرینوں اور سینماز کی مجموعی تعداد سو سے بھی کم ہے تو بولی ووڈ ہالی ووڈ اور لولی ووڈ مل کر بھی یہ دو دو سو پیلس کے انگلیوں کی پوروں پر گنے جانے والے سینماز بھرنے میں کیوں ناکامیاب ہیں؟

روایتی سینما گھروں اور موجودہ تھری ڈی ڈیجیٹل سینما میں جو فرق میں نے محسوس کیا ہے وہ یہ ہے کہ روایتی سینما غریب امیر دونوں کے لیے تھا، جب کہ سینما کی موجودہ شکل صرف امیر لوگوں کے واسطے ہے۔ غریب یا سفید پوشوں کا اس سینما نگری سے کوئی علاقہ نہیں، ظاہر ہے فی کس تقریباً ہزار روپے کی فلم فی زمانہ کوئی سفید پوش متحمل نہیں ہوسکتا۔

مزید براں پہلے فلم لاہور میں بنتی تھی، اور شاندار بنتی تھی لاہور والے اب فلم بنانے کی تکنیک بھول چکے ہیں، اور کراچی والوں کو سینما اور ڈرامے کے درمیان کا فرق معلوم نہ ہوسکا ہے، کروڑوں کے بجٹ کے باوجود وہ فلمی تکنیک کی بجائے ڈرامے سے قریب فلمیں بنا رہے ہیں۔ لاہور والوں نے اچھی بھلی فلموں کا ستیاناس کردیا ہے کیونکہ پرانے لاہور والے ڈائریکٹر یا رہے نہیں یا کام چھوڑ کر جارہے ہیں۔ ان کی جگہ خون خرابے کو اولیت دی جارہی ہے جس کی وجہ سے.... ایک بڑا طبقہ فلم بینی سے توبہ کرچکا ہے۔

وادی موت

فرزانہ نکہت

وہ ایک پُراسرار وادی تھی جہاں کی زمین میں سونے کی کان تھی لیکن وہاں جانے والا زندہ واپس نہیں آتا تھا پھر بھی وہ اس وادی میں گیا۔

ایک ایسے میدان کا ذکر جہاں موت کھڑی تھی
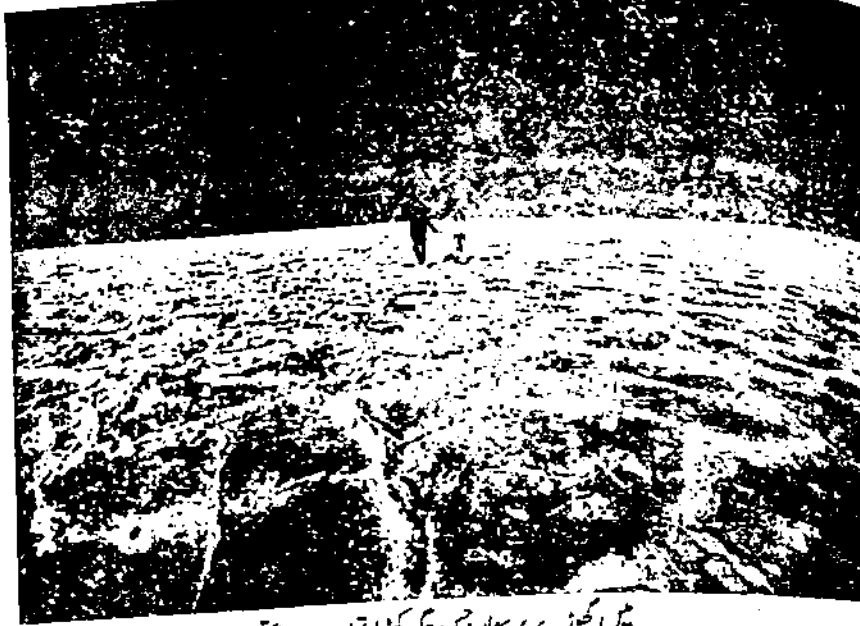
میں گھوڑے پر سوار جس جگہ کھڑا تھا وہ دو ریاستی سرحدوں سے چند میل کی دوری پر تھی۔ ایک سرحد نیو میکسیکو کو ٹیکساس سے جدا کرتی تھی اور دوسری اولڈ میکسیکو کو ریاست ہائے متحدہ امریکا سے۔

رات ہونے کے چار پانچ گھنٹے بعد میں نے اپنے آگے روشنیاں دیکھیں پھر میں ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوگیا۔ پہلے پہل میرا خیال تھا کہ شاید میں ریاست ہائے متحدہ سے نکل کر میکسیکو میں داخل ہوچکا ہوں لیکن جب میں نے ایک راہگیر سے اس جگہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ میں اس وقت لاس کروز میں پہنچا ہوا ہوں یعنی میں سرحد پار کر کے نیو میکسیکو میں پہنچ چکا تھا۔

میں ایک گھنٹے تک قصبے کے گلی کوچوں میں گھوڑا دوڑاتا

رہا۔ مسلسل سفر کرتا رہا تھا اس لیے آرام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ صبح طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے میں ایک کھلے میدان میں داخل ہوگیا اور ایک گھنے پیڑ تلے لیٹ گیا ایک گھنٹے تک سویا رہا۔

جب میں بیدار ہوا تو مسلسل گھڑ سواری کے سبب میرا جسم شدید درد کر رہا تھا۔ پھر میں بھی گھوڑے پر سوار ہوگیا اور اپنی راہ چل پڑا۔ پندرہ دنوں تک میں گھوڑے پر سوار اپنا راستہ طے کرتا رہا پھر میں نے گھوڑے کو فروخت کردیا اور پاپیادہ آگے روانہ ہوگیا۔ میری منزل کیلی فورنیا تھی۔

نیواڈا کے قریب میں نے کیلی فورنیا کی سرحد عبور کی اور موجیوی نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچا۔ یہ انتہائی پسماندہ سا گاؤں تھا جس میں ایک سیلون بھی تھا۔ مجھے مسلسل سفر کی تھکن اتارنے اور سستانے کے لیے وہ جگہ بے حد غنیمت معلوم ہوئی۔ میں اندر چلا گیا اور اپنے گلے سے ریت صاف کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے تین جام بیئر کے چڑھا گیا۔

ابھی میں چوتھے کا آرڈر دینے ہی والا تھا کہ میرے پیچھے بیٹھے لمبے چوڑے سے کھردرے چہرے والے آدمی نے جس نے چوڑے چھجے والا میکسیکن ہیٹ پہن رکھا تھا۔ زور سے میز پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ”ابھی میری باری ہے اجنبی!“

میں نے متحیرانہ اس کی طرف دیکھا پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“

اس نے اپنے لیے بیئر کا آرڈر دیا۔ پھر میں نے۔ ہم دونوں اکٹھے پینے لگے۔

”تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ یوں کہو تم نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کیے رکھی۔“ اس نے کہا۔

”اچھا؟ تم نے کوئی اندازہ قائم کیا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور میرے میلے کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔

”ہاں یہ کہ تم بحالتِ مجبوری سفر کررہے ہو۔ صحت اور مسرت کے حصول کے لیے نہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے، لیکن صحت اور مسرت کے بارے میں باتیں کرکے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟“

اس نے یہ سوال نظر انداز کردیا۔

”تم نے کیا کبھی گھوڑے پکڑے ہیں؟“

”بہت کم.....“ میں نے گزرے دن یاد کرتے ہوئے پوری سچائی سے جواب دیا۔

”کبھی خچروں کے ساتھ کام کیا ہے؟“

”ہاں---“ میں نے آدھا سچ بولا۔

اس میکسیکن ہیٹ والے نے اپنا تیسرا سوال جڑا۔

”کوئی ملازمت پسند ہے؟“

”معاوضہ کیا ہوگا؟“

”چالیس فی ہفتہ۔“

”یہ اچھی تنخواہ ہے۔ ہاں کام کیا ہے؟ کیا بوڑھی عورتوں کی دیکھ بھال؟“

”نہیں..... موت کی وادی میں سونے کی تلاش۔“

مجھے اس وادی کا علم تھا۔ میں نے الاسکا کے پرانے مہم جوؤں کو اس موت کی وادی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہاں واقعی سونا موجود ہے لیکن اس جگہ پہنچنا انتہائی خطرناک تھا۔ وہاں قدم قدم پر موت گھات میں بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ وادی ہر چند کہ چھوٹی سی تھی لیکن اس میں غائب ہوجانا بالکل آسان تھا اور ایسا اس سبب ہوتا تھا کہ وہاں ایسی ہوا چلتی تھی جو ریت اڑا اڑا کر ایک دو گھنٹے میں اس جگہ کو ایسا بگاڑ کر رکھ دیتی تھی کہ اسے پہچاننا مشکل ہوجاتا تھا بلکہ ناممکن۔ یہ تمام راہنما نشانات وعلامات مٹا دیتی تھی۔ نئی ہڈیاں دفن کردیتی تھی اور ان کی پرانی ہڈیاں باہر نکال پھینکتی تھی جو سونے کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کچھ ہی دیر میں وہاں پرانے راہنما نشانات اور علامات کی جگہ ایسے نئے راہنما نشانات اور راستے بن جاتے تھے جو سونے کی تلاش میں وہاں پہنچنے والوں کو سونے کی کان تک لے جاتے تھے لیکن انہیں اپنی کامیابی کا جشن منانے کے بعد واپسی کا راستہ نہ ملتا تھا اور انہیں کبھی اس جگہ سے باہر نکلنا نصیب نہ ہوتا تھا۔

یہ تھی وہ جگہ جہاں وہ اجنبی مجھے بیکاری کا علاج کرنے کی کوشش کی ترغیب دے رہا تھا اور سچی بات تھی کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”موت کی وادی..... یہی کہا ہے تھا تم نے؟ شاید یہاں علاقوں کے کہیں قریب ہی واقع ہے؟“

”اس جگہ سے جہاں تم اس وقت موجود ہو ایک یا دو میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”اگر تم سڑک پر کچھ دور تک چلو تو تمہیں پہاڑیوں میں ایک شگاف دکھائی دے گا جو اس وادی میں جا نکلتا ہے۔ یہ جگہ اس وادی کی قریب ترین آباد جگہ ہے اور سنو! وہاں سونا موجود ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں آنکھیں بند کرکے اس تک پہنچ سکتا ہوں۔“

اس طرح کی بات میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔

”اگر واقعی ایسا ہی ہے تو تم کسی اور کو یہ مہم سر کرنے کا کام کیوں نہیں سونپ دیتے، اگر تم نے اس کی کان اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فیصلہ کررکھا ہے؟ مزید برآں تم نے مجھے ہی کیوں ایسے خوش قسمت شخص کی حیثیت سے منتخب کیا ہے؟“

”میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ موت کی وادی کی آب وہوا اتنی بری ہے کہ وہاں محفوظ ترین جو کرنے کی چیز ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صرف دو ہفتوں کے لیے اندر جائیں اپنا کام کریں پھر باہر نکل آئیں۔ ہمیں لازمی طور پر اپنے اور خچروں کے لیے کافی مقدار میں پانی بھی اپنے ہمراہ لے جانا چاہیے۔ اچھا کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا کیسا اچھا معاوضہ دے رہا ہوں۔ ان دو ہفتوں میں میں دوہری مقدار میں سونا لاسکوں گا۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ تم نے آخر میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟“

”کیونکہ تم بالکل ٹھیک وقت پر یہاں پہنچے ہو اور تم ایک ایسے شخص دکھائی دیتے ہو جو ہر قسم کے خطرات سے نمٹنا جانتے ہو۔ میں ہفتہ بھر سے یہاں اپنے ایک پرانے ساتھی کے آنے کا انتظار کررہا تھا۔ مگر وہ اب تک نہیں آیا اور اب میں اس کا مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ ہاں چل رہے ہو میرے ساتھ؟“

”چل رہا ہوں.....“ میں نے جواب دیا۔

اس میکسیکن ہیٹ والے آدمی نے جس کا نام چینی تھا۔ (میں اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جان پایا تھا) کے پاس اس مہم کے لیے خچر اور باقی سب لوازمات تیار تھے چنانچہ ہم اگلے دن مہم پر روانہ ہوگئے۔

جب ہم اس وادی میں پہنچے تو وہ مجھے کوئی ایسی بری جگہ نہ معلوم ہوئی۔ یہ صحرائے موجاوی کے دوسرے حصوں سے زیادہ گرم نہیں تھی اور درحقیقت یہ صحرا کے دوسرے حصوں ہی کی طرح تھی۔ اونچے نیچے ٹیلے، گرمی، ریتیلے بگولے، یہ سب وہاں بھی دیکھنے میں آرہے تھے۔ چینی ایک ایسے آدمی جیسا کردار ادا کررہا تھا جو ہر چیز کا علم رکھتا ہو۔ جب ہم وادی میں داخل ہوئے تو ہم ناک کی سیدھ میں آگے بڑھتے رہے۔ پورے دن ہم بڑی مستقل مزاجی سے سفر طے کررہے تھے۔ پھر چینی نے اپنے خچر پر سے کمبل اتارا اور اسے ریت پر بچھا دیا۔

”یہ ہے وہ جگہ۔ ہم یہاں پڑاؤ ڈالیں گے۔“ اس نے کہا۔

وہ اس جگہ کو کیسے جانتا تھا میں یہ اندازہ نہ لگا سکا۔ ہمارے چاروں طرف سوائے ریت کے کچھ نہ دکھائی دے رہا

بشیشور پرشاد منور نے بہت سی مذہبی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں، یہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتی ہیں، جوش صاحب مذاہب سے بیزار ہیں اور انہیں انسانی پس ماندگی کا مظہر سمجھتے ہیں، اور منور صاحب سے ان کی بے تکلفی بھی ہے، اس لیے کہنے لگے۔

”منور صاحب! ہم تو مرنے کے بعد سیدھے دوزخ میں جائیں گے لیکن آپ کو بڑی کشمکش کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ رشی یا اوتار ایک طرف کھینچے گا اور کوئی ولی یا نبی دوسری طرف۔“

تھا اور وہاں کسی قسم کے راہنما نشانات بھی موجود نہ تھے۔ نہ ہم میرا خیال تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ مجھے اپنا معاوضہ بہر طور مل جانا تھا اس لیے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ آیا اسے سونا مل جائے گا یا نہیں۔

اگلے دن ہم نے کھدائی شروع کی۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ ہم آخر اپنے ساتھ پھاوڑے کیوں لائے تھے جبکہ نرم ریت میں کھدائی کرنے کے لیے صرف بیلچے ہی کافی تھے۔

ہم نے کافی گہرائی تک کھدائی کرلی۔ پھر تیز ہوا چلنی شروع ہوگئی۔ اس کے چلنے کے چند ہی سیکنڈ کے اندر ہم ریت کے طوفان میں گھر چکے تھے اور ایک ہی گھنٹے میں ہم نے جو اتنی محنت ومشقت سے گڑھا کھودا تھا وہ مکمل طور پر ریت سے بھر چکا تھا۔

جب تک یہ طوفان جاری رہا ہم اپنے خیمے میں اوندھے منہ لیٹے رہے۔ ہم نے اپنے خچر اچھی طرح سے باندھ دیے تھے اس کے علاوہ اور ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر جب ہم خیمے سے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر میرے منہ سے ایک کراہ سی نکل گئی کہ ہمارے کھودے ہوئے گڑھے کی جگہ ریت کا بلند ڈھیر لگا ہوا تھا لیکن چینی ذرا بھی پریشان نہ دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں.....“ وہ بشاشت سے بولا۔ ”اس موت کی وادی میں ایسا ہونا عام بات ہے۔ آؤ ہم ازسرِنو کھدائی کریں۔“

چنانچہ ہم پھر کر ہمت کس کر کھدائی کے کام میں جٹ گئے۔ ہم نے پہلے والے گڑھے سے دوگنا گہرا گڑھا کھود لیا۔ لیکن دو ہفتے کی مسلسل کھدائی کے باوجود ہمیں سونے کی کوئی جھلک نہ دکھائی دی لیکن چینی کو یقین تھا کہ ہم جلد یا بدیر اسے پا ہی لیں گے۔ مجھے اب چینی کے خوشدلانہ رویے سے کچھ بے

چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ عجیب ہی آدمی تھا! خواہ کچھ بھی ہوجاتا! اس کے رویے میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

لیکن مجھے کچھ دوسری چیزیں بھی پریشان کرنے لگی تھیں۔ ایک تو گرمی تھی جو بعض اوقات ایک سو میں ڈگری سے بھی بڑھ جاتی تھی اور بامشکل ایک سو ڈگری پہ نیچے آتی تھی پھر میرے جسم پر اب پھنسیاں نکلنی شروع ہوگئی تھیں جن سے عجیب بھورے رنگ کا مواد خارج ہونے لگا تھا۔ ان کی تکلیف مجھے ہر دم بے چین رکھنے لگی تھی۔ چنی نے بتایا کہ یہ اس باسی پانی کے پینے کا نتیجہ تھا جو ہم وادی سے باہر اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس میں زہریلے کیڑے نہیں تھے لیکن سبز پشت والی جوئیں ضرور تھیں جنھوں نے میرے جسم کو اپنی شکارگاہ سمجھ لیا تھا۔ یہ نفرت انگیز مخلوق عام جوؤں کے مقابلے میں زیادہ بڑی اور بھری ہوئی ہیں۔ ان میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہیں۔ سیاہ سطح پر یہ اپنے اوپر سیاہ رنگ چڑھا لیتی ہے اور انسانی جلد پر یہ ہلکا سبز رنگ اختیار کرلیتی ہے۔

پہلے پہل میرا خیال تھا اس وادی میں ہمارا قیام دو ہفتے سے زیادہ نہ ہوگا لیکن اب مجھے کچھ فکر ہونے لگی۔

گیارہویں دن دوسرا ریتیلا طوفان آگیا۔ اس نے مجھے قریب قریب ختم ہی کرڈالا۔ ایک خچر کھل گیا اور پڑاؤ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اس کے تعاقب میں لپک پڑا۔ وہ مجھ سے بھی پچاس گز دور تھا کہ ریتیلی ہوا چلنا شروع ہوگئی۔ خچر بگٹٹ دوڑتا ہوا ریت کی چادر میں جاکر غائب ہوگیا۔ میں نے اسے جانے دیا اور پڑاؤ کی طرف واپس آنے لگا۔ ریت کی چادر دبیز سے دبیز تر ہوتی جارہی تھی اور میرے خوف اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میں نے ابھی دس گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ میری نظروں کے سامنے ریت کی دبیز چادر تن گئی اور پڑاؤ میری نظروں سے غائب ہوگیا اور مجھے ریتیلی چادر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے اور یہ اندازہ قائم کرتے ہوئے کہ پڑاؤ کس سمت واقع ہوگا اس سمت آگے بڑھنے لگا۔ میرے خیال میں پڑاؤ دو سو گز کی دوری پر تھا۔ اتنا فاصلہ طے کرکے میں اس تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اپنے قدم گنتے ہوئے بڑے محتاط انداز سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ گنتے گنتے میں بالآخر دو سو تک آ ہی گیا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے ریت کے۔ شاید پڑاؤ اس جگہ سے مزید دو سو گز کی دوری پر تھا۔ میں نے پھر چلنا شروع کیا لیکن اس بار بھی وہی نتیجہ نکلا۔ میں نے پھر دو سو گز کا فاصلہ طے کیا اور وہی نتیجہ نکلا۔ اب میں خوف زدہ ہونے لگا تھا۔ ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔

میرے قدموں میں، میری آنکھوں میں، میرے منہ میں، ہوا میں۔ میرا دماغ چل گیا۔ میں نیم اندھا سر جھکائے دوڑتے ہوئے چکر لگانے اور پاگلوں کی طرح چنی کو پکارنے لگا۔

ریتیلا طوفان دو گھنٹے یا اس سے زائد عرصے تک برپا رہا۔ جب یہ ختم ہوا تو میں اندھا بہرہ اور سکتہ زدہ سا ہوچکا تھا۔ میں نے بڑی حیرت سے اپنے چاروں طرف ریت سے پاک صاف فضا کو دیکھا۔ ہاں میں دیکھ سکتا تھا۔ میں شفاف نیلے آسمان اور اپنے آس پاس بکھرے ریت کے ساکن ٹیلوں کو دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے پڑاؤ کا کہیں بھی نام ونشان نہ دکھائی دیا۔ میں راستہ بھٹک چکا تھا اور میں یہ بخوبی جانتا تھا۔ مجھے ایک نئے خوف نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میری زبان خشک چمڑا بن چکی تھی اور پانی کو ترس رہی تھی۔

میں نے چلنا شروع کیا۔ سورج غروب ہونے تک میں مسلسل چلتا رہا اور پھر تمام رات بھی۔ لیکن صبح ہونے پر بھی مجھے اپنے آس پاس ریت کے ٹیلوں کے لامتناہی سلسلوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔ میں چلتا رہا۔ مجھے پیاس کی شدت بے حال کیے دے رہی تھی۔ چلتے چلتے میں دو بار لڑکھڑا کر گرا۔ تیسری دفعہ جب میں گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔

پھر مجھے اپنی سوکھی ہوئی زبان پر ٹھنڈے میٹھے پانی کے قطرات ٹپکائے جانے کا احساس ہوا۔ ان قطرات نے مجھے گویا حیات نو عطا کردی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور ایک بھوری داڑھی والے شخص کو اپنے اوپر جھکے دیکھا۔ میں وفور مسرت سے چلا اٹھا۔

''چنی! یہ تم ہو!''

لیکن وہ چنی نہیں تھا۔

''دھیرج دوست دھیرج......'' اس اجنبی نے کہا۔ ''تمہیں اس ریت کے گڑھے سے نکالنے میں تھوڑی ہی دیر لگے گی۔''

میں نے آنکھیں بند کرلیں پھر شاید میں بے ہوش ہوگیا یا شاید میں سوگیا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو بستر پر پڑے پایا۔ کیا بستر تھا! ایسا نرم ایسا آرامدہ کہ میں پھر سوگیا۔

اس وقت میں موجادی گاؤں کے اس سیلون میں موجود تھا۔ ایک پرانے تجربہ کار مہم جو نے جو موت کی وادی میں پہنچا ہوا تھا۔ مجھے وہاں ایک ریت کے گڑھے میں بے ہوش پڑے پایا تھا اور مجھے وہاں سے نکال لیا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں خوش قسمت تھا جو کہ موت کے منہ میں جانے سے بچ نکلا تھا اور

وہ شخص بھی جو مجھے وہاں سے نکال لایا تھا۔

وہ شخص کون تھا؟ میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھے موت کی وادی سے نکال کر اس سیلون میں لے آیا تھا اور خود یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا کہ وہ موت کی وادی سے جتنا دور چلا جائے بہتر ہے۔ مجھے اس پر بے حد افسوس ہوا تھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا اور اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہ دیا تھا۔

سیلون میں میری خوب اچھی طرح سے دیکھ بھال کی گئی۔ میں نے جب سیلون کے مالک سے کہا کہ میں اپنی گزراوقات کے لیے وہاں بار میں کام کرنا چاہتا ہوں تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔ چند دنوں بعد جب میری صحت پوری طرح بحال ہوگئی تو میں نے اپنا کام سنبھال لیا۔ اس تمام عرصے کے دوران مجھے برابر چنی کا خیال آتا رہا۔ میں نے سیلون کے مالک سے کہا کہ میرا ساتھی موت کی وادی میں رہ گیا تھا ہمیں اس کی تلاش میں وہاں سرچ پارٹی بھیجنی چاہیے۔

''چنی؟ وہی سفید میکسیکن ہیٹ والا بھاری جتے والا آدمی جس کی ایک آنکھ میں موتیا ہے؟''

''ہاں وہی......''

اس نے سی ٹی بجائی۔

''حیرت ہے تم نے اس شخص کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی ورنہ تم کبھی اس کے ساتھ موت کی وادی کا سفر نہ کرتے۔ یہ شخص کسی فروٹ کیک کی طرح پلپلے مغز والا ہے۔ وہ برسوں پہلے اس موت کی وادی میں گیا تھا اور وہاں سے پاگل ہو کر واپس آیا تھا۔ اس وقت سے وہ پاگل ہی چلا آرہا ہے اور قسمیں کھا کھا کر ہر آتے جاتے کو بتاتا رہتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ موت کی وادی میں سونا کہاں موجود ہے۔ یہ اس کا پاگل پن ہی ہے جو وہ ہر مرتبہ موت کی وادی میں جاکر زندہ سلامت وہاں سے نکل آتا ہے۔''

''میرے خدا!'' میں متحیرانہ چلایا۔ ''ایک پاگل آدمی! کیا وہ خطرناک نہیں؟''

''ویسے تو نہیں، لیکن جب کبھی کوئی اس سے کہے کہ وہ سونے کے بارے میں نری بکواس کررہا ہے تو وہ فوراً ہی مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔ اگر تم اس سے یہ کہو گے تو بعید نہیں کہ وہ تمہیں قتل ہی کرڈالے۔''

''اچھا؟ مجھے وہ کچھ عجیب سا آدمی ضرور معلوم ہوا تھا۔ لیکن اس حد تک میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ پھر یہاں آئے گا؟''

''ہاں شاید......''

اور اگلے دن وہ واقعی وہاں آگیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹہلنے کے انداز میں سیلون میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت میں بار کے عقب میں کام کررہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا پھر دوبارہ نظر نہ ڈالی۔

''موسم بہت گرم ہوتا جارہا ہے۔'' اس نے تبصرہ کیا۔ اس وقت میں اس کا جام شراب اس کے سامنے میز پر لاکر رکھ رہا تھا۔

میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ نہ اس رقم کا تذکرہ کیا جو اس کے ذمے واجب الادا تھی اور یہی بہتر تھا۔

++

کمسن حسینہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک عجیب اتفاق تھا کہ اس حسینہ کے عشاق ملک کے صدر پر قاتلانہ حملہ کرتے، اس نکتے نے صرف امریکا ہی نہیں عالمی پیمانے پر ماہرینِ نفسیات کو چونکا دیا۔ پولیس بھی چکرا کر رہ گئی۔

ایک دلچسپ کردار پر مختصر تحریر

ایک شام جب ڈوبتے سورج کی کرنیں شفق رنگ ہو رہی تھیں۔ جوڈی فوسٹر کی کار تھیٹر بلڈنگ کے سامنے رکی اور جوڈی کار سے نکل کر بلڈنگ کی طرف بڑھی۔

فلم ”ٹیکسی ڈرائیور“ میں ایک خاص رول ادا کرنے کے بعد ان دنوں جوڈی فوسٹر بڑی تیزی سے شہرت کی

منزلیں طے کر رہی تھی۔

جوڈی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد جب کہ تاریکی اپنے قدم جمانے میں مصروف تھی دو آدمی اسی جگہ پہنچے۔

ان میں سے ایک نے چوکیدار کو خط دیا۔ چوکیدار رابرٹ لیکے کو خط دینے کے بعد دونوں آدمی پھیلتے ہوئے اندھیروں میں غائب ہو گئے۔

جس شخص نے چوکیدار کو خط پکڑایا تھا وہ جان ہنکلے تھا۔ بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ اس نے چوکیدار کو جو خط دیا تھا وہ ایک محبت نامہ تھا جو جوڈی فوسٹر کے نام لکھا گیا تھا لیکن، ہنکلے نے جن تند و تیز جذبات محبت کا اس خط میں اظہار کیا تھا جوڈی نے انہیں قبول نہ کیا۔

دوسری طرف ہنکلے آسانی سے اپنی محبت سے دست بردار ہونے والا انسان نہیں تھا۔ اس کا ذہن ایسے راستے تلاش کرنے میں مصروف رہا جن کے ذریعہ وہ جوڈی کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے ہنکلے نے امریکا کے صدر رونالڈ ریگن کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا (جوڈی کی نظر میں ہیرو بننے کی دھن میں وہ پاگل ہو گیا تھا) لیکن افسوس کہ ہنکلے کو مشہور ہونے کے اس منصوبے میں بھی ناکامی ہوئی اور پیشتر اس کے کہ وہ صدر ریگن پر قاتلانہ حملہ کرتا پولیس نے اسے دھر لیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد پولیس نے ایک اور 22 سالہ نوجوان ایڈورڈ رچرڈسن کو گرفتار کیا۔ اس نوجوان نے صدر ریگن کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ صدر ریگن پر حملہ کرنے والا یہ دوسرا نوجوان رچرڈسن بھی جوڈی فوسٹر کا دیوانہ تھا اور اس سے محبت کرتا تھا۔

اس اتفاق نے پولیس کو چونکا دیا اور وہ مجبور ہو گئی کہ جوڈی فوسٹر کی کڑی نگرانی کی جائے اور نہایت احتیاط سے اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے۔

پولیس کا خیال تھا کہ عین ممکن ہے کہ جوڈی فوسٹر واقعی صدر ریگن کو قتل کرنے کے کسی مشن پر مامور ہو اور اس کے لیے اس نے اپنے چاہنے والوں کو بھی اس ڈیوٹی پر لگا دیا ہو اور ان سے وعدہ کر لیا ہو کہ جو بھی کامیاب ہوگا جوڈی اس کی ہو گی۔

جوڈی ان دنوں اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کے ساتھ یونیورسٹی میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی۔

وہ جب یونیورسٹی جاتی یا وہاں سے واپس آتی تو پولیس اس کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتی۔

جوڈی کو اس نگرانی کی کوئی خبر نہیں تھی، وہ معمول کے مطابق یونیورسٹی جا کر لیکچر اٹینڈ کرتی اور گھر واپس آ جاتی تھی۔

امریکا میں صرف ہنکلے اور رچرڈسن دو ایسے نوجوان نہیں تھے جو جوڈی کی نگاہ التفات اور محبت حاصل کرنے کے متمنی تھے اور بہت سے مرد تھے جو جوڈی کے لیے ایسے جذبات رکھتے تھے۔

پولیس افسر ایڈمورون کو اپنی تحقیقات کے دوران جب ان حالات کا علم ہوا تو بقول اس کے ”ہم نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جوڈی کی حفاظت کی جائے۔ اسے خود اس کے بچاؤ کے لیے تحفظ فراہم کیا جائے۔“

واشنگٹن میں صدر ریگن پر جب قاتلانہ حملے کا حادثہ پیش آیا تو ماہرین نفسیات، دانشور اور پولیس کے ماہرین جرائم یہ معلوم کرنے کی مرتوڑ کوشش میں مصروف ہو گئے کہ جوڈی میں ایسی کون سی پُرکشش قوت ہے جو ہنکلے کو صدر امریکا پر حملہ کرنے کے منصوبہ تک لے آئی۔

کیا اس کا مقصد صرف جوڈی کی توجہ حاصل کرنا تھا۔ مزید یہ کہ جوڈی کے حسن میں ایسی کیا بات ہے جس نے بہت سے نوجوانوں کو پاگل کر رکھا ہے۔

تب تحقیقات سے یہ ایک عجیب سی نتیجہ سامنے آیا کہ جوڈی نے فلم ”ٹیکسی ڈرائیور“ میں جو رول ادا کیا ہے، وہ بہت سے نوجوانوں کے لیے انتہائی پُرکشش ثابت ہوا ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح جوڈی کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

اس فلم میں جوڈی نے ایک ایسی کم سن امریکی لڑکی کا کردار ادا کیا ہے جو بڑی آسانی سے محبت کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

عام نوخیز امریکی لڑکیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ تیزی سے آمادگی و سپردگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کی یہ ادا تو جوانوں کو بہت بھائی ہے۔

جوڈی نے بعض دوسری فلموں میں بھی کام کیا تھا اور کر رہی ہے مگر اس کا یہ رول نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا۔

ایک فلم ”گلی کی لڑکی“ میں جوڈی نے ایک ایسی قاتلہ کا رول ادا کیا جو اپنے شکار کو محبت پر مجبور کرنے کے بعد

میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

جوڈی کی ایک بہت کی فلمیں دیکھنے کے بعد ہنکلے اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے جوڈی کے نام سے کم بیش محبت نامے لکھے لیکن جوڈی نے ان میں سے ایک پر بھی توجہ نہیں دی ہے۔

عام خیال ہے کہ جوڈی ابھی اتنی کم سن ہے وہ عملاً پیار و محبت کے معاملات میں شامل نہیں ہو سکتی۔ مرد اس کے بے مداح ہیں مگر وہ ان سب سے بے نیاز ہے۔

سوال یہ ہے کہ جوڈی نے ہنکلے کے ان خطوط کا جواب کیوں نہ دیا جو اس نے بڑی چاہت اور سنجیدگی سے اس کے نام لکھے تھے۔

اس بارے میں خود جوڈی کا کہنا ہے کہ ان خطوط کا متن کسی ایسے شخص کا تصور پیش کرتا ہے جو صرف جنسی تسکین رکھتا ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات سے اسے کوئی سروکار، کوئی واسطہ نہ ہو۔

جوڈی نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ کئی ایک فلموں میں پیار و محبت کے بعض کرداروں کی وجہ سے کئی بوڑھے مرد بھی اس سے اظہار محبت کرنے آتے رہے ہیں۔ انہوں نے اسے شادی کی پیش کش بھی کی ہیں۔

وہ شاید نہیں جانتے یا شاید بھول گئے کہ میں تو ابھی بلوغت کی منزل تک بھی نہیں پہنچی۔ مجھے عملی زندگی کے پیار و محبت سے کیا واسطہ جب کہ میری تو ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔

اپنی نئی فلم "باہر نکلو" میں بھی جوڈی نے ایک رومانوی کردار ادا کیا ہے اس میں وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو گولی مار کر ہلاک بھی کرتی ہے۔ لوگوں نے اس کردار کو بھی بہت پسند کیا ہے۔

اس کے ٹکٹ بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوئے ہیں۔ ایک ٹکٹ کی سرکاری قیمت پانچ ڈالر تھی جو پچاس ڈالر میں فروخت ہوتا رہا۔

اس فلم کے پریمیئر شو میں جوڈی بھی موجود تھی اور اس روز سینما کی حفاظت کے لیے زبردست انتظامات کیے گئے تھے جنہیں دیکھ کر جوڈی نے اپنی ایک سہیلی سے کہا۔

"میں آئندہ ایسے کردار ادا نہیں کروں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ کسی جنونی کے ہاتھوں میری زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔"

++

گدھ (Valture)

چیل کی قسم کا بہت بڑا پرندہ، جو کہ مردار گوشت اور مردار کھاتا ہے اس کے سر پر پر نہیں ہوتے، چنانچہ وہ مردار جانور کے گوشت کے اندر تک سر گھسیڑتا ہے تو اس کے پر خراب نہیں ہوتے۔ گدھ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

راج گدھ، سفید پشت گدھ اور سفید گدھ۔

راج گدھ ایک بڑا جسیم پرندہ ہے۔ اس کی لمبائی ڈھائی فٹ کے قریب ہوتی ہے، گویا وہ چیل سے دگنے ڈیل ڈول کا ہوتا ہے۔ یہ گدھ پاکستان میں بہت کم پایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ اس جانور کا قد اونچا اور رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ بڑا پیٹو جانور ہے۔ مردار کے گوشت سے اپنے پیٹ کو ناک تک بھر لیتا ہے اور زمین پر سیدھا بیٹھ جاتا ہے اس کے ارد گرد چیلیں اور گدھ بیٹھے رہتے ہیں، گویا اس راجا کا دربار ہے۔ اس کی چھاتی سفید اور جسم کے دونوں طرف بھی سفید داغ ہوتے ہیں۔ جب تک یہ پیٹ نہ بھر لے مردار پر دوسرے جانوروں کو قریب نہیں آنے دیتا۔

سفید پشت گدھ پاکستان میں عام ہے۔ جنوری میں بچے انڈوں سے نکلتے ہیں، لیکن عموماً ایک ہی انڈا ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا نچلا حصہ نمایاں طور پر سفید ہوتا ہے باقی جسم خاکستری بھک سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ کا سفید رنگ بازوؤں کے آخری سرے تک چلا گیا ہے۔ جب اڑتا ہے تو یہ سفید حصہ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔

سفید گدھ جس کو مصری گدھ بھی کہتے ہیں، مذکورہ بالا ہر دو گدھوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی دو فٹ تک ہوتی ہے اور چال چیل کی طرح۔ اڑتا ہوا دور سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن پاس سے بھدا اور بدنما نظر آتا ہے۔ ٹانگوں اور چہرے پر بال نہیں ہوتے چونچ کا سرا خمدار ہوتا ہے۔ ٹانگیں، چہرہ اور چونچ زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ بازوؤں کے سرے چوڑے اور کالے ہوتے ہیں اور جسم کے باقی حصے پر میلے سے سفید پر ہوتے ہیں۔ سفید گدھ اڑتے وقت اپنے پاؤں اور دم سمیٹ لیتے ہیں مگر جب زمین پر بیٹھنا چاہتے ہیں تو پہلے ٹانگوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں اور نیچے لٹکا دیتے ہیں اس طرح وہ بآسانی نیچے آ جاتے ہیں۔

مرسلہ: احمد شاہ، حیدر آباد

جہاز بیتی

حسن رزاقی

ہوائی جہاز کے سفر سے متعلق یہ پڑھتے ہیں کہ یہ سب سے تیز سواری ہے لیکن اس سواری سے متعلق دیگر شعبوں کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ حسن رزاقی مہندس ہیں۔ ایک طویل عرصہ ہوائی جہازوں کے زمینی شعبوں سے منسلک رہے۔ زیر نظر تحریر ان کی یادداشتوں کا عکس ہے۔

دلچسپ روداد سفر کہ ہر سطر معلومات سے پر

Gamco کو خیر باد کہنے کے بعد چند مہینے تو خیریت سے گزر گئے مگر اس کے بعد پھر وہی وقت کاٹنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے کویت ائرویز کی مینجمنٹ سے رابطہ قائم کیا جنہوں نے مجھے نوکری کی پیشکش کی جو میں نے قبول کر لی۔

جب میں کویت ائرویز کے ساتھ اپنی نوکری کی ابتداء کرنے کویت پہنچا تو مجھے اندازہ تھا کہ تحریر اتنی کویت ائرویز کے ڈائریکٹر جنرل یا مرازم ڈائریکٹر انجینئرنگ اور ان کے تمام عملے کے ساتھ پہلوؤں کے بارے میں میری خطر ہوں گی۔ تحریر میری ہونے والی منیجر تھیں۔ اس معاملہ میں بھی میں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی تھی۔ عام طور پر لوگوں کی "ہونے والی" ان کی "منگیتر" ہوتی ہے۔ میں اوروں سے مختلف تھا میری ہونے والی منگیتر نہیں منیجر تھی۔ گو کہ تحریر بھی غیر شادی شدہ، عمر میں مجھ سے چھوٹی۔ دبلی پتلی۔ درمیانہ قد۔ گوری رنگت۔ سنہرے بال اور نیلی آنکھوں کی پرکشش شخصیت رکھتی تھیں۔ مگر مجھے ان چیزوں سے کیا لینا دینا۔ میں تو صرف ان کو اپنا آقا بنانے آیا تھا۔ وہ اپنی اداؤں سے مجھے زیر نہیں کر سکتی تھیں۔

اس وقت مجھے بنکاک کا سفر اور وہ لڑکی یاد آ رہی تھی جس نے یادوں کا ایک خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ

رمضان کا مہینا اختتام کو پہنچنے والا تھا۔ عید پر ملنے والی دس دن کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں۔ میں پچھلے بیتے ہی پاکستان کا چکر لگا کر آیا تھا اس لیے سوچا کہ کہیں اور چلا جائے۔ السلام کے ملازمین کو سعودیہ کے ٹکٹ کی سہولت حاصل تھی مگر عید اور بقرعید کی چھٹیوں میں پاکستان بنگلہ دیش اور لندن کے سفر پر پابندی تھی کہ ان ملکوں ان ممالک کے لوگوں کی بڑی تعداد گھر جا کر عید منالی تھی۔ سعودیہ کے ملازمین کے لیے جگہ نہیں بچتی تھی۔ تھائی لینڈ سیر تفریح کے لیے میرا پسندیدہ ملک ہے لیکن بنکاک شہر نہیں بلکہ پھوکیٹ کا ساحلی علاقہ اور چیانگ مائی وغیرہ کا پہاڑی علاقہ۔ لیکن تھائی لینڈ میں داخلہ بنکاک سے ہی ہوتا ہے، اس لیے میں بنکاک روانہ ہو گیا۔ بنکاک اور تھائی لینڈ کے دوسرے شہروں کی تفصیل میں سعودیہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں، دہرانا مناسب نہیں۔ صرف ایک واقعہ لکھنا چاہتا ہوں۔

اپنے کئی سال پہلے کے ایک سفر میں میں بنکاک کی ایک بار میں ایک لڑکی سے ملا تھا جو ایک ہندوستانی باپ اور تھائی ماں کی اولاد تھی۔ اس کا قصہ میں سعودیہ میں بیان کر چکا ہوں۔

اس لڑکی کے ماں باپ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، حالات نے اس کو اس کی مرضی کے خلاف جسم فروشی پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی (جسم فروشی کے لیے نہیں، بلکہ کپڑے بدل کر میرے ساتھ بازار جانے کے لیے) جب وہ دروازہ کی اوٹ میں کپڑے بدلنے جانے لگی تو اس نے کیسٹ پلیئر پر ہندوستانی گانے لگا دیے تھے جس پر میں نے حیرت کا اظہار کیا تو اس نے بتایا تھا کہ یہ اس کے مرحوم باپ کا شوق تھا۔ جب اس کے باپ اس کو یاد آتے تھے تو وہ ان گانوں کو سنا کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے باپ کی یاد میں یہ گانے لگا دیے تھے۔ اس کی یہ بات مجھے یاد تھی اور اسی لیے میں نے ریاض سے چلتے ہوئے اس کے لیے نئے ہندوستانی گانوں کے کیسٹ خرید لیے تھے۔ میں یہ کیسٹ اس کو دینا چاہتا تھا۔ اس کا کمرا شیراٹن ہوٹل کے پچھواڑے ایک گندی سی گلی میں تھا۔ میں اس کا کمرا ڈھونڈنے نکل پڑا۔ دس بارہ سال میں اس گلی کا حلیہ ہی بدل چکا تھا میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کا کمرا میں کیسے ڈھونڈوں گا اور اگر وہ مل بھی گیا تو یہ ضروری تو نہیں کہ اب بھی وہ اسی کمرے میں رہتی ہو۔ بہرحال کوشش تو کرنی ہے۔ کمرا مجھے مل گیا۔ میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے دستک دی کہ معلوم نہیں یہاں کون رہتا ہے۔ اتفاق کہ اسی لڑکی نے دروازہ کھولا، وقت کا دھارا اس کے نقوش کافی بدل چکا تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔

میں نے اس کو یاد دلایا تو میرا ملنا اس کو یاد آ گیا اس نے لپک کر میری پیشانی کو چوم لیا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کیسٹ کا ڈبا اس کے حوالے کیا۔ ”مجھے یاد تھا کہ تم اپنے ہندوستانی باپ کے جمع کیے ہوئے ہندی گانے سنتی ہو، میں تمہارے لیے کچھ نئے ہندوستانی گانوں کے کیسٹ لایا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں واپس جانے لگا۔

اس نے میرا دامن پکڑ لیا۔ ”تم ایسے نہیں جا سکتے، میں تم کو اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے پلاؤں گی، اس کے بعد تم جا سکتے ہو اس سے پہلے نہیں۔“ وہ چائے بنانے چلی گئی مگر جانے سے پہلے کیسٹ پلیئر میں میرا لایا ہوا ایک کیسٹ لگا دیا۔ اس چھوٹی سی ملاقات نے اس پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا تھا۔

چائے پی کر میں باہر آ گیا۔ اب میرا پروگرام پھوکیٹ جانے کا تھا۔ راستے میں مجھے ایک اور پرانے دوست سے نئی ملاقات کا قصہ یاد آ گیا۔

پچھلا واقعہ ایک سال گزر چکا تھا ایک دفعہ پھر عید کی چھٹیاں آنے والی تھیں۔ اس دفعہ میں سری لنکا کا چکر لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سری لنکا کی تفصیل بھی سعودیہ کے ضمن میں آ چکی ہے۔

جب میں گیمکو میں کام کر رہا تھا تو سری لنکن ائرلائین سے جہاز اور اس کے کیبن کرو کا کام لانے کے لیے گیمکو نے ایک ایجنٹ اسماعیل کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں کہ اس کے بغیر وہاں سے کام نہیں مل سکتا تھا۔ کولمبو پہنچ کر میں نے ہوٹل تاج سمودرا کا رخ کیا کہ یہاں میں پہلے بھی کئی دفعہ ٹھہر چکا تھا۔ اپنا سامان کمرے میں پہنچانے کے بعد میں نہا دھو کر تیار ہوا، اسماعیل سے ملنے کا قصد لے کر اسماعیل کے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ:

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اسماعیل کا دفتر وہاں نہیں تھا، کہیں اور منتقل ہو چکا تھا۔ میں شہر کا چکر لگا کر ہوٹل واپس آ گیا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے ہوٹل کے بزنس سینٹر کا رخ کیا۔ جن دنوں میں اور ظہیر فاروقی گیمکو کے لیے سری لنکا سے کام کے لیے سرگرداں تھے ہم نے اس بزنس سینٹر کا بہت استعمال

کیا تھا۔ یہاں پر دو لڑکیاں کام کرتی تھیں ریکھا اور شارنیکا جن کے کام کی مہارت کے بارے میں میں گیمکو کے ضمن میں لکھ چکا ہوں۔ میں ان سے ملنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ہمارے لیے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ بہترین طور پر کام کیا تھا جس کے میں اور ظہیر دونوں معترف تھے۔

بزنس سینٹر میں شارنیکا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی اور ریکھا، دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ شارنیکا کولمبو میں ہی تھی مگر ریکھا کسی اور شہر اپنے شوہر کے ساتھ منتقل ہو چکی تھی۔ چند منٹ گفتگو کے بعد میں اپنے کمرے میں جانے لگا تو شارنیکا نے اصرار کیا کہ رات کا کھانا میں اس کے گھر پر اس کے اور اس کے شوہر کے ساتھ کھاؤں۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ رات اس کا شوہر مجھے لینے ہوٹل پہنچ گیا۔ ان کا گھر ہوٹل سے دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ شارنیکا نے اپنے نومولود بیٹے کو میری بانہوں میں دے دیا۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو گود کھلانے کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ بہرحال کھانا کھا کر ہم لوگ پرانی یادیں تازہ کرتے رہے جس کے بعد شارنیکا کے شوہر نے مجھے ہوٹل واپس پہنچا دیا۔

پتا نہیں کب تک میں ان دونوں کی یادوں میں گھرا رہتا کہ ایک صاحب نے کچھ کہا اور یادوں کا میلا بکھر گیا۔ میں پھر سے ماضی کے دریچے پھلانگ کر حال میں لوٹ آیا اور امیگریشن کے کاؤنٹر پر چلا گیا۔ امیگریشن آفیسر نے بھی کوئی استقبالی کلمات نہ کہے۔ صرف شک کی نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دفتر کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ایک اس کا افسر اعلیٰ تھا۔ دوسرا آدمی خطرناک تھا۔ خطرناک اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس کی انگلی کلاشنکوف کے ٹریگر پر اور نگاہیں میرے چہرے پر۔ میں نے خطرناک کو کئی کئی پہلو سے دیکھا لیکن کسی پہلو سے بھی اس کے تیور دوستانہ نظر نہ آئے۔

دونوں افسران مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کینیڈا میں اتنی برف پڑتی ہے کہ وہاں کے ہر شہری کا رنگ بھی برف کی طرح سفید ہوتا ہے۔ یہ دودھ پتی کی چائے کی رنگت والا آدمی کینیڈین کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کے ذہن میں کینیڈا سے متعلق جس قدر معلومات جمع تھیں۔ ان سب کی مجھ سے تصدیق کروانے کے بعد میرے پاسپورٹ پر ٹھپا تو لگا دیا مگر ان کی شک بھری نگاہیں اس وقت تک میرا پیچھا کرتی رہیں جب تک میں ہال سے نکل کر سامان والی بیلٹ پر پہنچ گیا۔ سامان لے کر کسٹم کاؤنٹر پہنچا۔ وہاں مجھے کسی نے بھی شک کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ اب میں ائرپورٹ کی عمارت سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لے سکتا تھا۔

باہر نکلا تو ”حسن بھائی“ کی فلک شگاف آواز سنائی دی۔ یہ فرخ کی آواز تھی۔ وہ تھوڑی دور کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے ہاتھ ہلا کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان سے گلے ملنے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ہم پارکنگ لاٹ چلے گئے جہاں فرخ کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوئی تھی۔ سوٹ کیس رکھنے کی جگہ مشکل سے بنائی گئی۔ کھانے پینے کا اتنا سامان دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شاید صنوبر نے فرخ کو ہفتہ بھر کا راشن دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔ ان دنوں ان میاں بیوی میں سخت جھگڑا چل رہا تھا۔ جھگڑے کا مقصد یہ طے کرنا تھا کہ ان دونوں میں خوش اخلاقی اور ایمانداری میں کون سبقت لے جا سکتا تھا۔

صنوبر نے یہ سامان فرخ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے بھیجا تھا کہ مجھے ہوٹل یا کمپنی کے مہیا کیے گئے گھر میں کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ صنوبر کا رویہ میرے ساتھ چھوٹی بہنوں والا تھا۔ وہی محبت وہی خیال جس کے لیے بہنیں مشہور ہیں لیکن ابھی میرے ٹھہرنے کا کوئی بندوبست نہ ہوا تھا۔ طے ہوا کہ ہم فرخ کے گھر جائیں گے۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر میں کویت ائرویز کے دفتر جا کر حاضری لگاؤں گا۔

کویت ائرویز والوں نے میرے لیے کمرا بک کر رکھا تھا ایک ہفتے تک ہوٹل کا کرایہ اور کھانا ان کے ذمہ تھا۔ اس دوران مجھے اپنے لیے گھر ڈھونڈنا تھا۔

کویت ائرویز کی نوکری میں نے Gamco چھوڑنے کے بعد کی تھی۔ اپنے Gamco کے زمانے میں، میں کویت ائرویز اپنے مارکیٹنگ کے ایک ساتھی کے ہمراہ ایک کنٹریکٹ کی شرائط کو طے کر کے ان کو حتمی شکل دینے گیا تھا جس کے بعد ہم کویت ائرویز کے کیبنٹس کی مرمت شروع کر سکتے تھے۔ یہ کنٹریکٹ میں نے ظہیر کے ساتھ طے کیا تھا۔

Gamco چھوڑنے کے بعد میرا خیال تھا کہ بہت نوکری ہو چکی اب میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اس سے پہلے میں بالکل یہی فیصلہ سعودیہ چھوڑنے کے بعد کر چکا تھا۔ پہلی دفعہ

کی وجہ سے
کی طرح دوسری دفعہ بھی چھ مہینے کچھ نہ کرنے کی وجہ سے طبیعت بیزار ہو چکی تھی۔ دوبارہ کام شروع کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ وقت گزارنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میں نے سحیر کو اپنے ارادہ سے آگاہ کیا۔ اس نے جواب دیا آکر انٹرویو دے جاؤ۔ فروری میں انٹرویو ہوا۔ بات طے ہو گئی صرف ویزے کا مرحلہ تھا جس کے لیے تین چار ہفتے درکار تھے۔ یہ چار ہفتے سات ماہ میں طے ہوئے۔ اب کویت ائرویز کے دفتر سے ہوٹل کے نام خط وصول کر رہا تھا۔ کل واپس آکر باقی کارروائی مکمل کرنا تھی۔

باقی کارروائی میں میڈیکل کی کارروائی بھی شامل تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ کمپنیاں میڈیکل اپنے ملک بلانے سے پہلے کیوں نہیں کرواتیں۔ کیا اگر کوئی میڈیکل میں فیل ہو گیا تو وہ نوکری سے بھی گیا اور اگر وہ کوئی دوسری نوکری چھوڑ کر یہاں آیا تھا تو اس کا وہ نقصان کون پورا کرے گا۔ اس کا ایک جواب تو میرے پاس تھا۔

بے ایمانی، دانا بازی، جھوٹ، جھوٹی رپورٹیں کچھ لوگوں نے عام کر دی ہیں۔ اس کی سزا ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

میں نے کویت ائرویز بحیثیت کنٹریکٹ انجینئر جوائن کیا تھا۔ میرا جہاز پر کام کرنے سے کوئی تعلق نہ تھا مگر چونکہ عہدہ کے ساتھ "ائرکرافٹ" کا لفظ لگا تھا۔ سخت ترین میڈیکل لازم تھا۔ یہاں کا ٹیسٹ PIA، سعودیہ سب کو مات کر گیا تین دن چلتا رہا۔ بدن کا کوئی حصہ اس سے نہ بچ پایا۔ آخری میں معاملہ کان پر آکر اٹک گیا۔ ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ بعض ایسی فریکونسی ہیں جو میرے کان نہیں سن سکتے۔ کانوں میں گرانی ہے۔

کلام پاک میں تین ایسے اعضا ہیں جن کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ دل کہ وہ سخت ہو جاتا ہے اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ آنکھیں کہ ان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ کان کہ ان میں گرانی آ جاتی ہے۔ اس کے بعد شیطان انسان کو اس کے اعمال خوشنما بنا بنا کر دکھاتا ہے۔

PIA کے میڈیکل میں میرا دل مرمر کا شکار تھا۔ سعودیہ کے میڈیکل میں میری آنکھیں جزوی طور پر بعض رنگوں کو دیکھنے سے قاصر تھیں۔ اب کویت ائرویز یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میرے کانوں میں گرانی ہے۔ اب صرف مجھے شیطان سے بچنا تھا۔

اگر کانوں کی گرانی ختم ہو تو میری نوکری جاری رہ سکتی ہے۔ ورنہ؟ ورنہ کا جواب ابھی مجھے معلوم نہیں تھا۔

مجھے ایک سوڈانی نرس کے حوالے کر دیا گیا۔

میں نے پہلی دفعہ کسی نرس کو برقع میں دیکھا تھا۔ پہلی دفعہ والا کھاتا میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس لڑکی نے بڑی بڑی پچکاریوں سے گرم پانی کے فوارے میرے کانوں میں برسا برسا کر ڈیڑھ دو سیر میل میرے کانوں سے برآمد کیا۔ دوبارہ ٹیسٹ ہوا۔ کانوں کی گرانی ختم ہو چکی تھی۔ خدا کرے شیطان بھی ہار گیا ہو۔ آمین

سعودیہ نے مجھے گھر فرنیچر سب کچھ دے رکھا تھا۔ Gamco نے ان چیزوں کے علاوہ مجھے قالین اور پردے بھی دے رکھے تھے۔ کویت ائرویز نے مجھے پیسے دیے کہ یہ لو پیسے اور خود اپنا بندوبست کرو۔ فرخ صنوبر پھر کام آئے۔ یہ کام میرے بس کا نہ تھا۔ آخر کار میں ایک بار پھر "گھر والا" بن گیا تھا۔ اب کام پر توجہ دینی تھی۔

سحیر انجینئر نہ تھی۔ اس نے لائن مینٹیننس کے منیجر کے دفتر میں گراؤنڈ ہینڈلنگ ایگریمنٹس پر کام کیا تھا۔ یہ وہ معاہدے ہوتے ہیں جس کی تمام تفصیل ساری دنیا کی ائرلائنز نے آپس میں مل کر طے کی ہوتی ہے۔ ان معاہدوں کے ذریعہ ائرلائنز ایک دوسرے کو طے شدہ خدمات اپنے اپنے ائرپورٹ پر مہیا کرتی ہیں اور اس کی طے شدہ قیمت وصول کرتی ہیں۔ اس میں صرف خالی خانے بھرنے ہوتے ہیں کسی خاص گفت و شنید کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جب کویت ائرویز فنی کنٹریکٹ کا شعبہ بنا تو سحیر کو اس کا منیجر بنا دیا گیا۔ سعودیہ میں جو کام فنی کنٹریکٹ کا شعبہ کرتا تھا وہ یہاں دوسرے شعبوں کے پاس تھے، وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سحیر کا خیال تھا کہ میرے تجربے کی بنا پر یہ سب کام خود بخود چل کر اس کے تحت آجائیں گے۔ مجھ سے ان ساری باتوں میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا نہ ہی مجھے اس کا کوئی اندازہ تھا کہ سحیر کا کیا منصوبہ ہے۔

تین چار ہفتہ بعد سحیر بن بادل برسات کی طرح برس پڑی۔ "تم کو آئے اتنے دن ہو گئے ابھی تک کوئی کام نہیں آیا۔"

میں نے پوچھا۔ "کون سا کام؟"

کہنے لگی۔ "وہی جو تم کو آتے ہی لانا چاہیے تھا۔" پھر مجھے اپنے خیالات کی تفصیل بتائی۔ میں نے دو دن بیٹھ کر

پورا پلان بنایا کہ دوسری ائرلائن کس طرح یہ کام کرتی ہیں اور ہم اس کو کس طرح کریں گے۔ یہ پلان خود بخود کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں دوسرے شعبے بھی شامل تھے (یہ وہ شیر تھے جس کے منہ سے سحیر کو نوالہ چھیننا ہوگا) اس کی منظوری ڈائریکٹر انجینئرنگ وغیرہ سے ضروری تھی جس کے بعد اس پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے بھی گراؤنڈ ہینڈلنگ ایگریمنٹ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کام کرنا شروع کر دیے کہ وقت گزرے۔

میرے ساتھ کمرے میں دو لوگ اور کام کر رہے تھے۔ ایک فیصل اور دوسری سہیلہ۔ دونوں GHA پر کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس شعبہ میں اور کوئی کام مشکل سے آتا تھا۔ میری میز پر ایک کمپیوٹر بھی تھا میں نے پہلے کمپیوٹر پر کام نہ کیا تھا حالانکہ جدہ میں میں ایک کمپیوٹر کا مالک تھا لیکن کبھی اس کو استعمال نہ کیا تھا۔ یہ کمپیوٹر DOS کے پروگرام پر چلتا تھا "ونڈوز" کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ بہرحال میں نے فیصل سے پوچھا اس کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اس نے کہا WIN ٹائپ کر کے دیکھو شاید کچھ کام بن جائے۔ میں WIN سے صرف لاٹری کے تناظر میں واقف تھا۔ میری باچھیں کھل گئیں کہ اب کمپیوٹر کے ذریعہ لاٹری جیتنے میں آسانی ہوگی۔ قارئین اب تک جان چکے ہوں گے کہ میرا ہر کام اور ہر خیال مثبت انداز میں شروع ہوتا ہے لیکن انجام مثبت نہیں نکلتا۔ اس دفعہ بھی یہی کچھ ہوا۔ یہ WIN لاٹری والا نہ تھا۔ یہ Windows کا WIN تھا جس میں جیت صرف "بل گیٹس" کی ہوتی ہے۔ ان کے نام ایسی لاٹری نکل چکی ہے کہ وہ کم از کم آدھی انسانیت سے روزانہ Windows کے استعمال کا خراج وصول کرتے ہیں۔

اگلے تین ہفتہ میں نے اور کمپیوٹر نے وقت ساتھ ساتھ گزارا۔ اس دوران میرے ایک ساتھی عادل نے مجھے دو تین کمپیوٹر کی کتابیں لا کر دیں کہ میں ان کی مدد سے آگے بڑھ سکوں۔ عادل مردم شناس آدمی نکلے وہ میری قابلیت کو پہچان چکے تھے انہوں نے مجھے جو کتابیں دی تھیں وہ Dummies کے لیے لکھی گئی تھیں MS Word For Dummies/ Windows For Dummies وغیرہ۔ میں خوش ہوا کہ آخر کسی نے تو مجھے پہچانا۔

نوکری کے تین ہفتے اختتام کو پہنچ چکے تھے لیکن میرا اور سحیر کا معاملہ ابھی تک اسی مرحلہ میں تھا کہ

تجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضہ کرے کوئی

کنٹریکٹ کا شعبہ سحیر چلا رہی تھیں اپنے ماتحت کام کرنے والوں سے کام لینا ان کی ذمہ داری تھی۔ مگر سحیر کا یہ خیال تھا کہ میں ان کی راہنمائی کروں کہ وہ مجھ سے کیا اور کیسا کام کروائیں۔ چھوٹے موٹے کام آتے رہے جو میں کرتا رہا۔

پھر تھوڑی سی ہلچل ہوئی کویت ائرویز دوسری ائرلائینوں کے جہازوں کی مرمت کا کام اپنے ہینگر میں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کویت ائرویز دنیا کی دوسری ائرلائینوں کے جہازوں کی مرمت (Maintenance) اپنے ہینگر میں کرے گی اور ان گاہک ائرلائینوں سے اپنی خدمات کی قیمت وصول کرے گی۔ یہ کام کویت ائرویز کے لیے انتہائی غیر مناسب تھا اس لیے کہ

ناز والے نیاز کیا جانیں

گاہک ائرلائینوں کے جہازوں پر کام کرنے کے لیے جس سوچ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سوچ خلیج کی کسی بھی ائرلائن کے پاس نہیں تھی۔ اس پروجیکٹ کے لیے ضروری تھا کہ کویت ائرویز کی جہازوں پر مینٹیننس کا کام کرنے کی کارکردگی اور مہارت اتنی اعلیٰ درجہ کی ہو کہ کام کروانے والی ائرلائن اس کارکردگی اور مہارت کی معترف ہوں اور ساتھ ہی ساتھ کویت ائرویز کا اتنا ہاتھ ہو کہ وہ ان گاہک ائرلائنوں کی ہر جائز اور ناجائز بات کو برداشت کر سکے۔ ان کے نخرے اٹھا سکے۔ کویت ائرویز اور خلیج کی تمام دوسری ائرلائنز نخرے اٹھوانے کی عادی تو تھیں لیکن نخرے اٹھانے کی نہیں۔

میں تنگ آگیا ناز اٹھاتے اٹھاتے
جنازہ اٹھانے کو جی چاہتا ہے

لیکن اگر کویت ائرویز نے یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا تو میں اس ٹیم کا حصہ بننا چاہتا تھا۔

اس منصوبہ کے قابل عمل ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے چار یا پانچ ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ ایک ٹیم میں میں بھی شامل تھا۔

بعد میں منصوبہ منسوخ کر دیا گیا جو کہ مناسب تھا۔ چند ماہ اس کام میں گزر گئے اس کے بعد پھر وہی بے کاری۔ ایک بار پھر میرا زیادہ وقت کمپیوٹر پر MS

Hearts کھیلنے میں گزرنے لگا۔ سعودیہ اور Gamco کی حد سے زیادہ معروفیت کے بعد اس طرح وقت کا یہ بٹوارہ دل کش تھا۔

ایک دوپہر میں اپنے دفتر کے دروازے سے باہر نکلا تو دیکھا سامنے سے ایک گیند لڑھکتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ قد اور چوڑائی اس گیند کی تقریباً برابر تھی، وزن قد کے حساب سے بہت زیادہ۔ اس گیند کا نام تھا سہیل الخب۔ سہیل کو میں سعودیہ کے زمانے سے جانتا تھا۔ پہلے یہ اپاز کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بعد میں بنگرز۔ کام کرنے لگے تھے۔ سہیل نے اچھل اچھل کر میرے گالوں کو عربوں کے خوش آمدید کہنے کے انداز میں چوما اور کہنے لگے۔ "ہم کو بہت افسوس ہے کہ تم کویت میں دو دن سے آئے ہوئے ہیں۔ ہم کو معلوم تھا کہ تم کویت ائرویز میں کام کررہے ہو مگر پوچھا تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ کیا معاملہ ہے۔"

معاملہ واقعی یہی تھا یہاں مجھے بہت کم لوگ جانتے تھے۔

سہیل تقریباً گھسیٹتے ہوئے مجھے کانفرنس روم کی طرف لے گئے۔ "تمہارے لیے ایک خاص تحفہ ہے۔ تم دیکھ کر اچھل جاؤ گے۔"

میں تحفہ دیکھ کر واقعی اچھل گیا۔ میرے سامنے محمد اور فلاتہ کھڑے تھے جو میرے ساتھ سعودیہ اوپانکس انجینئرنگ میں کام کرتے تھے۔ ان کی میز میری میز کے پیچھے ہوا کرتی تھی۔ میرے سعودی دوستوں میں سے ایک بہترین دوست۔ ہم دونوں گرم جوشی سے ملے۔ محمد کو وہی شکایت "ہم تم کو تلاش کررہے تھے مگر کوئی تم کو جانتا ہی نہیں۔" یہ حقیقت تھی۔

سہیل اور محمد دونوں السلام ائرکرافٹ کمپنی میں کام کررہے تھے۔ یہ وہی کمپنی تھی جو بوئنگ اور سعودیہ کے اشتراک سے ریاض میں بنائی گئی تھی۔ اس کے بنانے والی سعودیہ کی ٹیم میں، میں بھی شامل تھا۔ سعودیہ کی طرف سے السلام کے کنٹریکٹ کی تشکیل اور تکمیل میرے ذمہ کردی گئی تھی۔

محمد مجھے اس لیے ڈھونڈ رہے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ السلام میں کام کروں۔ وہ بھی وہاں کے سربراہ نہیں تھے مگر جلد بننے والے تھے۔

دو ماہ بعد میں السلام میں کام کررہا تھا۔

☆☆☆

السلام کے دفاتر اور ہینگر سعودی عرب کے شہر ریاض میں واقع ہیں۔ میں سعودیہ کی پرواز سے کویت سے ریاض کے لیے روانہ ہوچکا تھا۔ سعودیہ کے شہر ریاض کے لیے A-300 جہاز میں سوار ہوا تو اپنائیت کا احساس ہوا۔ سعودیہ کے ساتھ بھی اور جہاز کے ساتھ بھی۔

سعودیہ کے ساتھ میں نے یادگار ساڑھے تیرہ سال گزارے تھے اور اس A-300 جہاز کے خریدنے میں میرا بھی حصہ تھا۔ اس کے مواصفات۔ طے کرنے کا کام میرے ذمے تھے۔ جہاز ریاض ائرپورٹ پر اتر چکا تھا۔

ریاض ائرپورٹ کا شمار دنیا کے خوبصورت ائرپورٹ میں ہوتا ہے۔ یہ ائرپورٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک بین الاقوامی پروازوں کے لیے اور دوسرا مقامی پروازوں کے لیے۔ ہر دو حصوں میں ایک ہی ڈیزائن کے بہت بڑے فوارے نصب ہیں۔ جن کے گرد قطار در قطار پھول لگے ہیں۔ مسافر اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہر وقت ان فواروں کے اطراف کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ائرپورٹ پر ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ نماز بھی پڑھ لی جائے تو اس کا ثواب الگ۔

سعودی عرب میں امیگریشن کے عملے میں زیادہ تر لوگ اکھڑ ہیں۔ رعونت کی دولت سے مالا مال۔ پاکستان اور دیگر ممالک سے آنے والے غریب مسافروں پر ان کی خاص عنایت ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی ناخواندگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو بلاوجہ پریشان کرتے ہیں اور جب یہ نادار لوگ ادھر اُدھر ہراساں ہوکر دوڑتے ہیں تو یہ امیگریشن کے کارندے ایک دوسرے کو اشارے کرکر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں یہ نظارہ بارہا جدہ، ریاض اور ظہران ائرپورٹ پر دیکھ چکا تھا اس لیے پوری طرح سے تیار رہا انہیں کوئی موقع نہ ملا کہ مجھے پریشان کرتے۔

میرے پاسپورٹ پر ٹھپا لگ چکا تھا۔ میں باہر آگیا۔ فورتنو، کویت وغیرہ نے میرے استقبال کے لیے اپنا عملہ بھیج کر میری قدردانی کی تھی مگر السلام نے ایسا نہ کیا۔ گو کہ استقبالیہ کمیٹی صرف ایک ڈرائیور پر مشتمل تھی۔

ڈرائیور نے مجھے خوشخبری سنائی کہ وہ مجھے ولا 88 لے جائیں گے۔ میں انکار کیسے کرسکتا تھا اگر وہ مجھے صرف ولا زیرو بھی لے جاتے تب بھی مجھے جانا پڑتا۔

ولا 88 کی وجہ تسمیہ وہاں پہنچ کر معلوم ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا جس میں سے السلام نے اٹھاسی ولا اپنے ملازمین کے لیے کرائے پر لے رکھے تھے۔ کمپاؤنڈ بہت عمدہ، ولا شاندار، میرے ولا کے پچھواڑے بہت بڑا سوئمنگ پول۔ ولا پوری طرح سے آراستہ تھے۔ فرنیچر، قالین، پردے، چادریں حتیٰ کہ چھری کانٹے تک۔ میرا کویت سے لایا ہوا سامان تین سال بند پڑا رہا۔ اگلی صبح السلام کے دفاتر اور ہینگر پہنچا تو اس جگہ کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی خواب کی تعبیر سامنے کھڑی ہو۔ السلام کی تخلیق میں میری انگلی کا لہو بھی شامل تھا۔

السلام بوئنگ اور سعودی شرکاء کی بنائی ہوئی جہازوں کی مرمت کرنے کی کمپنی تھی۔ سعودی شرکاء میں سب سے بڑا پچیس فیصد کا حصہ حکومت سعودیہ کا تھا۔ بوئنگ سے تمام مذاکرات سعودیہ نے کیے تھے۔ سعودیہ کی اس ٹیم میں، میں بھی شامل تھا۔ السلام کمپنی کے قائم کرنے کا کنٹریکٹ میرے ہاتھوں سے گزرا تھا۔

السلام کمپنی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے معاہدے کے تحت وجود میں آئی تھی۔ یہ معاہدے سعودی حکومت اور امریکی کمپنیوں کے درمیان طے ہوئے تھے۔

سعودی حکومت نے بہت بڑے پیمانے پر اپنی افواج کے لیے اسلحہ اور راڈار وغیرہ خریدے تھے۔ ان معاہدوں کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جن کمپنیوں سے سامان خریدا گیا ہے وہ کمپنیاں سعودی عرب میں ٹیکنالوجی کی منتقلی کا بھی اہتمام کریں گی اور ان کمپنیوں میں پچاس فیصد سرمایہ کاری بھی کریں گی۔ اس کے نتیجے میں بوئنگ کی شراکت سے السلام اور G E کی شراکت سے مڈل ایسٹ پروڈکشن سینٹر (MEPC) وجود میں آئی تھی۔ ان دونوں کمپنیوں کے اور سعودیہ کے درمیان معاہدے امین الشوریٰ کے زیر صدارت ہوئے تھے۔ امین کی اس ٹیم میں کنٹریکٹ کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی تھی۔

لکھ چکا ہوں کہ میرے ساتھ زندگی میں زیادہ تر چیزیں الٹی ہوتی ہیں لیکن السلام کا واقعہ سیدھا ہوگیا تھا۔ السلام میں نوکری میں نے پہلے شروع کردی تھی۔ انٹرویو بعد میں ہوا۔

یہ انٹرویو عبدالکریم النواز کے ساتھ تھا جو السلام کے ڈائریکٹر کنٹریکٹ تھے۔ عبدالکریم ذہانت اور توانائی سے بھرپور سعودی نوجوان تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہنس مکھ اور انتہائی مہذب۔ انٹرویو کے ساتھ رسمی خانہ پری تھی۔ عبدالکریم کو معلوم تھا کہ السلام کو وجود میں لانے والا کنٹریکٹ میرے ہاتھ سے گزر چکا تھا۔ اس کے مذاکرات میں امین الشوریٰ کا اور میرا بڑا کردار تھا۔ امین کا نریندہ میرا نام۔

اس بے تکلف انٹرویو کے بعد عبدالکریم نے مجھے مطلع کیا کہ آپ کا دفتر اوپری منزل پر سیڑھیوں کے بعد دائیں جانب پڑے گا۔ پھر انہوں نے ہنس کر مصافحہ کیا۔ یعنی اشارہ دیا کہ اب آپ جاسکتے ہیں۔

میں اوپری سیڑھیوں سے جیسے ہی دائیں جانب مڑا، سامنے سے آتے ہوئے ایک صاحب نے زور سے یاہیپی کا نعرہ بلند کیا اور مجھ سے لپٹ میرے گالوں کو چوم لیا۔ یہ میرے سعودیہ کے بہت پرانے ساتھی ڈکرن تھے جو سعودیہ کے پلاننگ کے شعبہ میں کام کرتے تھے۔ اب ان کا تبادلہ بھی السلام کردیا گیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ایک اور نعرہ لگا۔ یہ نعرہ عربی میں نہیں انگریزی میں تھا۔

Hi mate, how come you are here.

نعرہ لگانے والے کا نام کین ہارمن۔ کین میرے ساتھ سعودیہ میں کئی سال بحیثیت کنٹریکٹ ایڈمنسٹریٹر کام کرچکے تھے۔ کین اور مجھ میں انتہائی اہم اور دانشمندانہ قدر مشترک تھی۔ ہم دونوں بیوی سے چنگل سے محفوظ تھے۔ میرا یہ تحفظ ہنوز قائم ہے مگر کین کی کہانی کچھ اور ہے۔ چند مہینے بعد کین السلام چھوڑ کر کینیڈا کوچ کرگئے، ان کو وہاں کا امیگریشن مل گیا تھا۔ پھر ایک ناگہانی صورت حال ہوئی کہ ان کو ایک کینیڈین لڑکی سے عشق ہوگیا۔ آگے کا انجام آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ کین کی شادی کا سن کر مجھے کسی کا سنایا ہوا واقعہ یاد آگیا۔ ایک شیر کی شادی تھی۔ اس نے مہمانوں کی دعوت کا انتظام لومڑی کے سپرد کیا اس ہدایت کے ساتھ کہ تقریب میں صرف معزز جانور شریک ہوں گے کوئی بیچ جانور نہیں آئے گا۔ اتفاق دیکھیے کہ عین شادی کی تقریب کے موقع پر ایک چوہا آگیا اور اس نے سب کے سامنے ناچنا شروع کردیا۔ شیر کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ تقریب میں بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ خاموش رہا۔ تقریب کے اختتام پر جب سب مہمان چلے گئے تو شیر نے چوہے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "اے بیچ جانور تیری ہمت کیسے ہوئی کہ تو میرے منع کرنے کے باوجود میری شادی کی تقریب میں آگیا۔"

یہ سن کر چوہے نے اپنی دم ہوا میں لہرائی اور سینہ تان کر شیر سے مخاطب ہوا۔ "زبان سنبھال کر بات کر، اس

طرح سے اثر نہ دکھا، شادی سے پہلے میں بھی شیر ہوا کرتا تھا۔" کین بیچارہ ہنوز شیر ہے یا چوہے کا روپ دھار چکا ہے! کچھ خبر نہیں۔

السلام میں ہوائی کمپنیوں کے علاوہ سعودی افواج کے تمام جہازوں کا کام بھی ہوتا تھا جس کی تمام تر ذمہ داری عبدالکریم کی تھی۔ میرا تعلق صرف مسافر بردار طیاروں سے تھا۔

ولا 88 میں چند ایک پاکستانی اور بھی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ضیاء تھا۔ ضیاء اور مجھ میں ایک قدر مشترک نکل آئی۔ قسمت ان کو بھی کبھی کبھی ایسی ہی پٹخنیاں دیا کرتی تھی جیسی مجھے ہر روز دیتی تھی۔ خاص طور سے گاڑی کے معاملہ میں۔

گاڑی کے معاملہ میں قسمت ان پر ہمیشہ سے مہربان تھی، نہ صرف سعودی عرب میں بلکہ پاکستان میں بھی۔ پاکستان میں جب ضیاء اپنی گاڑی کی ہر چیز بدلوا چکے، انجن اور باڈی سمیت تو اس کے والد نے ارشاد کیا۔ "بیٹا تمہارا تو وہی حال ہے کہ ہاتھ میں سائیکل کا پیڈل لے کر گھر سے نکلے راستہ میں دوست مل گیا۔ اس نے پوچھا کہاں جارہے ہو۔ تم نے جواب دیا پیڈل میں سائیکل ڈلوانے جارہا ہوں۔"

گاڑیوں کے سلسلے میں ایک واقعہ اور پیش آیا۔

میں اپنے دوست فائق کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر ولا 88 سے شہر جارہا تھا۔ کچھ کام تھا۔ رات کا وقت تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ ٹائر پنکچر ہوگیا۔ سامنے پیٹرول پمپ تھا۔ فائق نے گاڑی اس کے سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی کردی اس جگہ اندھیرا تھا۔

ایک سوڈانی آیا پوچھا۔ "کیا ہوا؟" ہم نے جواب دیا کچھ نہیں۔ ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔ وہ آگے چلا گیا۔ ہم دونوں ٹائر کو لڑھکا کر پیٹرول پمپ لے گئے۔ ٹائر بنوا کر واپس آئے تو دیکھا گاڑی کا دیوار والی طرف کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ گاڑی کے اندر سے فائق کا بٹوہ غائب تھا۔ یہ اسی سوڈانی کی کارستانی ہوگی۔ مجھے پچیس سال پہلے کا جدہ کا واقعہ یاد آگیا کہ جب حج سے واپس آتے ہوئے ہم لوگوں نے سڑک پر ایک سوٹ کیس پڑا دیکھا تھا۔ یہ سوٹ کیس وہاں دو یا تین دن پڑا رہا مگر کسی نے اس کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ سعودی عرب بہت بدل چکا تھا۔ اب یہاں چوریوں کی بھرمار ہوچکی ہے۔

ابوظہبی چھوٹا سا شہر ہے صرف چند ایک بڑی بڑی سڑکیں ہیں جہاں جانے کے لیے میرے ایسے آدمی کو کسی سواری کی عام طور سے ضرورت نہیں پڑنی چاہیے اسی لیے میں نے اپنے پانچ سالہ قیام کے عرصہ میں ابوظہبی میں گاڑی نہیں رکھی تھی۔ کویت بھی چھوٹا شہر ہے لیکن شاید اتنا چھوٹا نہیں جتنا ابوظہبی ہے۔ اپنا اپارٹمنٹ میں نے ائرپورٹ کے نزدیک ہی لیا تھا۔ میرا کام ائرپورٹ پر ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہاں بھی بغیر گاڑی کے کام چل جائے گا لیکن نہیں۔ اس نہیں کی وجہ یہ تھی کہ ابوظہبی کا ائرپورٹ شہر سے بہت دور بنایا گیا ہے وہاں جانے کے لیے ہم بہت سے کام کرنے والوں نے ایک بس کا بندوبست کرلیا تھا جو ہم لوگوں کو ائرپورٹ لاتی لے جاتی تھی۔ کویت کا ائرپورٹ شہر کے بیچ میں ہے میں نے سوچا یہ فاصلہ پیدل طے کیا جاسکتا ہے۔ ایک دو دن تو میں پیدل ہی نکل پڑا مگر یہ فاصلہ زیادہ دور ثابت ہوا۔ گاڑی خریدنا ضروری ہوگیا۔ میرے کزن فرخ، میرے کویت کے مشکل کشا۔ ایک کار رینٹل کمپنی میں ہی کام کرتے تھے، انہوں نے مجھے ایک سرخ رنگ کی چھوٹی سی اسپورٹ کار جیسی گاڑی خریدوادی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ اب میں روز اسی گاڑی پر ائرپورٹ آنے جانے لگا۔

ایک صبح میں ائرپورٹ جانے کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا تو مجھے ہینڈل میں ایک پرچہ بندھا ہوا ملا۔ پرچہ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں اس گاڑی کی شان میں قصیدہ اور ملنے کی تمنا کا اظہار تھا۔ یا خدایا یہ کون ہے جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پرچوں کا یہ سلسلہ اگلے چند روز چلتا رہا۔ ایک دن میں ذرا وقت سے کچھ پہلے گاڑی میں بیٹھنے لگا تو ایک کویتی لڑکے نے مجھے مخاطب کیا۔ "حبیبی! یہ گاڑی کس کی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "یہ میری گاڑی ہے، کیوں؟"

وہ بولا۔ "ایسی گاڑیاں تو لڑکیاں چلاتی ہیں، میں سمجھا کسی لڑکی کی گاڑی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم سے مڑا اور سڑک کی طرف نکل گیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ مجھے روز روز یہ محبت بھرے پیغام کس کی جانب سے ملتے تھے اور کیوں۔ میں نے اس بیچارے لڑکے کو اس کے تمام تر رومینٹک خوابوں کی انتہائی بھیانک تعبیر دکھادی تھی۔ ہائے بیچارہ عاشق نامراد!

چند روز بعد فرخ مجھ سے ملنے آئے، وہ روز روز اپنی کمپنی کی قسم قسم کی گاڑیوں میں آیا کرتے تھے۔ آج وہ ٹیوٹا

کیمری چلا رہے تھے، مجھ سے فرمائش کی آپ اسے چلا کر دیکھیں، پانی کی طرح بھاگتی ہے۔ میری شامت میں نے گاڑی چلانے کی ہامی بھرلی۔ ہم لوگ چھوٹی سڑک سے مین روڈ پر نکل آئے۔ فرخ کا کہنا بالکل ٹھیک تھا لگتا تھا کہ واقعی گاڑی پانی پر تیرتی چلی جارہی تھی۔

میں نے فرخ سے سوال کیا۔ "کیا تمہاری کمپنی اس گاڑی کو بیچ رہی ہے؟" فرخ کا جواب نفی میں تھا۔

"تو کیا تمہاری کمپنی میں کوئی اور کیمری ہے جو وہ بیچنا چاہتے ہیں؟" اس دفعہ بھی جواب نفی میں تھا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" فرخ نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں ایسی گاڑی خریدنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو آپ نئی کیمری کیوں نہیں خرید لیتے؟"

"اس لیے کہ میں اس کو پاکستان نہیں لے جاسکوں گا، وہاں اس گاڑی کی ڈیوٹی میں کئی نئی گاڑیاں آجائیں گی۔"

"ارے چھوڑیئے حسن بھائی، پاکستان لے جانا کیا ضروری ہے۔ جب تک یہاں ہیں مزے سے بھگایئے، پاکستان جاتے ہوئے بیچ جایئے گا۔"

بات معقول تھی، میں نے ٹویوٹا کے شوروم کا رخ کیا۔ وہاں پر کیمری کے دو ماڈل تھے ایک چار سلنڈر کا 2.2 لیٹر اور دوسرا چھ سلنڈر 3 لیٹر کا۔ میں نے چھ سلنڈر والی گاڑی خرید لی۔ جب میں کویت ایرویز چھوڑ کر ریاض میں السلام میں نوکری کرنے آیا تو یہ گاڑی بھی میرے ساتھ تھی۔

میں اس دور کی پیداوار تھا جس کی نظر میں دنیا کی بہترین گاڑیاں فوکسی، ویگن کی "بیٹل" تھی۔ آدھا پاکستان اس گاڑی کا دیوانہ تھا۔ میری پہلی گاڑی بھی بیٹل تھی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ جاپانی گاڑیوں کی مقبولیت ساری دنیا میں بڑھ گئی۔ "بیٹل" داستان پارینہ ہوگئی۔ ویگن کے دوسرے ماڈل آگئے۔ اسپیشل بننا بند ہوگئی۔

ویسے تو بیٹل بننا بند ہوگئی تھی مگر اس کے چاہنے والے ساری دنیا میں تھے جن کے دلوں میں بیٹل آج بھی دھڑکتی ہے۔ بیٹل کو دوسری زندگی ملی۔ یہ دوبارہ بنائی جانے لگی مگر اب اس کا انجن آگے کی طرف تھا پانی بھی مانگتی تھی۔

میں ایک دن ریاض میں اپنی گاڑی میں جارہا تھا۔ سامنے سے ایک نئی بیٹل آتی ہوئی دکھائی دی۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

اگلے روز میں ویگن کے شوروم پہنچ گیا۔ وہاں کئی ایک بیٹل گاڑیاں مختلف رنگوں کی کھڑی تھیں لیکن میں نے جو بیٹل سڑک پر دیکھی تھی وہ میرے دل میں ترازو ہوگئی تھی۔ وہ پیلے رنگ کی تھی اور ان سارے رنگوں میں مجھے وہی رنگ بھا رہا تھا۔

"کیا یہ پیلے رنگ والی گاڑی مجھے مل سکتی ہے؟" میں نے سیلز مین سے استفسار کیا۔

اس کے جواب نے مجھے مایوس کیا۔ "جی نہیں یہ بک چکی ہے۔"

"کیا آپ کے پاس پیلے رنگ میں دوسری گاڑی موجود ہوگی؟"

"فی الحال تو موجود نہیں ہیں، ہم نے آرڈر کی ہوئی ہیں۔"

"کب تک آجائیں گی؟"

"کچھ معلوم نہیں۔"

میرے چہرے پر مایوسی دیکھ کر شاید اس کو میرے اوپر رحم آگیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ یہ گاڑی ہم کئی دن پہلے بیچ چکے ہیں، اس کے پیسے بھی وصول ہوچکے ہیں، ہم اس کی نمبر پلیٹ بھی حاصل کرچکے ہیں، مگر اس کے خریدار اس کو اب تک نہیں لے گئے ہیں۔"

"وجہ؟" میرا سوال تھا۔

سیلز مین کے جواب نے میرے دل میں اُمید بندھا دی۔

"یہ گاڑی ان صاحب نے اس لیے خریدی ہے کہ وہ بیٹل کے شیدائی ہیں۔"

"تو پھر وہ اس کو لے کیوں نہیں جارہے ہیں؟"

"ہوم گورنمنٹ یعنی ان کی بیوی کو بیٹل سے نفرت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں اس مینڈک کے پیٹ میں نہیں بیٹھوں گی۔ وہ صاحب بیوی کو منانے میں لگے ہیں کہ شاید وہ مان جائے۔"

یہ انتہائی اُمید افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے سیلز مین کو مخاطب کیا۔ "آپ ایسا کیجیے ان صاحب کو فون کیجیے کہ ان کی گاڑی میں خریدنا چاہتا ہوں، میں ان کو مناسب اضافی قیمت دینے کو بھی تیار۔ وہ چند دن بعد بھی آپ سے گاڑی خرید سکتے ہیں، جب تک ان کی بیگم بھی شاید مینڈک کے پیٹ میں بیٹھنے کو تیار ہوجائیں۔"

میری قسمت اچھی تھی وہ صاحب تیار ہوگئے۔ اس

گاڑی کو میں دلا 88 لے آیا۔
اب میرے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ مگر میرا پروگرام پاکستان واپس جاتے ہوئے ہنڈل ساتھ لے جانے کا تھا۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ پاکستان میں جتنی ڈیوٹی ہنڈل پر دوں گا اس میں دو نئی گاڑیاں آجائیں گی۔ اتنے پیسے دینا مناسب نہ تھا۔ میں نے ہنڈل کو بیچ دیا۔

یہ اپریل کا مہینا تھا۔ جون میں پاکستان کا بجٹ آیا۔ چھوٹی گاڑیوں پر ڈیوٹی آدھی کردی گئی تھی۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ یہ تمام عنایات آخر میرے ہی ساتھ کیوں لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ سرمایہ کاری کے اتار چڑھاؤ کے جن کی طرح اب پاکستان میں کسٹم ڈیوٹی کے اتار چڑھاؤ کا جن بھی میری مٹھی میں تھا۔

جدہ میں ایک پرائیویٹ کمپنی کو جہاز پر کام کروانا تھا۔ فلاتہ اور میں جدہ گئے تاکہ وہیں پر مذاکرات چکا کر کنٹریکٹ کی شقوں میں ضروری ردوبدل کرکے اس کو وہیں دستخط کردیں۔ کام ختم کرنے کے بعد عدنان سے بھی ملنا تھا (عدنان سعودیہ کے وی پی ٹیکنیکل تھے) ہیڈ آفس شہر سے منتقل ہوکر سعودیہ سٹی آچکا تھا۔ عدنان کا دفتر ہیڈ آفس کی بلڈنگ میں تھا۔

کام ختم کرکے ہم دونوں سعودیہ سٹی کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس علاقہ میں میں نے تیرہ سال سے زیادہ عرصہ گزارا تھا۔ مگر پچھلے پندرہ سال کے عرصے میں یہ جگہ اتنی بدل چکی تھی کہ میرے لیے اس کا پہچاننا مشکل ہوتا اگر فلاتہ ساتھ نہ ہوتا۔ یہی حال ساری دنیا کا ہو رہا ہے۔ آبادی بے تحاشہ بڑھ رہی ہے۔ جگہیں جو خالی ہوا کرتی تھیں وہاں مکان، دکان، دفتر، سڑکیں تعمیر ہوچکی تھیں۔ ماضی ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکتا تھا۔ یہ سیلاب رکنے والا نہیں ہے۔ بڑھتا رہے گا۔ اس کے ساتھ افراتفری بھی بڑھتی جارہی ہے۔ یہ عالمی مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کے پانچ چھ ملکوں میں رہنے کا اور پھر کئی سال بعد ان سب جگہوں پر جانے کا موقع مہیا فرمایا۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔ پرانی جگہیں مشکل سے پہچانی جاتی ہیں، نئی نئی بستیاں بس گئی ہیں۔ جہاں کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی وہاں گھر اور بازار بن چکے ہیں۔ کھیت مزید پیچھے سے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ بہت سے ملک ایسے ہیں جنہوں نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنانا شروع کردیا ہے۔ یورپ کے ایسے کئی ممالک ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ وہاں پر آبادی بڑھ نہیں رہی ہے، کم ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر فرانس۔

دنیا کی آبادی ہر اڑتیس سال میں دگنی ہو رہی ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی ہر پچیس سال میں دوگنی ہو رہی ہے۔ جب دوگنی ہوتی ہے تو وہ پہلے وقفے میں دوگنی، دوسرے میں چارگنی، تیسرے میں آٹھ گنی اور چوتھے وقفے میں سولہ گنی ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے اگر پاکستان کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو اگلے سو سال میں یہ تین ارب سے تجاوز کر جائے گی۔ یعنی آج کی دنیا کی آبادی کی ایک تہائی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ زمین اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکتی ہے۔ ہر چیز کا قحط اور کال پڑ جائے گا۔ نہ بجلی نہ گیس نہ پانی نہ معدنیات۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگلی جنگیں پانی پر ہوسکتی ہیں۔ مگر اس بڑھتی ہوئی آبادی کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ ریاض واپس جاتے ہوئے یہی خیالات میرے دماغ میں تھے۔ آبادی کی زیادتی آج کی دنیا کا مسئلہ نمبر ایک ہے جو آنے والے برسوں میں ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔ چارہ گرو کیا اس کا کوئی حل ہے۔

GAMCO اور السلام کا کام تقریباً ایک جیسا تھا کوئی خاص فرق نہ تھا۔ مجھے نوکری کرتے ہوئے انتالیس سال پورے ہوچکے تھے۔ چالیسواں سال شروع ہوچکا تھا۔ میں نے تیسری دفعہ ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کیا۔ استعفیٰ دے دیا۔ تین دفعہ کے بعد تو طلاق میں بھی رجوع کی گنجائش نہیں رہتی۔

تین دفعہ ریٹائر ہونے کے بعد اب میں اور ہوائی جہاز ایک دوسرے کے لیے نامحرم بن چکے ہیں۔ میرا اور ہوائی جہاز کا چالیس سال کا سنجوگ اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ صرف یادیں باقی ہیں۔

سب کچھ پالیا وقت کے بہاؤ میں
سب کچھ کھو دیا وقت کے بہاؤ میں
یادیں ہی رہ گئیں وقت کے بہاؤ میں
وقت بھی بہہ گیا وقت کے بہاؤ میں

میں اپنے رب کا شکرگزار ہوں کہ اس نے میری تمام ترکوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود اپنا وعدہ سچ کردکھایا۔
''ہم ان کو اچھی زندگی گزروائیں گے۔''
فبای الاء ربکما تکذبٰن
''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''
میرا سر اپنے رب کریم کے سجدے میں جھک گیا۔

++

عالمی پیمانے پر مشہور واقعہ، اس واقعے پر ناول لکھے گئے، فلمیں بھی بنیں کیونکہ ایسے واقعات ذہن و دل کو چکرا دیتے ہیں. مشکل سے ہی سمجھ آتے ہیں. اگر تفتیشی افسر باریک بینی سے تفتیش نہ کرتا تو حقیقت کھل کر سامنے نہ آتی.

عقل کو حیران کردینے والے کیس کی کہانی . . .

معصوم قاتل

ساجد محمود

پرشکوہ لیکن شکستہ اور سال خوردہ گھر دور سے ہی اپنی زبوں حالی پر نوحہ کناں تھا۔ اس کے سامنے والے باغیچے میں خودرو گھاس اگی ہوئی تھی اور چند درختوں کی بے ڈھنگی شاخیں اسے پُراسرار بنا رہی تھیں۔ لگتا تھا سالوں سے اس کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ موسم بہار کی آمد آمد تھی لیکن اس گھر کی حالت دیکھ کر دیسے ہی سوگواریت کا تاثر ابھرتا تھا۔ درختوں کی شاخیں شاید کبھی نہ تراشی گئی تھیں اس لیے گھر کی بالائی منزل تک پہنچی ہوئی تھیں۔ مقام شکر تھا کہ کھڑکیاں ان شاخوں کی پہنچ سے دور تھیں ورنہ کسی بھی طوفانی موسم میں یہ ان کو توڑ ڈالتیں۔

یہ خستہ حال گھر ڈورج نامی پُرسکون سے گاؤں کی مرکزی شاہراہ پر واقع تھا۔ آج چونکہ موسم بہت خوشگوار تھا تو وہ بھی اسی جانب نکل آئی تھی۔ اس کا نام مارتھا تھا اور وہ ایک ساٹھ سالہ صحت مند خاتون تھی۔ جیکٹ پہنے اور سر پر ہیٹ رکھے وہ اپنی سائیکل پر احتجاج والی سائیٹ پر جارہی تھی جب راستے میں اس گھر کے پاس سے گزری تو اچانک اسے ایک
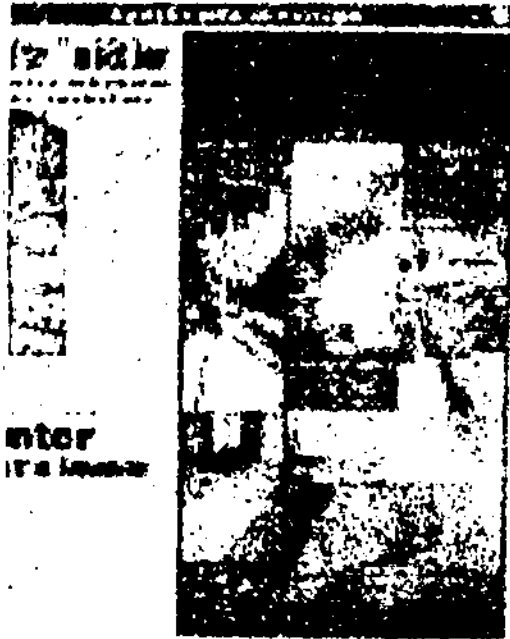
خیال آیا اور وہ سائیکل جھاڑیوں کے سہارے چھوڑ کر اس گھر کے باغیچے میں داخل ہونے لگی لیکن چھوٹا سا گیٹ زنجیر کے ذریعے مقفل تھا۔ وہ بڑی جھاڑیوں کا سہارا لے کر باغیچے میں کود گئی۔ جیکٹ کی جیب میں احتیاط سے ہاتھ ڈالا اور پھر ایک سفید رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھوں میں نظر آنے لگا۔ وہ لفافہ جو اسے دینا تھا۔ گھر کی نچلی منزل کی دو کھڑکیوں کے پردے سرکے ہوئے تھے۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی اور کنڈی کھٹکھٹانے لگی۔ گھر میں مکمل سکوت طاری تھا۔ مارتھا کو لگا جیسے کچھ انہونی ہوگئی ہو۔ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ کافی دیر تک کسی نے دروازہ نہ کھولا تو وہ آہستہ آہستہ ایک کھڑکی کی جانب بڑھی اور شیشے کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر جھانکا لیکن گھر کے اندر مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی، وہ دوسری کھڑکی کی جانب بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کوشش کرتے رہنے پر جب اس کی نظریں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں تو اسے ایک عجیب سا منظر نظر آیا۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس کا یقین کرنا انتہائی مشکل تھا۔ گھر کی جو سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں وہاں ایک انسانی جسم پڑا ہوا تھا اور کھلی آنکھیں کھڑکی کی جانب لگی ہوئی تھیں لیکن ساکت۔ گرنے والے کا سر فرش پر اور دھڑ اوپر کی جانب سیڑھیوں پر تھا۔ مارتھا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گھاس پر گر گیا۔ وہ بھاگ کر باغیچے سے باہر نکلی اور مدد کے لیے لوگوں کو بلانے لگی۔

☆☆☆

پولیس اور فرانزک ماہرین فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ اس کہن سالہ گھر کا دروازہ بھی قدیم زمانے کا لگتا تھا۔ پولیس والوں نے جب کندھوں سے ضربیں لگائیں تو فوراً ہی کھل گیا۔ محکمہ سراغ رسانی کے ساٹھ سالہ انسپکٹر جون اور بتیس سالہ سب انسپکٹر نیل اس واقعہ کے تفتیشی افسر تھے۔ گھر کے اندر دو لاشیں پائی گئی تھیں۔ مردانہ لاش کی حالت سے پتا نہ چل رہا تھا کہ آیا اس کو سیڑھیوں سے دھکا دیا گیا ہے یا وہ خود گرا ہے؟ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں اور کلائیوں پر بھی نیل نظر آرہے تھے۔ سیڑھیوں کے دائیں جانب وسیع و عریض کچن تھا جہاں سے ایک عورت کی لاش ملی تھی۔ فرش پر پڑی اس مردہ عورت کے دونوں ہاتھ سینہ دبائے ہوئے تھے اور چہرے پر تکلیف کے آثار نقش ہو گئے تھے۔ بادی النظر میں یہ دل کا دورہ لگتا تھا۔ مارتھا سے ابتدائی پوچھ گچھ ہو چکی تھی۔ اس کے مطابق وہ دونوں آنجہانی کو ذاتی طور پر جانتی تھی اور یہ کہ ان کی عمریں ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان تھیں۔

''بیچارہ ایبٹ اور للی پچھلے انیس سال سے اپنے مرحوم بیٹے مائیکل کا ماتم کر رہے تھے۔ ان کے گھر میں نہ گیس تھی، نہ بجلی اور نہ ہی ان کے گھر میں ٹیلی فون تھا۔'' مارتھا نے انسپکٹر جون کو اپنے نائب سے کچھ بات کرتے دیکھا تو خود ہی بات چیت شروع کر دی۔

''اچھا یہ بات ہے، اسی لیے میں نے بلب جلانا چاہا تو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ مسز مارتھا ان کے بیٹے کو کیا ہوا تھا؟''

جون نے استفسار کیا تو مارتھا فوراً شرماتے ہوئے بولی۔ ''مس مارتھا کہیں جی، میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔''

جون کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی اس لیے صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مارتھا کافی باتونی لگتی تھی۔

''مائیکل ان کا ایک ہی بیٹا تھا، عمر اس کی کوئی دس یا گیارہ سال رہی ہوگی۔ آج سے بیس سال پہلے گھر کے باہر سائیکل چلا رہا تھا کہ کسی کار کی ٹکر سے جاں بحق ہو گیا۔ ایبٹ اور للی اس حادثہ کو کبھی فراموش نہ کر سکے اور پھر یہ تنہائی پسند ہوتے چلے گئے۔ لوگوں سے ملنا ملانا بھی ختم کر دیا۔ آج میں ان سے بائی پاس رکوانے کی پٹیشن پر دستخط کروانے آئی تھی کہ سائیٹ پر احتجاج کرنے پورا گاؤں آرہا ہے تو وہ بھی آجائیں لیکن یہاں آکر انہیں اس حال میں پایا۔'' مارتھا نے پوری تفصیل بتائی۔

''مس مارتھا! جس لڑکے کا آپ بتا رہی ہیں اس کا پورا نام مائیکل ایبٹ ولسن تھا نا؟'' نیل نے پوچھا۔

مارتھا نے تائید میں سر ہلایا تو جون، نیل کی جانب مڑ کر بولا۔ ''نیل! کیا تم مائیکل کو جانتے تھے؟''

''یس باس! مائیکل مجھ سے جونیئر کلاس میں تھا جب وہ حادثے میں جاں بحق ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہم لوگ شہر شفٹ ہو گئے تھے۔''

سب انسپکٹر نیل کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔

''مجھے لگتا تھا کہ ایک دن ایسا ہولناک واقعہ ضرور ہوگا۔'' مارتھا نے دھیمے لہجے میں کہا تو انسپکٹر جون چونک پڑا۔

''مس مارتھا آپ یہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' جون کا لہجہ کریدنے والا تھا۔

''میں ایک ماہر نفسیات ہوں انسپکٹر، کئی باتیں مجھے

وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی محسوس ہو جاتی ہیں۔ یہ آخری واقعہ نہیں تھا، مجھے لگتا ہے مزید قتل و غارت گری ہوگی۔''

مارتھا نے عجیب تفاخر سے پیش گوئی کی جس پر جون نے کوئی دھیان نہ دیا۔ اسے شیخی بگھارنے والے لوگ پسند نہیں تھے۔ مارتھا کو جانے کی اجازت دے کر جون اور نیل گھر کی تلاشی میں مصروف ہو گئے۔ اوپر والی منزل پر چار کمرے تھے۔ بالکل سامنے والے کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی تھی جیسے یہاں کچھ جدوجہد کی گئی ہو۔ سیڑھیوں کے ساتھ دیوار پر انگلیوں کے نشانات تھے، تازہ خون دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی نے لاشعوری طور پر دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی ہو۔ کمروں میں الماریوں کا سامان کارپٹ پر بکھرا ہوا تھا۔ کچھ پرانے زمانے کے سوٹ کیس کھلے پڑے تھے ان کی زپ ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک کمرے کے بیڈ کے پاس کچھ گتے کے ڈبے رکھے تھے جن کا سامان نیچے پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ بظاہر یہ ڈکیتی اور قتل کی واردات تھی اور جون کو ہر صورت میں کسی ایسے سراغ کی جستجو تھی جس سے قاتل یا قاتلوں تک پہنچا جا سکے۔ مرنے والوں کے قریبی رشتہ دار بھی زندہ نہیں تھے جن سے اہم معلومات حاصل ہو سکتیں۔

سب انسپکٹر نیل کو کچن سے چند فریم ملے تھے جن میں سے تصاویر غائب تھیں۔ موقع پر موجود ہمسائیوں نے بتایا تھا کہ فریم میں ہمیشہ ان کے بیٹے کی تصاویر ہوتی تھیں۔ جون کو اب فکر لگ گئی کہ ایک مرے ہوئے بچے کی تصاویر کون چوری کر سکتا ہے؟ ایک اور بات بھی الجھن پیدا کر رہی تھی کہ کچن میں ڈائننگ ٹیبل کے گرد تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مالک مکان کو یا تو کسی تیسرے فرد کا انتظار تھا یا پھر وہ آکر جا چکا تھا۔

اتنے میں ایک ٹیکسی گھر کے باہر آرکی جس میں سے گھنگریالے بالوں والی، چست لباس میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی اتری۔ نیل اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ ایما تھی، اس کے بچپن کی دوست۔ ایما ابھی بھی اس گاؤں میں رہائش پذیر تھی اور اس وقت یہاں آنے کا مقصد جائے وقوعہ کی تصاویر بنانا تھا کیونکہ پولیس کا اپنا فوٹو گرافر کسی اور جگہ مصروف تھا۔ والہانہ استقبال کرنے کی وجہ سے نیل کی اس لڑکی کے لیے وارفتگی جون نے بھانپ لی اور پھر اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پھیلتا چلا گیا تھا۔ ایما کی نسوانی حس نے اسے جون کا رویہ سمجھا دیا تو وہ بولی۔ ''انسپکٹر جون! میں پیشہ ور فوٹو گرافر ہوں اور پہلے بھی پولیس کے ساتھ کام کر چکی ہوں، آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

جون نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ اپنا کیمرا سنبھال کر گھر کے اندر چلی گئی تاکہ اپنا فرض ادا کر سکے۔ اس دوران فرانزک ماہرین بھی شواہد اکٹھے کرتے رہے، خاص کر وہ انگلیوں کے نشانات ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

گاؤں میں دو اموات کی خبر جنگل میں آگ کی مانند پھیل چکی تھی اور تقریباً ہر ایک یہی سوال پوچھ رہا تھا کہ دو عمر رسیدہ کو کوئی کیونکر مار سکتا تھا؟ جون اور نیل نے اپنی مطلوبہ معلومات سب سے حاصل کر لی تھیں۔ نیل کو ایک ہمسائی نے یہ بھی بتایا تھا۔

''مائیکل کے مرنے کے بعد بھی گھر والے اکثر مائیکل مائیکل کہہ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ شاید بیٹے کی موت کا صدمہ انہیں نفسیاتی طور پر اندر سے جھنجوڑ گیا تھا۔''

ایما واقعی ایک ماہر فوٹو گرافر تھی، وہ وقوعے کی تمام تصاویر بنا چکی تھی، جاتے جاتے اس نے نیل سے پوچھا تھا۔

''جیک ایڈم کی ویڈنگ پارٹی آج رات کو ہے، تم آرہے ہو نا؟''

''ہاں مجھے بھی دعوت نامہ مل چکا ہے، کوشش کروں گا آنے کی۔'' نیل نے جون کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ کر ایما کو جواب دیا تھا۔

''ضرور آنا، سب دوست اکٹھے ہوں گے تو بہت مزہ آئے گا۔'' پارٹی میں آنے کی تاکید کر کے وہ چلی گئی۔

دونوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیجا جا چکا تھا اور اب جون اور نیل گاؤں کے تھانہ کی جانب رواں دواں تھے کہ کار کے ریڈیو پر پیغام موصول ہوا۔

''انسپکٹر جون! بائی پاس والی سائیٹ پر کچھ جھڑپ ہوئی ہے اور افراتفری کی اطلاع ملی ہے۔ انہوں نے پولیس کی مدد مانگی ہے۔''

''او کے! ہم تھانے کی جانب ہی آرہے ہیں۔ آپ ایسا کریں پولیس نفری فوراً وہاں بھیج دیں تاکہ کسی قسم کا جانی و مالی نقصان نہ ہو۔''

[illegible] کا شکریہ ادا کر کے جون نے ریڈیو بند کر دیا۔ ذررج گاؤں کے آغاز میں کچھ پرانے گھر تھے جو موٹر وے کا بائی پاس بنانے کی زد میں آچکے تھے۔ گاؤں والے ان متاثرین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر پُرامن احتجاج کر رہے تھے۔

☆☆☆

لوگ ہاتھوں میں لیے کارڈ اٹھائے نعرہ بازی کررہے تھے جبکہ بھاری مشینری کھدائی کا کام کرنے میں معروف تھی۔ احتجاج کرنے والوں کا موقف تھا کہ یہ کوئی والا ایک مکان کسی صورت نہ گرایا جائے۔ گھر کے سامنے کچھ لوگوں نے انسانی ہاتھوں کی زنجیر بنائی ہوئی تھی، ان میں مارتھا اور اس کی دوست ریتا سمن بھی تھی جس کا مکان گرانے بلڈوزر آیا تھا۔ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے پولیس کی بھاری نفری بھی موقع پر موجود تھی۔ اتنے میں ایک کالے رنگ کی کار تیزی سے دھول اڑاتی نمودار ہوئی اور پھر ایک جھٹکے سے احتجاج کرنے والوں کے سامنے جا رکی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک تندخو نوجوان کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور انسانی زنجیر میں شامل ایک لاغر سے لڑکے کو گریبان سے پکڑ لیا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری قیمتی کار پر لکیریں ڈالنے کی؟ کون بھرے گا اس کا نقصان؟" سوٹ والے نے غراتے ہوئے اس لڑکے کو بیدردی سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

مارتھا جلدی سے آگے آئی اور اس لڑکے کو چھڑاتے ہوئے چیخی۔ "مارک ایڈم، چھوڑو اسے..... گاڑی انسان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ تم ریتا کو گھر سے بے گھر کررہے ہو کچھ اس کا بھی تو سوچو۔"

"تم وحشی درندے ہو، انسان کے لباس میں شیطان ہو شیطان۔ میرا بیٹا گھر کیسے واپس آئے گا جب تم اسے گرا دو گے ہاں؟" ریتا بھی آگے آگئی اور نفرت سے چلاتے ہوئے بولی۔

"ہاہا! ریتا..... تم کوئی نئی بات بتاؤ جو مجھے پتا نہ ہو..... اور ہاں تمہارا بیٹا گیری اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔" تندخو نوجوان جس کا نام مارک ایڈم تھا، استہزائیہ انداز میں قہقہہ مار کر بولا۔ پھر مڑ کر کنسٹرکشن منیجر سے بولا۔ "مجھے کل تک یہ جگہ ہر صورت میں خالی چاہیے۔ کسی کی ہمدردی اور کوتاہی مجھے ہرگز منظور نہیں۔"

پولیس والے اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے تاکہ تو تو میں میں کی تکرار سے بچا جاسکے، مارک ایڈم شعلہ زن نظروں سے سب کو گھورتا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

مارتھا ہمدردی سے سہمے ہوئے لڑکے کی جانب پہنچی جو بیچارہ ابھی تک بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

"چارلی! کیا تم نے ہی مارک کی گاڑی خراب کی ہے؟" چارلی نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ اور پھر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ "اس جنگلی مارک کو اپنے گناہوں کا حساب ضرور دینا ہوگا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

☆☆☆

رات کے وقت اسٹار باکسنگ کلب میں بہت رش تھا۔ کچھ خواتین و حضرات شراب نوشی میں معروف تھے اور کچھ باکسنگ پر طبع آزمائی کررہے تھے۔ مارک ایڈم نے اسے دیکھا تو چلا کر بولا۔ "آہا! دیکھو دیکھو پولیس والا بھی آگیا۔"

سب انسپکٹر نیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "مارک! تم کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہارا بھائی جیک ایڈم بھی میرے ساتھ پولیس فورس میں کام کرتا رہا ہے۔"

"ہونہہ اس نے جو معرکے سرانجام دیے تھا مجھے خوب پتا ہے۔" مارک نے نخوت سے کہا۔

"آؤ نیل تمہارا ہی انتظار تھا یار، سنا ہے آج تمہارا دن کافی معروف گزرا ہے۔" جیک نے اسے دیکھا تو فوراً استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا۔ مارک کے زہریلے فقرے اسے تاؤ دلا چکے تھے۔

نیل پورے دن کا تھکا ہارا تھا، جون کے ساتھ تھانے میں معروف رہا تھا تاکہ کیس کا ابتدائی کام مکمل کیا جاسکے۔ فرانزک شواہد کی غیر حتمی رپورٹ کے مطابق ایبٹ کو سیڑھیوں سے دھکا دیا گیا تھا یا وہ خود توازن کھو بیٹھا تھا اور پھر پشت کی جانب نیچے گر گیا تھا۔ جس سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ للی کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی۔ اب پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی یہ عقدہ کھول سکتی تھی کہ پہلے للی کی موت واقع ہوئی یا ایبٹ کی اور ان اموات کی اصل وجہ کیا تھی۔ جون تھوڑا سخت گیر قسم کا انسپکٹر تھا، نیل بڑی منتیں کرکے پارٹی کی اجازت لے کر وہاں پہنچا تھا۔

"کیا یہ جنگلی بھی تمہاری شادی میں شامل ہوگا؟" نیل نے جیک کی بات کو یکسر نظرانداز کرکے سوال پوچھا۔

"ہاں یار! یہ تو میرا گواہ بھی ہے۔"

جیک یوں بولا جیسے مارک کو گواہ بنانا اس کی مجبوری رہی ہو۔

"لیکن ڈونا تو اس کے ساتھ رہ رہی تھی نا پہلے؟ مجھے یاد ہے..... پھر اس نے جب ڈونا کو تشدد کا نشانہ بنایا تو ہم دونوں نے ہی مارک کو گرفتار کیا تھا۔" نیل نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یار اسی لیے تو ڈونا اب مجھ سے شادی کررہی ہے۔ مارک پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔" جیک نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

اسی وقت ڈونا بھی سفید رنگ کے پارٹی ڈریس میں ہال میں داخل ہوئی۔ اس نے سر کے اوپر ایک سفید رنگ کا تاج پہنا ہوا تھا۔ ڈونا دراز قامت اور خوبصورت لڑکی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کوئی شہزادی ابھی تاج پوشی کی تقریب سے واپس آئی ہو۔ اس کی ساتھی لڑکیوں کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سب اپنی اپنی پسند کے مشروبات سے دل بہلانے لگے۔ جیک کی آج رات اسٹیگ پارٹی تھی تو ڈونا کی ہین پارٹی۔ ایسے میں دونوں کے قریبی دوست اور عزیز و اقارب مدعو تھے۔

رات نو بجے کے قریب اسٹار باکسنگ کلب سے لڑکوں اور لڑکیوں کا گروپ ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ایڈم فیملی کے گھر کے قریب رائن پب میں جا رہا تھا جہاں رات گئے تک پارٹی جاری رہتی۔ اگلے دن شام کے وقت جیک اور ڈونا کی شادی کی ریسیپشن دی جارہی تھی۔

جب لڑکوں کا گروپ رائن پب پہنچا تو وہاں بھی احتجاج کرنے والے کچھ لوگ پلے کارڈ اٹھائے کھڑے تھے۔ مارتھا اور چارلی کو دیکھ کر مارک ایڈم بھڑک اٹھا۔ مارتھا کو ایک جانب دھکیلتا ہوا وہ چارلی پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ سے پلے کارڈ چھین لیا اور اسے مغلظات بکتے ہوئے مارنے کو دوڑا۔ سب انسپکٹر نیل اسے نہ روکتا تو شاید چارلی کا سر پھٹ چکا ہوتا۔ مارک چونکہ شراب کے نشے میں دھت تھا اس لیے وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ اس کی پرانی محبوبہ اب اس کی بھابی بننے جارہی تھی تو اسی غم میں وہ جام پر جام چڑھاتا چلا گیا تھا۔

تمام مہمان اپنی گاڑیوں یا ٹیکسیوں میں آنا شروع ہوگئے تھے۔ ایما بھی اپنا کیمرا سنبھالے دلہن اور اس کی سہیلیوں کی مختلف پوز میں تصویریں لینے میں مگن تھی۔ ڈونا کی خرمستیاں تو دیکھنے لائق تھیں، وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

"ایما! تمہیں پتا ہے میں اتنی خوش کیوں ہوں؟"

جب سب سہیلیاں پب کے اندر چلی گئیں تو ڈونا نے اسے بازو سے پکڑا اور ایک بینچ پر جا بیٹھی پھر دونوں دوستوں میں راز و نیاز کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

"ظاہری بات ہے بھئی، تمہاری شادی ہورہی ہے، تم خوش نہیں ہوگی تو کیا محلے والے خوش ہوں گے۔" ایما نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں بدھو، میں اور جیک شادی والی رات یہاں سے بھاگنے والے ہیں۔ ہم اب تمام وعدوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔" ڈونا نے سنجیدگی سے بتایا تو تھوڑی دیر کے لیے ایما کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

جب ایما اور ڈونا پب کی جانب بڑھ رہی تھیں تو اسی وقت ڈونا کے موبائل فون پر کوئی ٹیکسٹ میسج آگیا۔ اس نے میسج دیکھا اور پھر ایما کو اندر جانے کا کہہ کر خود وہ پب کے عقبی باغیچے کی جانب چلی گئی جہاں برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ سب سے بے خبر کوئی دور درختوں کے ذخیرہ میں دو آنکھیں سب کی جانب دیکھ رہی تھیں!

☆☆☆

سائیٹ پر اس وقت مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جہاں دن کو بھاری مشینری زمین کی کھدائی اور پھر اسے ہموار کرنے میں معروف تھی، وہیں رات کو دھندلی روشنیوں میں تمام مشینیں ایک جانب ایستادہ تھیں۔ ریتا سمن کے گھر کے ارد گرد بیریئر لگے ہوئے تھے اور کچھ لوگ زمین پر سلیپنگ بیگز میں سو رہے تھے۔ وہ سائیٹ کو کسی بھی طور چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے تھے مبادا ان کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریتا کا گھر گرا دیا جائے۔

مارتھا نے سائیکل کی گھنٹی بجائی تو ریتا اٹھ کر بیریئر کے پاس گئی۔

"چارلی تو یہیں نہیں آیا؟" مارتھا کا سانس چڑھا ہوا تھا اور اس کی آواز سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

"ہاں آیا تو تھا، کیا ہوا مارتھا..... کیا وہاں لڑائی ہوگئی تھی؟ چارلی کہہ رہا تھا مارک ایڈم نے اس کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ پتا نہیں تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ یہیں تھا اب نظر نہیں آرہا۔" ریتا نے پریشانی سے مغلوب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ گاڈ، اسی بات سے تو میں ڈر رہی تھی۔ میں اب گھر جارہی ہوں اگر چارلی واپس آئے تو اسے کہیں جانے مت دینا۔" مارتھا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ریتا کو یقین تھا کہ ایک دن گیری ضرور واپس آئے گا اس لیے گھر کی اتنی زیادہ قیمت کی پیشکش ملنے کے باوجود بھی امید کا دامن نہ چھوڑ رہی تھی۔ اس کی بے قرار ممتا کو تبھی چین آتا جب اسے اپنے بیٹے کی کوئی خبر ملتی۔ صبح صادق کے وقت مارتھا اپنی سائیکل پر گھر جانے لگی۔

اس وقت پانچ بجے کا وقت تھا جب مارتھا نے رائن پب کے باہر لگے قدآدم گھڑیال کو دیکھا۔ پارٹی منانے والے تمام لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے تھے اور اس وقت چاروں اطراف صرف الو ہی بول رہے تھے۔ ریتا بھی اپنے آپ کو الو

محسوس کر کے مسکرا دی۔

مارتھا جلدی جلدی پیڈل مارتے ہوئے مارک ایڈم کے بنگلے کے پاس پہنچی تو دور سے ہی اس کی ڈرائیو وے میں کھڑی سیاہ رنگ کی قیمتی گاڑی نظر آ گئی۔ ہلکی ہلکی روشنی میں جو کچھ اسے نظر آیا اسے دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ گاڑی کے اوپر کسی نے خون پھینکا ہوا تھا یا پینٹ؟ یہ یقین کرنے کے لیے اس نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور گاڑی کے قریب چلی گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مارک بیٹھا ہوا تھا۔ مارتھا نے اسے متوجہ کرنے کے لیے کار کا شیشہ ہاتھ سے بجایا لیکن مارک نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے گاڑی کا ہینڈل کھینچا تو دروازہ کھل گیا لیکن ساتھ ہی مارک کا جسم بھی کار سے باہر آ گرا۔ مارتھا نے چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اٹھا لیا، ساتھ ہی وہ لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔ مارک ایڈم کا وجود بے جان تھا اور اس کی سفید شرٹ خون سے رنگین تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر جون کلی طور پر اندھیرے میں تھا۔ دو انسان اس دنیا سے چلے گئے تھے لیکن قاتل کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کی نگاہ ہر ایک تفصیل پر تھی۔ ایبٹ کے کچن میں تیسری کرسی کی موجودگی اس کا دماغ الجھا رہی تھی۔ جس واقعے کو وہ عام چوری اور قتل کی واردات سمجھ رہا تھا ایسا حقیقت میں تھا نہیں۔ گھر میں مقتولین کے علاوہ بھی کچھ فنگر پرنٹ ملے تھے جن کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں ملا تھا۔ کچن میں کچھ کرنسی نوٹ بھی پڑے ہوئے ملے، اگر یہ چوری کی واردات ہوتی تو کرنسی وہاں موجود نہ ہوتی۔ واردات کرنے والے جو بھی تھے انہیں شاید کسی خاص چیز کی تلاش تھی اس لیے گھر کے ہر کمرے میں ہر شے الٹ پلٹ نظر آئی تھی۔ رات کافی دیر تک فائلوں کے مطالعے سے اسے معلوم ہوا تھا، گاؤں کے ایک امیر کبیر کا شکار ایڈم کی بے قابو گاڑی سے ایبٹ اور للی کے بیٹے مائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی جان گئی تھی۔ عدالت نے تو اسے چھوڑ دیا لیکن ایڈم بھی کسی ذہنی دباؤ میں آ کر خودکشی کر بیٹھا تھا۔ مائیکل کی موت کے کچھ عرصہ بعد ریٹا کا بیٹا گیری لاپتا ہوگیا۔ کہا جاتا تھا کہ گیری کو آخری بار مارک ایڈم، جیک ایڈم، ڈونا اور ایما کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ گیری کی گمشدگی تا حال ایک معاملہ ہوئی تھی۔

جون کے پاس مائیکل کے بچپن کی کافی ساری تصاویر فائل میں موجود تھیں۔ حیرت انگیز طور پر گیری کی ایک تصویر بھی اس کی فائل میں موجود نہیں تھی۔ جون نے فیصلہ کرلیا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ ریٹا کے پاس جائے گا اور گیری کی تصاویر طلب کرے گا۔ اسے سب انسپکٹر نیل کے دوست جیک ایڈم پر شک تھا کہ ہوسکتا ہے اس نے گیری کی تصاویر کہیں غائب کروادی ہوں۔ جیک ایڈم، نیل کے ساتھ گاؤں کے تھانے میں کافی عرصہ تعینات رہا تھا بعد میں مارک کے کنسٹرکشن بزنس میں مدد کے لیے اس نے پولیس فورس سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ جون تمام تفتیش کھلے ذہن سے کرنے کا عادی تھا۔ موجودہ کیس اس کے لیے ایک چیلنج تھا۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھا لیکن کسی کیس کی تفتیش کرتے ہوئے دیر سویر ہوجایا کرتی تھی۔ آج بھی جب وہ گدھے گھوڑے بیچ کر سویا تو پھر اپنی پیاری بیوی سونیا کے جھنجوڑنے سے ہی جاگا۔ مارک ایڈم کے قتل کا سن کر جون فوراً ہی خواب خرگوش میں سے نکل کر ہوش وحواس کی دنیا میں آگیا۔

☆☆☆

مہذب معاشرے میں جب نئی نئی آبادیاں بسائی گئیں تو مذہبی عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ پبلک ہاؤس بھی بنائے جاتے تھے جو بعد میں پب کہلائے جانے لگے۔ ان پبوں میں کھانے پینے کا مکمل انتظام ہوتا تھا۔ صبح کے ناشتے سے لے کر رات گئے تک کی پارٹیوں کے لیے سارا بندوبست کیا جاتا تھا۔ رابن ہڈ پب بھی ڈورج کا سب سے بڑا پب تھا اور عموماً بڑے بڑے فنکشن وہاں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ جہاں گزشتہ رات مارک اور جیک کے دوست احباب ہلا گلا کرنے جمع تھے اگلے دن صبح سویرے مارک کی ناگہانی موت پر افسوس کیا جارہا تھا۔ پولیس نے مارک کے گھر کے اردگرد کا علاقہ نیلے رنگ کی ٹیپ لگا کر بند کردیا تھا۔ شواہد محفوظ کرنے کی خاطر ایسے اقدامات نہایت ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔

نیل نے رات کے وقت رونما ہونے والے تمام واقعات جون کے گوش گزار کردیے تھے۔ مارک کی گاڑی پر سرخ رنگ کا پینٹ ڈالا گیا تھا جس کا ڈبا وہاں جھاڑیوں میں پڑا مل گیا تھا۔ گاڑی کے پاس ہی بوٹوں کے نشانات تھے۔ قیاس تھا کہ جس نے گاڑی پر پینٹ پھینکا اسی نے مارک کو قتل کیا ہوگا۔ زمین پر لاش گھسٹنے کے نشانات سے اندازہ ہورہا تھا کہ اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا اور پھر لاش گاڑی تک لائی گئی تھی۔ چھاتی میں زخموں سے اندازہ ہورہا تھا جیسے کسی نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو تیز دھار چھری یا چاقو سے ضربیں لگائی تھیں۔ یہ انتقامی کارروائی بھی ہوسکتی تھی۔

''نیل یہ مارک کی کلائی پر مندمل زخم کا نشان کیسا

ہے؟'' جون نے مارک کی بائیں کلائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ایما بھی پولیس کی مدد کرنے وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بھی قریب ہی تھی جب جون نے نیل سے کلائی پر نشان کے متعلق استفسار کیا تھا۔ ایما نے لاشعوری طور پر اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کرلیے اور لاتعلق سی نظر آنے لگی۔

''مجھے تو کچھ پتا نہیں شاید ایما کو پتا ہو۔'' نیل نے ایما کو دیکھ کر کہا۔

''مم مجھے بھی کچھ پتا نہیں۔'' ایما نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور پھر مصروف نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

مارک کی بیوہ کلارا بھی پولیس کی آمد کے بعد پہلی بار گھر سے باہر آئی تھی۔ مارک کی دو ہی بیٹیاں تھیں جن کی عمریں چار اور پانچ سال تھیں۔ دونوں گھر کے اندر سے کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر پولیس والوں کی ساری کارروائی دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے پتا تھا ایک دن مارک ایسے ہی مارا جائے گا۔ اس نے دوست تھوڑے اور دشمن زیادہ بنا رکھے تھے۔ اور یہ سب کیا دھرا اس جیک اور ڈونا کا ہے۔''

کلارا نیل کو جانتی تھی چنانچہ بات بھی اسی سے شروع کی تھی۔

''یہ منحوس یہاں کیا کر رہی ہے؟'' ایما کی جانب دیکھ کر وہ چلائی۔

''پولیس کی مدد کرنے آئی ہے ایما۔'' نیل اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

''مجھے اس پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے۔ مارک کہتا بھی تھا کہ اگر مجھے کسی نے مارا تو وہ جیک، ڈونا یا ایما میں سے کوئی ہوگا۔'' کلارا کے منہ سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ یہ لوگ تو پارٹی میں تھے؟'' نیل نے بولنا چاہا۔

''جیسے تمہیں ان چاروں کے خفیہ گروہ کا پتا نہ ہو......''

کلارا نے چیختے ہی لہجے میں سوال کیا اور مڑ گئی پھر وہاں سے پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

فارینزک ماہرین تمام شواہد اکٹھے کرنے میں لگے ہوئے تھے تو جون کی توجہ وہاں موجود لوگوں کی جانب مبذول ہوگئی۔ ان لوگوں میں مارتھا بھی کھڑی تھی۔ جون سے نظریں چار ہوئیں تو فوراً آگے بڑھ آئی۔

''آئی ایم سوری مسٹر جون! میں نے کہا تھا نا کہ مزید اموات ہوں گی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک اور لاش بھی مجھے ہی نظر آئے گی۔'' مارتھا کی نگاہوں میں ندامت کے آثار نمایاں تھے۔

''مس مارتھا آپ کہاں سے آرہی تھیں اور آپ نے کیا دیکھا؟''

جون کے پاس اتنا لمبا چوڑا وقت نہیں تھا کہ مارتھا کی کہانیاں سنتا رہتا اس لیے اس نے فوراً مطلب کے سوالات کرنا شروع کردیے۔ مارتھا نے مارک کے ٹیکسی پر آنے، چارلی پر حملہ کرنے، جیک کی بے عزتی کرنے سے لے کر سائیٹ پر چارلی کو ڈھونڈنے جانے تک کے تمام حالات بتا دیے۔

جون نے تمام اہم باتیں اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیں اور پھر مارتھا کو جانے کی اجازت دے دی لیکن وہ گھر جانے کی بجائے واپس سائیٹ پر چلی گئی جہاں مشینیں پھر سے چل رہی تھیں اور احتجاج کرنے والے لوگ بھی بیدار ہوچکے تھے۔ مارتھا نے ریٹا کو مارک کے قتل کا بتایا تو وہ خوشی سے اچھلنے لگی اور سب لوگوں کو اکٹھا کر کے بتانے لگی۔

''شیطان مرگیا، شیطان مرگیا...... شکر ہے اس شیطان سے جان چھوٹی، اب میرا گھر بچ جائے گا اور پھر جب میرا بیٹا گیری آئے گا تو میں سب کو خوشی خوشی بتاؤں گی۔''

''ریٹا خدا کا خوف کرو بھئی! ایک انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور تم خوش ہو رہی ہو۔ تمہارا گھر مارک نہیں گرانے آرہا تو کوئی دوسرا بندہ آ کر گرا دے گا۔'' مارتھا نے اس کی سرزنش کی۔

''مارتھا مجھے تمہاری ایک ایک بات کا یقین ہے، جو کچھ تم نے کہا وہی ہو رہا ہے۔ دیکھنا میرا بیٹا ضرور واپس آئے گا۔'' ریٹا ممتا کی ماری تھی اسے کسی اور کے دکھ درد کا اب کوئی احساس نہ رہا تھا۔ شاید وہ بے حس ہوچکی تھی۔ اولاد کی جدائی کا دکھ وہی جانتے ہیں جن کے جگر کے ٹکڑے ان سے چھین لیے جائیں یا لاپتا کردیے جائیں۔

مارتھا نے جب تفصیل بتانا شروع کی تو چارلی بھی وہاں آنکلا۔ اس کے کپڑے مٹی سے اٹے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں خونی کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ لگتا تھا اسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انسپکٹر جون اور نیل بھی آگئے۔ نیل نے شاید جون کو بتادیا تھا کہ مارتھا کے ساتھ جولڑکا ہے وہ چارلی ہے۔

''چارلی! میں تمہیں ہی ملنے آیا تھا۔ اوہ ہو! تمہارے بوٹوں پر یہ سرخ پینٹ...... کہیں تم نے ہی تو مارک کی گاڑی پر

پینٹ نہیں گرایا؟" جون نے جب چارلی سے بات شروع کی تو اچانک نظر اس کے بوٹوں پر بھی چلی گئی تھی۔

چارلی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن نیل نے اسے بھاگنے نہ دیا اور زمین پر گرا کر ہتھکڑی لگا دی۔

ریٹا جلدی سے آگے بڑھ آئی اور جون سے چارلی کو چھوڑنے کا مطالبہ کرنے لگی۔

"احتجاج آپ لوگوں کا حق ہے لیکن بائی پاس یہاں ضرور بنے گا آپ لوگ چاہے کچھ بھی کر لیں۔" جون کو ان کی مزاحمت پسند نہیں آئی تھی اس لیے سختی سے بولا تھا۔

"کم از کم آپ تو ہمارا ساتھ دیں انسپکٹر! یہ بھی تو سوچیں اگر گھر گرا دیا گیا تو میرا بیٹا کیا کرے گا جب وہ اپنی دکھیاری ماں کو ملنے آئے گا۔ یہ گھر نہ ملا تو میرا بچہ کہاں ٹھوکریں کھائے گا؟" ریٹا نے روتے ہوئے دہائی دی اور اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

"مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے لیکن میں اس وقت تین لوگوں کی موت کی تفتیش کر رہا ہوں اس لیے چارلی کو تھانے لے جانا میری مجبوری ہے۔"

☆☆☆

"یہ سب کیا ہے ڈونا؟" ایما نے دو تصاویر اس کے سامنے ٹیبل پر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

ڈونا کی نظر ان تصاویر پر پڑی تو وہ چونک اٹھی۔ دور کا پوز تھا لیکن صاف نظر آ رہا تھا وہ مارک کے ساتھ ایک جگہ کھڑی ہے، دوسری تصویر میں دو بوس و کنار کرتے نظر آئے۔

"اوہ ایما! مارک نے مجھے ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا کہ وہ مجھے پب کے باہر ابھی ملنا چاہتا ہے۔ جب میں اس سے ملنے پہنچی تو وہ میرے ساتھ زبردستی کرنے لگا۔ میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگی تھی۔ کاش میں اس کے ساتھ ہی رات تو یوں وہ اپنی جان سے نہ جاتا۔" ڈونا نے تاسف سے کہا پھر تیز لہجے میں بولی۔ "لیکن تم نے ہماری تصاویر کس وقت بنائیں اور کیوں؟"

"مجھے ملامت سمجھنا، اصل میں میرا کیمرا بیک یارڈ پر رہ گیا تھا وہی لینے باہر آئی تھی تو مارک کو باغیچہ میں تمہارے پاس جاتے دیکھا اسی لیے زوم اِن کر کے کچھ تصاویر بنا لیں۔ سب انسپکٹر نیل نے بھی اسٹوڈیو آنا ہے اس لیے سوچا پہلے تمہیں بھی یہ تصاویر دکھا دوں۔ ہم بچپن کے دوست ہیں ڈونا۔ ہمارا ایک دوست، مارک قتل ہو گیا ہے۔ پولیس والے ہر زاویے سے تحقیق کریں گے۔"

ایما پیشہ ور فوٹوگرافر تھی، اس کے پاس جدید کوالٹی کے بہترین کیمرے تھے۔ ڈونا کو تمام تفصیل بتا کر وہ واپس اپنے اسٹوڈیو میں چلی گئی۔ یہ اسٹوڈیو ایما نے اپنے گھر کے لونگ روم میں ہی بنایا ہوا تھا۔ نیچے سارا آفس بنا ہوا تھا اور اوپر کے کمروں میں اس کی رہائش تھی۔ ایما غیر شادی شدہ تھی اور اپنی ماں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کی ماں ان دنوں اپنے بھائی کے پاس لندن گئی ہوئی تھی۔

کسی خیال کے تحت ایما نے لیپ ٹاپ آن کر لیا اور تمام فنکشن کی تصاویر دیکھنے لگی۔ ایک تصویر پر اس کی نظر ٹک گئی۔ بینچ پر کچھ لڑکیاں پوز بنائے کھڑی تھیں لیکن دور بیک گراؤنڈ میں کسی انسان کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تصویر کو زوم کر کے دیکھا تو درختوں کے درمیان سیاہ لبادہ اوڑھے کوئی کھڑا تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس کی پہچان کرنا مشکل تھا۔ ایما جدید زمانے کی لڑکی تھی، بھوت پریت پر اس کا اعتقاد کم ہی تھا لیکن اندر سے وہ گھبرا گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نیل بھی آ گیا۔ اسے خوش آمدید کہا اور پھر ایک جانب پڑے صوفوں پر دونوں بیٹھ گئے۔

"مارک کی موت کا بہت زیادہ افسوس ہے۔ وہ جیسا بھی تھا ہمارا دوست تھا۔" نیل نے افسوس کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"نیل تمہیں بھوتوں پر کتنا یقین ہے؟ میرا مطلب ہے۔ ہمارے گاؤں میں تین انسان مر چکے ہیں اور ابھی تک پولیس کی جانب سے کوئی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔" ایما نے اس کی بات شاید بے خیالی میں سنی ان سنی کر کے وہ سوال پوچھ لیا جو کافی دیر سے اسے کشمکش میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

"تم کھل کے بات کرو، یہ بھوت پریت کا ذکر کہاں سے نکل آیا؟" نیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ایما جیسے ہوش میں آ گئی۔

ایما نے ویسے ہی بات گھمانا بہتر سمجھا۔ نیل کو جن تصاویر کی ضرورت تھی وہ اس نے پرنٹ نکلوا کر ایما سے رسید لے لی تاکہ پولیس کے اکاؤنٹ سے اسے معاوضہ دیا جا سکے۔ نیل تھوڑی دیر وہاں رکا رہا پھر جون کا فون آ گیا تو وہ اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

چارلی کا تھانے میں انٹرویو ریکارڈ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ جون اور نیل نے اپنے اپنے سوالات تیار کر رکھے تھے تاکہ چارلی سے اعتراف جرم کروایا جا سکے۔

"تم پولیس کو دیکھ کر بھاگے کیوں تھے چارلی؟" جون کا پہلا سوال ہی معنی خیز تھا۔

چارلی خاموشی سے جون کو دیکھنے لگا تو جون نے بات آگے بڑھائی۔ "ہماری معلومات کے مطابق تم نے مارک کی گاڑی پر لکیریں ڈالیں بعد میں پب کے باہر بھی تم لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ تمہارے جوتوں پر لگا پینٹ اور مارک کی گاڑی پر پھینکا گیا پینٹ ایک جیسا ہے۔ آلۂ قتل تم نے کہاں پھینکا؟"

"میں مانتا ہوں کہ مارک کی گاڑی کو نقصان میں نے پہنچایا اور پینٹ بھی میں نے پھینکا لیکن اسے قتل میں نے نہیں کیا۔ میں نے تو اسے بعد میں دیکھا بھی نہیں۔" چارلی نے فوراً تردید کی لیکن اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ چکا تھا۔

"کچھ لوگوں نے بیان دیا ہے کہ تم نے مارک کے لیے کئی بار ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے تمہارا انتقامی رویہ سمجھ میں آتا ہے اس لیے پولیس کے خیال کے مطابق یہ انتقامی کارروائی تم نے ہی کی ہے؟" اس بار نیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تھا۔

"یہ بات سچ ہے کہ مجھے مارک سے شدید نفرت تھی لیکن اسے قتل کرنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔" جون نے چارلی کا جواب سنا تو مسکرانے لگا۔

چارلی منگل پسلی کا نوجوان تھا لیکن انتقام ایسا جذبہ تھا کہ کمزور کو بھی طاقتور بنا سکتا تھا۔ ایک حقیری چیونٹی ہاتھی جیسے جانور کی موت کا باعث بن سکتی تھی اور چارلی تو جیتا جاگتا انسان تھا۔

چارلی کے انٹرویو کے بعد بھی پیش رفت نہ ہو سکی کام کی صرف ایک ہی بات پتا چلی کہ جب چارلی مارک کی کار پر پینٹ پھینکنے جا رہا تھا، وہ دلہن کے لباس میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ پب کے باہر باغیچہ میں کھڑا ہوا تھا اور دونوں قابل اعتراض حرکات میں مصروف تھے۔ اس کے بعد چارلی کو فی الحال جانے دے دیا گیا۔ اسے سختی سے بتایا گیا تھا کہ وہ مشتبہ ہے اس لیے گاؤں سے باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔

چارلی کے جانے کے بعد جون اور نیل جیک کے گھر چلے گئے۔ ڈونا بھی اس کے گھر میں موجود تھی۔ جون نے جاتے ہی مارک کے بارے پوچھا۔

"آخری بار آپ دونوں نے اسے کب زندہ دیکھا تھا؟"

"تقریباً دس اور گیارہ کے درمیان۔" جیک نے سوچتے ہوئے بتایا جس پر نیل نے اسے ٹوک دیا کہ وہ خود گیارہ بجے پب کے اندر داخل ہوا تھا اس نے کب دیکھا۔

جیک بغلیں جھانکنے لگا۔

جون نے اس بار ڈونا سے پوچھا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"کیا مارک نے آپ کو فون کیا تھا ڈونا۔"

ڈونا جز بز سی نظر آئی شاید وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ "نہیں فون تو نہیں آیا تھا ہاں اس نے ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا۔"

ڈونا نے میسج کا ذکر کیا تو جیک نے چونک کر ڈونا کو دیکھا تھا۔

"کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ اس کا میسج کس بارے میں تھا؟"

ڈونا سے پھر سوال پوچھا گیا تو وہ بولی۔ "مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا کہ اس نے کیا لکھا تھا۔"

جون نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "فکر نہ کریں موبائل فون کا ریکارڈ آج ہی مل جائے گا پھر شاید سب یاد آ جائے۔"

جیک نے بتایا کہ مارک کے قتل کے صدمے کی وجہ سے وہ اپنی شادی کینسل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن اہل خانہ اور باقی دوستوں کے اصرار پر اس نے رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ پارٹی کے لیے ہال بک ہو چکا تھا اور تمام لوازمات کی پے منٹ بھی ہو چکی تھی۔ ساتھ ساتھ مہمانوں کو دعوت بھی دی جا چکی تھی۔ نیل کو گواہ بننے کی خواہش کا اظہار بھی جیک نے کر دیا تھا۔ نیل نے فی الحال کوئی بھی مثبت جواب نہ دیا اور دونوں وہاں سے چل پڑے۔

واپسی جاتے ہوئے جون بولا۔ "تم ضرور اس کے گواہ بنو نیل۔ جیک بھی اس کیس میں مشتبہ ہے اور اسے بھی گاؤں سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ فی الحال اس کا ہنی مون پر جانے کا پروگرام بھی مشکل ہو گا۔ ہاں شادی کر لے تو بہتر ہے۔ مارک کی لاش ... تک تو ملنا ناممکن امر ہے۔ جب تک قتل کا تعین اور سبب پتا نہیں چل جاتا عدالت کفن دفن کی اجازت نہیں دے گی۔"

جون کی مزید ہدایات بھی نیل کا انتظار کر رہی تھیں۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تینوں اموات کا تعلق مائیکل کی موت اور گیری کی گمشدگی سے ضرور ہے۔ مارتھا کی باتوں سے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔ جیک کی پارٹی میں شامل لوگوں نے کسی ماورائی ہاتھ کا شبہ بھی ظاہر کیا ہے۔ گاؤں کی

حیثیت سے تم جیک کے قریب جاؤ گے اور گیری کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرو گے۔"

"مجھے پارٹی میں شامل تمام خواتین و حضرات کے بیانات چاہئیں اور ہاں تمہارا اپنا بیان بھی مجھے آج ہی مل جانا چاہیے۔" آخری بات جون نے سخت لہجے میں کہی تھی۔

"یس! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایما بھی کچھ ایسا بتا رہی تھی لیکن پھر بتاتے بتاتے خاموش ہو گئی۔ بیانات کے بارے میں فکر نہ کریں، وہ میں سب کر لوں گا۔" نیل نے ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا اور پھر گھر جانے کی اجازت چاہی۔

جون کو اوپر سے احکامات ملے تھے کہ نیل کو تفتیش میں شامل رکھنے کا خطرہ مت مول لے کیونکہ وہ اسی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے اور کسی بھی بے احتیاطی سے پولیس کا نام بدنام ہو سکتا ہے۔ ایسی باتیں میڈیا سے نہیں چھپ سکتیں۔ جون نے ایسے تمام احکامات مسترد کر کے نیل کو اپنی ذمہ داری پر ساتھ ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایبٹ کے چرچ میں تیسری کرسی اور پھر کسی تیسرے بندے کے قتل نے بھی جون کے دماغ کو چکرا رکھا تھا۔ مارک کے قتل کی تفتیش بھی بند گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آرہا تھا۔ یہ پہلا کیس تھا جس نے جون جیسے ماہر سراغ رساں کو بھی چکمہ دے رکھا تھا اور ابھی تک تگنی کا ناچ نچائے ہوئے تھا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی حتمی رپورٹ نیل کو مل چکی تھی جس کے مطابق ایبٹ کی موت گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر لگے خون کے ڈی این اے ٹیسٹ سے ایک اور سیمپل بھی ملا تھا جس کا پولیس ریکارڈ نہیں مل سکا تھا۔ سیڑھیوں اور دیوار پر لگے نشانات بھی کسی بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کا عندیہ دے رہے تھے۔ للی کی موت کا سبب دل کا دورہ تھا۔ فرانزک ماہرین کے مطابق ایبٹ کا قتل کنفرم ہو گیا تھا تو اب پولیس کو ہر صورت میں ایبٹ اور مارک کے قاتلوں کو گرفتار کرنا تھا۔ نیل یہ رپورٹ پڑھ ہی رہا تھا جب ایک پولیس کانسٹیبل آ گیا۔

"سر! جیک ایڈم آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے بس ویری ارجنٹ۔"

پولیس والے نے کہا تو نیل فوراً جیک کو دیکھنے تھانے کے سامنے والے حصے میں آ گیا۔

"خیریت تو ہے جیک؟" نیل نے پوچھا۔

جیک کو گم صم نظر آرہا تھا۔

"کیا ہم کسی قریبی بار میں چل کر آرام سے بات کر سکتے ہیں؟" جیک عجیب انداز میں بولا تو نیل اس کے ساتھ اسی روڈ پر بنے ایک بار میں آ گیا۔

نیل نے اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا جبکہ جیک نے وائن کا گلاس منگوا لیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے مشروب سے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے باتوں میں مشغول ہو گئے۔

"یہ میرے اور ڈونا کے پاسپورٹ اور ہنی مون ٹکٹ ہیں، ہم چونکہ اب جا ہی نہیں سکتے تو یہ اپنے پاس رکھ لو۔" جیک نے ایک لفافہ نیل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ اچھا کیا ہے، جون کا شک تم دونوں پر پکا ہے۔ بہتر ہے جب تک تفتیش چل رہی ہے تم دونوں اس علاقے سے دور کہیں بھی نہ جاؤ۔"

نیل نے لفافہ کھولا، پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھے۔ پھر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ ایبٹ اور للی کی موت اور مارک کے قتل کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟" نیل نے جیک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مارک کی عادات ایسی تھیں کہ اس کا ایک دن یہی انجام ہونا تھا۔ اس بارے میں اب میں مزید کیا بتاؤں۔" جیک نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اسے بھائی کی موت سے زیادہ اپنے ہنی مون پر نہ جانے کا افسوس تھا۔

☆☆☆

تین دن میں ایما نے جتنا کام کیا تھا شاید پچھلے تین سال میں نہ کیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایما کو اچانک وہ پُراسرار شبیہ یاد آ گئی جو اس نے گزشتہ دن دیکھی تھی۔ اسی سوچ کے تحت اس نے کیمرے کا میموری کارڈ اپنے لیپ ٹاپ میں ڈالا اور تمام تصاویر دوبارہ چیک کرنے لگی۔ ایک تصویر دیکھ کر ایما اچھل پڑی۔

"اوہ میرے، یہ کون ہے؟ کون ہے جو ہمارا پیچھا کر رہا ہے؟"

ایما نے اس تصویر کو زوم اِن کیا تو وہی پُراسرار شبیہ نظر آئی۔ چہرے پر سیاہ رنگ کا ماسک چڑھائے اور ہاتھوں میں ایک دوربین یا کیمرا پکڑے کھڑا تھا۔ ایما کے خیال کے مطابق یہ کوئی بھوت تھا۔ آج چرچ کے باہر مارتھا اور ربتا نے

پھر یہی پیش گوئی کی تھی کہ تینوں اموات کے پیچھے ارواح کا ہاتھ ہے۔ ربتا نے تو جیک، ڈونا اور ایما تینوں کو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

"تم لوگ ہی تھے جنہوں نے میرے بیٹے گیری کو آخری بار دیکھا تھا۔ تمہیں سب پتا ہے۔ آخر مجھے بتا کیوں نہیں دیتے میرے بیٹے کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا؟" جیکلین بار بار ان سے پوچھتی تھی۔

جیک نے ربتا اور مارتھا کو کہا۔ "خاموشی سے چلی جاؤ تم دونوں، ہماری شادی کو مزید خراب مت کرو ورنہ میں نیل کو کہہ کر تم دونوں کو گرفتار کروا دوں گا۔"

اسی وقت سب انسپکٹر نیل بھی وہاں آ گیا تو بات آئی گئی ہو گئی اور دونوں خواتین بھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

ایما نے اس تصویر کو پرنٹ کیا اور اپنے پرس میں رکھ لیا، پھر تیار ہو کر تفتیش کے لیے جانے لگی۔ جس وقت ایما ہال میں داخل ہوئی آرکسٹرا پر دھیمی رومانوی دھن بج رہی تھی۔ پارٹی میں آئے ہوئے جوڑے آہستہ آہستہ اسٹیج پر ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔ جیک ہاتھ میں ووڈکا کا گلاس تھامے کچھ بجھے بجھے سے لگ رہا تھا۔ ایما سیدھا اس کی جانب بڑھی اور رازداری سے بولی۔ "مجھے لگتا ہے کوئی بھوت ہمارے پیچھے پڑ چکا ہے۔ دن کے وقت مارتھا اور ربتا نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔"

جیک نے برا سا منہ بنا لیا پھر کہنے لگا۔ "ایما فضول میں اپنا دماغ مت خراب کرو۔ کوئی بھوت پریت نہیں ہے۔ مارک کی اپنی عادات ایسی تھیں۔ اس کی موت ایسے ہی ہونی تھی۔"

ایما نے پرس میں سے وہ تصویر نکال لی جو جیک کو دکھانا تھی۔ "چلو مجھ پر یقین مت کرو لیکن یہ تصویر تو جھوٹ نہیں بول رہی نا؟"

جیک نے تصویر دیکھی تو پریشان ہو گیا لیکن اچانک نیل کو سامنے آتا دیکھ کر سنبھل گیا۔ ایما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آؤ نیل، کیا میرے ساتھ ڈانس کرو گے؟"

نیل شاید ذہنی طور پر تیار نہ تھا اس لیے تھوڑا جزبز نظر آنے لگا پھر ایما اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسٹیج پر لے گئی۔ دونوں ڈانس کرنے لگے۔

ڈونا نے ایما اور جیک کو راز و نیاز کرتے دیکھ لیا تھا، وہ بھی جیک کی جانب بڑھی اور اسے اپنے ساتھ اسٹیج پر لے کر چلی گئی۔ آرکسٹرا اب بلند آواز سے بجنے لگا اور تمام جوڑے اسٹیج پر تیزی سے تھرکنے لگے۔

"تم دھوکے باز ہو۔ تم مارک سے یوں ڈکٹیٹ کر رہی تھی۔"

اچانک جیک ڈونا پر غصے سے چلانا شروع ہو گیا۔

"ہاں میں اس سے ملی تھی، پتا نہیں اس نے تمہیں کیا پٹی پڑھائی ہے۔ اسے میں چھوڑوں گی نہیں۔" ڈونا نے چیختے ہوئے کہا اور پھر ایما کے پاس آ کر چیخنے لگی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ جیک کو مجھ سے بدظن کر رہی ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے، سخت نفرت ہے۔"

جیک جھلائے ہوئے انداز میں ہال سے باہر چلا گیا۔ ڈونا بھی پاؤں پٹختے ہوئے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئی۔ اس کا شادی کا لمبا سا گاؤن زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

پارٹی میں موجود تمام لوگ حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ چند منٹ بعد اچانک ہال کا دروازہ کھلا، یہ کوئی مہمان تھا جو باہر سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"خون ہو گیا، خون ہو گیا۔ کسی نے ڈونا کو مار دیا ہے۔ جلدی سے پولیس اور ایمبولینس کو بلائیں پلیز۔"

نووارد ہیجانی انداز میں چیخ رہا تھا۔

☆☆☆

ایک دن پہلے رات پب سے کچھ ہی فاصلے پر وہ سایہ چھپ چھپ کر مارک ایڈم کے دوست احباب کو دیکھتا رہا۔ اس کے پاس بہت سارے ناموں کی ایک فہرست تھی جس میں سب سے اوپر مارک ایڈم کا نام لکھا ہوا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا کوٹ اوڑھے وہ اندھیرے کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ اگر اسے کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ تمام لوگ جب پب کے اندر چلے گئے تو تھوڑی دیر بعد مارک ایڈم جھومتا ہوا باغیچے میں آ نکلا۔ تھوڑی دیر بعد دلہن کے لباس میں ڈونا بھی وہاں آ نکلی۔ مارک اور ڈونا کسی بات پر آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔ ڈونا نے اچانک اسے پیٹ میں زوردار لات ماری اور وہاں سے بھاگ گئی۔ مارک نشے میں دھت تھا، وہ ڈونا کو مغلظات بکتا رہا لیکن دوڑنے کی ہمت اس کے اندر نہیں تھی۔ ڈونا کے جانے کے بعد مارک لہراتا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پاؤں کہیں اور رکھتا تھا لیکن پڑتا کہیں اور تھا۔

"مارک! ادھر آؤ، دیکھو میں کون ہوں؟" سائے کی آواز کچھ عجیب سی تھی۔

مارک نے چونک کر دیکھا تو سایہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔

"تم تم...." مارک نے خوفزدہ انداز میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر کچھ بولنا چاہا لیکن دوسرے لمحے سایہ اس پر جھپٹ پڑا۔ زوردار ٹکر لگنے سے مارک ایک درخت سے جا ٹکرایا اور پھر تکلیف کی شدت سے بلبلاتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ وہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں ایسے مار رہا تھا جیسے پانی میں ڈوب رہا ہو۔ سایہ ایک بار پھر اس کے قریب آیا اور زور لگا کر اسے کھڑا کردیا۔ مارک نشے اور تکلیف کی شدت سے ابھی بھی جھوم رہا تھا۔ اچانک سائے نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بڑا سا چھرا نکالا اور پھر پوری قوت سے اس کے عین دل کے مقام پر گھونپ دیا۔ مارک کا بے جان جسم زمین پر گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ سائے نے اسے بازوؤں سے پکڑا، گھسیٹتے ہوئے اسے گاڑی تک لایا اور پوری طاقت صرف کرکے اسے سیٹ پر بٹھادیا۔ کار کے اوپر سرخ رنگ پھیلا ہوا تھا جبکہ زمین پر بھی پینٹ اور خون کے نشانات آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے اور اس پر سائے کے بوٹوں کے نشانات ثبت ہوچکے تھے۔

اور آج پھر وہی سایہ فہرست ہاتھوں میں تھامے اسی جگہ چھپ کر کھڑا تھا۔ مارک کے نام کے اوپر کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔ دوسرے نمبر پر ڈونا کا نام تھا۔ وہ بے چینی سے رائن بڈ پب کی جانب تک رہا تھا۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ انتظار کرتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دلہن کے گاؤن میں ملبوس ڈونا باغیچے کے پاس بھاگتی ہوئی پہنچی۔ اس کی ہنسی چھوٹ رہی تھی۔ اس نے سگریٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ کے کش لگانے لگی۔

"ڈونا، پیاری ڈونا! ادھر آؤ۔" سایہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔

عجیب سے حلیے والا انسان دیکھ کر ڈونا کا سانس رک گیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ پیچھے کی جانب کھسکتے ہوئے اس کا گاؤن کے اوپر پاؤں پڑا تو وہ زمین پر گرگئی۔ سائے نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لیا۔ ایک گھٹنا اس کے پیٹ پر رکھا اور پھر اس کے جسم کے نازک اعضا کو سگریٹ سے داغنے لگا۔ پب کے اندر شور شرابے کی وجہ سے ڈونا کی چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سائے نے کوٹ کی جیب سے چھرا نکالا اور پھر ڈونا کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

☆☆☆

انسپکٹر جون الجھ گیا تھا۔ اس کی تفتیش جہاں سے شروع ہوئی تھی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ایبٹ، للی اور مارک کی اموات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مارتھا اور ریٹا کے پُراسرار بیانات اور پھر کسی بھوت پریت کی افواہ بھی اس کے شکوک کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ تفتیش کی گتھی الجھ رہی تھی۔ جون کو قاتل بھی گرفتار کرنا تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ گیری کی گمشدگی کا معما بھی حل کرنا چاہتا تھا۔ انتہائی جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بھی سی سی ٹی وی کیمرے کسی بھی مشکوک سرگرمی کی نشاندہی نہ کرسکے تھے اور نہ ہی ڈورچ گاؤں میں کسی مشکوک آدمی کو دیکھا گیا تھا۔ انسپکٹر جون کا زیادہ شک چارلی، ریٹا، جیک اور ایما پر تھا لیکن اس کے پاس ثبوت نہیں تھا کہ انہیں گرفتار کرسکے۔ پیش رفت کے بارے میں سینئر افسران اس سے جلد ہی بازپرس کرنے والے تھے اور وہ ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

کسی خیال کے تحت اس نے ایبٹ کے گھر کی چابیاں اٹھالیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ اس بوسیدہ مکان کے سامنے تھا۔ گھر کے اردگرد پولیس کی نیلے رنگ کی ٹیپ تنی ہوئی تھی جس کا مطلب تھا پولیس ابھی تک تفتیش میں مصروف ہے اس لیے عام لوگوں کا اس گھر کے اندر قدم رکھنا منع تھا۔ سب انسپکٹر نیل جیک اور ڈونا کا گواہ بنے ان کی پارٹی میں شرکت کرنے چلا گیا تھا اس لیے جون اس وقت اکیلا ہی آگیا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ سے اپنی ٹارچ نکالی اور پھر چابی سے دروازہ کھول کر وہ ایبٹ کے گھر میں داخل ہوا۔ احتیاط سے قدم اٹھاتا وہ کچن میں داخل ہوا۔ میز پر چائے کا کپ اور پلیٹ میں بریڈ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ دو دن پہلے جب اس نے کچن دیکھا تھا تو ایسی کوئی چیز میز پر نہیں تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا اس گھر میں کوئی اور ذی روح بھی موجود ہے۔ کون ہوسکتا تھا جو اس بند گھر میں چائے پینے آگیا ہو؟ جون پریشان ہوگیا تھا۔ کچن کے ساتھ ہی مرکزی سیڑھیاں تھیں جو اوپر کے کمروں تک جانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ گاؤں کے پرانے گھروں کی طرح اس گھر کے پچھلے حصے میں بھی بڑا سا باغیچہ تھا۔ باغیچے کی جانب جانے کے لیے بھی ایک چھوٹی سیڑھی موجود تھی۔ سیڑھی نیچے جاکر ایک دروازے پر ختم ہوتی تھی۔ جون یہی دیکھنے آیا تھا لیکن اس اندھیرے میں وہ اکیلے کچھ نہ کرسکتا تھا اس لیے اگلی صبح واپس آنے کا ارادہ کرکے وہ اوپر کمروں پر ایک نظر مارنے چل پڑا۔ احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا وہ تمام کمرے دیکھنے لگا۔ ایک چھوٹا سا کمرا شاید

اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ گتے کے ایک ڈبے پر مائیکل لکھا ہوا نظر آیا تو جون نے ویسے ہی اسے کھول کر دیکھنا شروع کردیا۔ اس ڈبے میں اسکول کی کتابیں اور کاپیاں رکھی تھیں۔ کچھ پینٹنگز تھیں جیسے کسی بچے نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوں۔ ایک بچے کی تصاویر بھی تھیں جن کی پشت پر مائیکل کا نام لکھا تھا۔ صرف ایک ہی چیز کام کی نکلی وہ تھا ایک اخباری تراشہ جس میں ایک بچے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کے ساتھ گمشدگی کی خبر تھی۔ جون نے وہ تصاویر اور تراشہ اٹھالیا لیکن اسی وقت گھر کے اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا تو کچن میں مارتھا اور چارلی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی دو ٹارچ پکڑی ہوئی تھیں۔

"مس مارتھا! تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو؟ تمہیں پتا بھی ہے کہ ابھی تک پولیس تفتیش کررہی ہے۔" جون نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آئی ایم سوری مسٹر جون! میں اپنی پٹیشن ڈھونڈنے آئی تھی۔ اس پر بائی پاس رکوانے کے لیے لوگوں کے نام، پتے اور دستخط تھے۔ مجھ سے وہ لفافہ کہیں گر گیا تھا تو وہی ڈھونڈنے آئی تھی۔" مارتھا نے معذرت خواہانہ انداز سے جواب دیا۔

"آپ دونوں کو اس غیر قانونی حرکت کی وجہ سے گرفتار بھی کرسکتا ہوں۔" جون نے اس بار سختی سے کہا تھا۔

☆☆☆

ہوپ وڈ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں جون اور نیل ڈونا کے بیڈ کے آس پاس کھڑے تھے۔ اس کا پورا جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی سانسوں کی آمد و رفت اس وقت آکسیجن ماسک کے مرہون منت تھی۔ اس کے ماتھے، چہرے اور بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے گول دائرہ نما زخم تھے جن پر مرہم لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ڈونا کے بچنے کے چانس بہت کم تھے اس لیے پولیس کو بلایا گیا تھا تاکہ زخمی کا بیان لیا جاسکے۔ کمرے کے باہر جیک اور ایما بھی کچھ دوستوں کے ساتھ فکرمندی سے اندر کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈونا بار بار کومہ میں جارہی تھی اچانک اس کی ہلکی سی کراہ سنائی دی تو جون اور نیل اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ ڈیوٹی پر موجود نرس بھی ڈونا کے قریب آگئی۔

"وہ...... وہ واپس آگیا ہے۔" ڈونا نے ماسک ایک طرف سرکایا اور اس کی سرگوشی نما آواز برآمد ہوئی۔

"وہ زندہ ہے۔" ڈونا پھر بولی۔ اس کا دایاں ہاتھ ہوا میں اٹھا ہوا تھا اور اس کی انگلیاں کسی جانب اشارہ کررہی تھیں پھر اس کا ہاتھ بیڈ کی ایک جانب پہلو میں گر گیا اور منہ ویسے ہی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نرس نے جلدی سے ایمرجنسی بٹن دبادیا تھا۔ سرجن اور ڈاکٹر چند ہی لمحوں میں وہاں پہنچ گئے لیکن بے سود۔ ڈونا کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔

☆☆☆

"میں نے اپنے پاسپورٹ اور ٹکٹس نیل کو دے دیے تھے۔ ہم نے پارٹی میں ڈراما صرف اس لیے کیا تھا تاکہ لوگ سمجھیں ہم ناراض ہوگئے ہیں۔" جیک اس وقت جون کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا جسے نیل گزشتہ رات کے تمام واقعات بتا چکا تھا۔

"ڈونا سے پہلے تم ہال سے نکل چکے تھے، ڈونا کو مارک کے ساتھ بوس و کنار کرتے ہوئے ایک چشم دید گواہ نے دیکھا تھا۔ جب تمہیں یہ بات ایما نے بتائی تو تم نے اس سے جان چھڑانے کا سوچا۔" جون نے اس بار انتہائی سرد لہجے میں بات کی تھی۔

"ایما نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو اس لیے باہر نکلا تھا کہ گاڑی میں ضروری سامان رکھ لوں اور پھر ڈونا کو لے کر شہر سے باہر بھاگ جاؤں۔ ڈونا نے مجھے مارک کا بتادیا تھا اور ویسے بھی اب ان باتوں کا کیا فائدہ، دونوں ہی مارے جاچکے ہیں۔" جیک افسردگی سے بولا تھا۔

"یہ ساری اموات گیری کی گمشدگی سے جڑی ہوئی لگتی ہیں جیک! ڈونا کا نزعی بیان اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ پولیس سے چھپا رہے ہو۔ اس دن گیری کے ساتھ کیا ہوا تھا یہ تم، مارک، ڈونا اور ایما جانتے ہو۔" جون نے اسے کریدتے ہوئے بات مکمل کی۔

"یہ سراسر الزام ہے۔ ہم نے گیری کو دیکھا ضرور تھا لیکن پھر وہ سائیکل لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ ملا۔ اس کی ماں بھی پچھلے انیس سال سے گیری کی گمشدگی کا ذمہ دار ہمیں ہی سمجھتی ہے۔"

"مارک اور ڈونا کے بعد کس کی باری ہے یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن تم لوگ جھوٹ بول کر اپنا نقصان کررہے ہو۔" جون نے مایوسی سے اس کی جانب دیکھا اور جانے کی اجازت دے دی۔

ڈورس لیسنگ

ڈورس لیسنگ برطانوی ناول نگار، شاعرہ، ڈراما نگار، منظوم ڈراما نگار، سوانح نگار اور افسانہ نگار تھیں۔ وہ لندن میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کے اہم ترین ناولوں میں The Grass in singing (1950) پانچ ناولوں کا سلسلہ جس کے مجموعے کا نام Children of Violence (1952-69) The Golden Notebook (1962) اور پانچ ناولوں کا ایک اور مجموعہ Canopus in Argos Archives (1979-83) شامل ہیں۔ لیسنگ برطانوی انگریز جوڑے کپتان الفریڈ ٹیلر اور ایملی موڈ ٹیلر کے ہاں 22 اکتوبر 1919ء کو فارس (اب ایران) کے شہر کرمان شاہ میں پیدا ہوئیں جہاں ان کے والد امپیریل بینک آف فارس میں کلرک کی ملازمت کرتے تھے۔ لیسنگ نے پہلے کونوینٹ بورڈنگ اسکول اور پھر سالسبری (اب ہرارے) کے لڑکیوں کے ایک اسکول ڈومنیکن کونوینٹ ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کی جو ایک رومن کیتھولک کونوینٹ تھا۔ چودہ برس کی عمر میں انہوں نے اسکول چھوڑ کر اپنے طور پر تعلیم جاری رکھی۔ پندرہ برس کی عمر میں گھر چھوڑا اور دائی، ٹیلی فون آپریٹر، آفس ورکر، اسٹینوگرافر اور صحافی کے طور پر کام کیا۔ سیاسیات اور سماجیات کا مطالعہ کیا اور اسی دوران خود بھی لکھنے کا آغاز کر دیا۔ اس زمانے میں ان کے متعدد مختصر افسانے شائع ہوئے۔ 1937ء میں لیسنگ سالسبری چلی گئیں اور ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کرنے لگیں۔ ان کی پہلی شادی فرانک وزڈم سے ہوئی۔ ان کے ہاں دو بچے ہوئے جان بیٹا اور جین بیٹی۔ یہ شادی 1943ء کو اپنے انجام پر پہنچ کر طلاق پر منتج ہوئی۔ طلاق کے بعد لیسنگ کی دلچسپی لیفٹ بک کلب کے معروف لوگوں میں بڑھ گئی جس میں انہوں نے ایک سال قبل ہی شمولیت اختیار کی تھی۔ یہ گروپ نسلی معاملات سے متعلق تھا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک جرمن یہودی تارک وطن گوٹ فرائڈ لیسنگ سے ہوئی۔ انہوں نے 1945ء میں شادی کر لی اور ان کی ازدواجی زندگی کے ناتے اور طلاق سے قبل ان کے ہاں ایک بیٹا پیٹر پیدا ہوا۔ ان دو ناکام شادیوں کے بعد لیسنگ نے تیسرا بیاہ نہیں رچایا۔ ازاں بعد گوٹ فرائڈ لیسنگ یوگنڈا میں مشرقی جرمنی کا سفیر مقرر ہوا اور ادی امین دادا کے خلاف بغاوت کے دوران 1979ء میں قتل ہو گیا۔ جب لیسنگ نے بطور لکھاری اپنے کیریئر اور اشتراکی عقائد کے تعاقب میں لندن کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے دونوں بڑے بچے ان کے باپ کے پاس جنوبی افریقا میں چھوڑے۔ تاہم دوسرے خاوند سے ہونے والا بیٹا ان کے ہمراہ رہا۔ نیوکلیائی اسلحے اور جنوبی افریقا کی نسلی تقسیم کے خلاف تحریک کے سبب ڈورس لیسنگ پر جنوبی افریقا اور رہوڈیشیا کے دروازے کئی برسوں (1956 تا 1995) کے لیے بند کر دیے گئے۔ 1949ء میں وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لندن چلی گئیں۔ ان کا پہلا ناول The Grass is Singing 1950ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ ان کا اہم ترین کام The Golden Notebook 1962ء میں لکھا گیا۔ 1984ء میں لیسنگ نے جین سومرس کے فرضی نام سے دو ناول یہ دکھانے کے لیے لکھے کہ نئے لکھاریوں کو اپنی تصنیفات چھپوانے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیسنگ کے اپنے برطانوی ناشر نے ان ناولوں کو مسترد کر دیا۔ تاہم بعد میں ایک اور انگریز اور ایک امریکی ناشر انہیں شائع کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس طرح The Diary of a Good Neighbour 1983، میں اور اگر بوڑھا کر سکتا 1984ء میں بہ یک وقت انگلستان اور امریکا سے اشاعت پذیر ہوئے۔ 1984ء ہی میں دونوں ناول "ایک اچھے پڑوسی کا روزنامچہ" اور "اگر بوڑھا کر سکتا" دونوں ہی ممالک سے مکرر ایک جلد میں ایک ہی عنوان "جین سومرس کے روزنامچے" شائع ہوئے لیکن اس بار مصنف کے نام کی جگہ جین سومرس کی بجائے ڈورس لیسنگ درج تھا۔ 1999ء کے آخر میں انہیں "نمایاں قومی خدمات" سرانجام دینے پر چیمپئن آف آنر قرار دیا گیا۔ رائل سوسائٹی فار لٹریچر نے بھی انہیں ادب کی چیمپئن قرار دیا۔ 2001ء میں لیسنگ کو برطانوی ادب کا ڈیوڈ کوہن پرائز فار لائف ٹائم اچیومنٹ دیا گیا۔ جب کہ 2008ء میں انہیں 1945ء تا حال کے عظیم لکھاری کی فہرست میں پانچویں نمبر پر رکھا گیا۔ 2007ء میں جب انہیں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا تو ان کی عمر 87 برس تھی۔

جیک کے جانے کے بعد نیل نے کہا۔ "ہاں! میرا خیال ہے ریتا ہی بھیس بدل بدل کر اپنے بیٹے کی گمشدگی کا انتقام لے رہی ہے۔"

جون چونک کر نیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"میں ویسے بھی ریتا کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے کرو تم بھی ساتھ آ جاؤ۔ اس ایما سے پوچھو کہ گیری کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

جون نے کچھ سوچتے ہوئے نیل کو بھی ساتھ ہی لے جانا بہتر سمجھا تھا پھر وہ نیل کو ایما کے اسٹوڈیو کے پاس اتار کر سامنے کی جانب گاڑی موڑ چکا تھا۔

بھاری مشینری سے تمام گرائے گئے گھروں کا ملبا اٹھایا جا چکا تھا۔ جس جگہ گھنا جنگل ہوتا تھا اب وسیع اور چٹیل میدان تھا۔ اس میدان میں اب صرف ریتا کا گھر ہی بچا تھا۔ اس گھر کے چاروں اطراف اسٹیل کے بیریئر رکھے ہوئے تھے جہاں سے انسان تو کیا جانور بھی اندر نہیں جا سکتے تھے۔ احتجاج کرنے والے لوگ اب بھی وہاں موجود تھے۔ ریتا نے پولیس کار دیکھی تو وہ بیریئر کھول کر باہر نکل آئی تھی۔

"ہیلو، کیا حال ہے؟ یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا آپ سے ملاقات کرتا جاؤں۔" جون خوشدلی سے بولا۔

"کیوں مذاق کرتے ہو ہمارے ساتھ، دیکھو تو سہی کتنے دن سے زمین پر سو رہے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے۔" ریتا نے شاکی لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری!" جون نے فوراً معذرت کی اور پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔

"آپ کے پاس گیری کے بچپن کی کوئی تصویر ہے تو دکھائیں۔"

"ضرور ہوں گی میرے پاس۔" وہ فوراً ہی گھر کے اندر چلی گئی اور پھر پانچ منٹ بعد ایک البم لے آئی۔

"یہ لیں، یہی میری کل متاع ہے۔ انیس سال سے اپنے لخت جگر کی یادیں سینے سے لگائے لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب جا رہی ہوں۔ پتا نہیں میرا چاند کہاں ہوگا؟" ریتا رقت آمیز لہجے میں اپنے دل کا حال بتاتی گئی۔

جون نے شکریہ ادا کر کے البم ہاتھ میں پکڑ لیا۔ چند تصاویر تھیں اور کچھ پینٹنگز...... جون اچانک چونک اٹھا۔

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ کل رات آپ کہاں تھیں۔" جون نے یکلخت سوال داغ دیا۔

"اوہ، آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟ اگر میں نے انہیں مارنا ہوتا تو کیا انیس سال انتظار کرتی؟ میں نے تو سب خدا پر چھوڑ دیا ہے، وہی میرا انصاف کرے گا۔" ریتا روتے ہوئے بیریئر پار کر کے اندر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ایما سوگواری اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھی تھی۔ پچھلے دن کے واقعات نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ جیک کی شادی کی تصاویر وہ پھر سے چیک کر رہی تھی اسی وقت نیل وہاں آ گیا۔ اسے دیکھ کر اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"کیا حال ہے ایما؟" نیل اس کے قریب ہی اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"تمہارے آنے سے قبل تو ٹھیک ہی تھی اب پھر سے کل رات والے واقعات یاد آنا شروع ہو گئے ہیں۔" ایما آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"فکر نہ کرو پولیس بہت جلد قاتل تک پہنچ جائے گی۔"

"کیسے فکر نہ کروں نیل؟ پولیس نے ابھی تک کوئی بھی حوصلہ افزا اطلاع نہیں دی۔" ایما نے شاکی لہجے میں کہا۔

"اوہ، یہ تمہاری کلائی کا کٹ کیسا ہے؟" نیل نے اس کی کلائی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تمہیں تو یاد ہوگا بچپن میں، میں نام بنانے

کی طرح رہا کرتی تھی۔ یہ چوٹ اُس سائیکل کی وجہ سے لگی تھی۔" ایما نے بناوٹی ہنسی کے دوران کہا جسے نیل نے بھی محسوس کرلیا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ ڈونا نے مرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ واپس آگیا ہے۔ وہ کس کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ کیا وہ گیری کا کہہ رہی تھی؟" نیل نے پولیس کے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"اوہ، تم بھی نا نیل، کن باتوں میں پڑ گئے۔ گیری ہمارے ساتھ کھیلا تھا، جس دن گم ہوا اس دن بھی ہمارے ساتھ کھیل کر واپس گھر چلا گیا تھا لیکن شام کے وقت پتا چلا کہ وہ تو گھر پہنچا ہی نہیں۔ خدا جانتا ہے وہ کہاں گیا۔ ہم نے تو اسے ڈھونڈنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی تھی۔" ایما بولی۔

"پچھلے دن کے واقعات کا تعلق ضرور گیری کی گمشدگی سے ہے۔ اب تم اور جیک ہی بچے ہو، ہمیں تم دونوں کی حفاظت کا کچھ کرنا ہوگا۔" نیل کے لہجے میں تحفظات تھے۔

"فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوگا۔ شکریہ کہ تمہیں میری سلامتی کی فکر ہے۔" ایما نے وارفتگی سے اپنا سر نیل کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔

نیل پھر ملنے کا کہہ کر چلا گیا تو ایما نے لیپ ٹاپ آن کرلیا۔ گزشتہ رات والی تصاویر میں جیک اور ڈونا ڈانس کرتے نظر آرہے ہیں پھر چند تصاویر میں اُسے کھڑکی کے ساتھ ماسک پہنے کسی کی شبیہ نظر آئی۔ اس نے جلدی سے اسے زوم کرکے دیکھنا شروع کیا۔ ایک تصویر میں ماسک تھوڑا سا اٹھا ہوا دیکھا تو وہ اچھل پڑی۔

"یہ..... یہ تو وہی ہے۔" اس نے جیسے خودکلامی کی ہو۔

اسی وقت دروازے کی جانب ایک کھٹکا ہوا۔

"نیل؟" ایما نے اونچی آواز سے پوچھا۔ لیپ ٹاپ سے اس نے میموری کارڈ نکالا اور دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی وقت باہر سے کوئی چیز پھینکی گئی جو کھڑکی سے ٹکرایا اور شیشہ کرچیوں میں بٹ گیا۔ یہ شاید پیٹرول بم تھا، پورے اسٹوڈیو میں آناً فاناً آگ بھڑک اٹھی۔

ایما ایک کونے میں دبک گئی۔ جنز کی جیب سے موبائل فون نکال کر پولیس کا نمبر ملایا اور مدد کے لیے چلانے لگی۔

اس نے موبائل اور میموری کارڈ جیب میں رکھا اور ایمرجنسی فائر ایگزٹ اور کو زبردستی کھولنے لگی۔ آگ اور دھواں اسے نڈھال کیے دے رہے تھے۔ کھانس کھانس کر برا حال تھا۔ گرمی کی حدت اور دھواں پھیلتا ہی جارہا تھا۔ اس نے اپنے سارے حواس مجتمع کیے اور پھر پوری قوت صرف کرکے دروازہ کھول دیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لہرائی اور پھر پیچھے کر اندھی کھائی میں گرتی چلی گئی تھی۔ اس کا آخری احساس یہ تھا کہ اس کی جان نکل رہی ہے۔

☆☆☆

"اگر چارلی ہی گیری ہے تو اس کا مطلب ہوا جب اسے اپنے گھر کے گرائے جانے کا پتا چلا تو وہ اپنی ماں سے ملنے آیا۔ دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ مارک، جیک، ڈونا اور ایما کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔" جون اور نیل انہی نکات پر بات چیت کررہے تھے۔ سامنے بڑے سے بورڈ پر تمام شواہد کی تصاویر چسپاں کی گئی تھیں۔

"باس آپ کی بات میں وزن ہے لیکن گیری اگر چارلی ہے تو اس کی ایڈم جیکی اور اس کے دوستوں سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟" نیل اس تھیوری سے متفق نہیں تھا۔

جون جو تصاویر ریتا سے لے کر آیا تھا۔ انہیں اسکین کرکے کمپیوٹر میں محفوظ کرلیا گیا تھا پھر ایک خاص سافٹ ویئر کے ذریعے گیری کا چہرہ انیس سال بعد کیسا ہوگا اس کی شبیہ بنائی گئی تھی۔ اس شبیہ سے گیری اور چارلی میں کافی حد تک مماثلت پائی گئی تھی۔

اسی وقت اسپتال سے ایک پولیس کانسٹیبل آگئی۔ "ایما کی جان خطرے سے باہر ہے، ہوش آگیا ہے۔ اس نے یہ میموری کارڈ آپ لوگوں کے لیے بھیجا ہے۔"

میموری کارڈ لے کر جون نے اس کانسٹیبل کا شکریہ ادا کیا اور پھر میموری کارڈ کمپیوٹر میں ڈال کر چیک کرنے لگے۔ جیک کی شادی کی تصاویر دیکھ کر جون کا منہ بن گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کوئی خاص بات ہوگی۔

"باس آپ کیسی تصاویر کی توقع لگائے بیٹھے ہیں؟" نیل نے کہا۔ جب سے تفتیش کا رخ کسی اور جانب مڑا تھا نیل کی بزلہ سنجی بھی عود آئی تھی۔

جون بس مسکرا کر رہ گیا لیکن نظریں اب بھی کمپیوٹر اسکرین پر گڑی ہوئی تھیں۔

"اوہ ایک سیکنڈ! یہ دیکھو۔" ایک تصویر میں کھڑکی کے قریب ایک ماسک میں ملبوس سایہ نظر آرہا تھا۔ دوسری تصویر میں اسی سائے کو زوم کیا گیا تھا۔

"ہم، تصاویر سے تو یہ بھی چارلی لگ رہا ہے۔ آؤ پہلے

جیک سے کچھ معلومات لے لیں۔ اسے بھی کافی دیر سے بٹھایا ہوا ہے۔" اس نے دونوں تصاویر کے پرنٹ نکال لیے تھے۔ "آؤ چلیں۔" جون نے ہنکارا بھرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایما کے گھر آتش زنی کے بعد انہوں نے جیک کو تھانے میں بلایا تھا۔

"جیک میں نے کہا تھا کہ پولیس سے کچھ نہ چھپاؤ۔ دیکھو ایما پر بھی حملہ ہوگیا اب صرف تم ہی بچے ہو۔ اگر تم پولیس کی مدد کرتے تو مارک اور ڈونا کی زندگی بھی بچ سکتی تھی۔" جون نے اندر جاتے ہی جیک سے کہا۔

جیک نے مددطلب نظروں سے نیل کی جانب دیکھا لیکن اس کے چہرے پر بھی چڑچڑا پن نمایاں تھا۔

"میں نے کچھ نہیں چھپایا۔" جیک نے آہستہ سے کہا۔

"کیا یہ تصویر گیری کی ہوسکتی ہے؟" اس نے کمپیوٹر کے ذریعے بنائی گئی تصویر جیک کو دکھائی۔

"نہیں، ہرگز نہیں گیری کی شکل ایسی نہیں ہوسکتی۔" جیک نے غور سے تصویر دیکھ کر کہا۔

اب جون نے اسے زوم شدہ تصویر دکھائی۔

"او مائی گاڈ! یہ تو وہی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے وہ تو مرگیا تھا۔" تصویر دیکھ کر جیک وحشت زدہ ہوگیا اور ہذیانی انداز میں بولا۔

جون نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اسے پانی پلایا تاکہ تازہ دم ہوکر بیان دے سکے۔

☆☆☆

"میں، مارک، مائیکل، ڈونا اور ایما گہرے دوست تھے۔ مائیکل کا حادثے میں انتقال ہوگیا جو بدقسمتی سے ہمارے ہی والد کی گاڑی سے ہوا تھا۔ گیری کی عمر ہم سے کم تھی لیکن وہ ہمارے چھوٹے سے گروہ میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ ہم نے اس سے بہت پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہ ہمارے پیچھے ہی پڑا رہتا۔ مارک نے اسے کہا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ہمارے جیسا بننا ہوگا۔"

جیک نے بولنا شروع کیا تو پھر بولتا ہی چلا گیا۔ جون یا نیل نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

"جس دن گیری لاپتا ہوا اس دن بھی ہمیں تنگ کررہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ شامل کرو۔ مارک نے کہا اگر تم پانی میں چھلانگ لگا کر اپنی وفاداری کا ثبوت دو تو اپنے گروہ میں شامل کرلیں گے۔"

> دہلی کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ہمارے کچھ بدبخت اور کوتاہ اندیش لوگوں کی طرح اپنی کمزوریوں اور غلط کاریوں کو چھپانے کے لیے اپنے ملک کو برا بھلا نہیں کہتے۔ وہ اپنی تالیف کے لیے اپنے ملک کو ذمے دار نہیں ٹھہراتے۔ وہ اپنے ملک کی سلامتی اور یک جہتی کے خلاف کوئی بات مفروضہ کے طور پر کرنے کو بھی تیار نہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں وہ لوگ جنہیں پاکستان کی بدولت سب کچھ ملا ہے' جنہیں پاکستان نے زمین سے آسمان تک پہنچایا ہے' جنہیں پاکستان نے منصب' دولت اور عزت سے نوازا ہے' وہ بدبخت بھی تھوڑی تھوڑی سی بات پر اپنے مادر وطن کو کوسنے سے باز نہیں رہتے۔ دہلی کے لوگوں کا جن میں غریب' امیر سبھی شامل ہیں' جذبۂ حب الوطنی دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے کچھ لوگ کتنے ناشکرگزار ہیں اور کفران نعمت کا کتنا زیادہ ارتکاب کرتے ہیں۔
>
> اقتباس: بھارت یاترا از ایم بی بستی

"لیکن مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔" گیری نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر یہاں سے دفع ہوجاؤ! میں نے اسے کہا اور پھر ہم چاروں اپنی اپنی سائیکلوں پر نہر کی جانب چلے گئے۔ گیری بھی ہمارے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ اس بار ڈونا نے اسے کہا کہ اب بھی موقع ہے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کا۔ نہر میں چھلانگ لگا دو۔ گیری نے اس بار ذرا بھی تامل نہ کیا اور پانی میں کود گیا۔ پانی صرف ہماری کمر تک آتا تھا۔ مارک نے بھی اس کے پیچھے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ گیری پانی میں ڈر رہا تھا تو مارک اسے زبردستی پانی میں لیٹنے پر مجبور کرنے لگا اور پھر....."

اچانک جیک خاموش ہوگیا تو نیل نے اسے ٹوکا کہ پھر کیا ہوا۔

"اچانک گیری پانی میں ڈوب گیا۔ ہم نے پانی میں ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن نہ ملا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایما نے اسے تلاش کرلیا لیکن نہر کا پانی پینے کی وجہ سے وہ بے ہوش تھا۔ ایما اس کو الٹا لٹا کر اس کے منہ سے پانی نکالنا چاہ رہی تھی۔ ہم خود بچے تھے ہمیں اسے ہوش میں لانے کا کوئی طریقہ بھی پتا نہیں تھا۔ ڈونا نے کہا یہ مرگیا ہے آؤ اسے کنویں میں پھینک

دیتے ہیں پھر میں، ڈونا اور مارک اسے جنگل میں موجود کنویں کے لے گئے۔ پہلے اس کی سائیکل نیچے پھینکی اور پھر اسے بھی کنویں میں پھینک دیا۔ گیری مر گیا تھا۔ یہ تصویر والا گیری نہیں ہو سکتا۔"

جیک بتا رہا تھا اور جون کے ساتھ نیل بھی سانس روکے تمام تفصیل سن رہا تھا۔ بچپنا کیسے کیسے خونخوار واقعات کو جنم دیتا ہے انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

"مارک نے اپنا چاقو نکالا اور پھر اپنے بازو پر کٹ لگا کر ہمیں اپنے اپنے بازو آگے کرنے کا کہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم نے حلف اٹھایا ہے، آج کے بعد یہ راز ہمارے ساتھ رہے گا اور مرتے دم تک کسی کو نہیں بتائیں گے۔ ہم تینوں نے بھی اپنے اپنے بازو آگے کر دیے اور پھر مارک نے ان پر کٹ لگا کر حلف دوہرایا۔" جیک نے مزید بتایا۔ "اب مارک اور ڈونا قتل ہو گئے ہیں، ایما اسپتال میں ہے۔ ہم نے اپنا حلف بھی نہیں توڑا لیکن پھر یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟" جیک کا انداز کافی الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"میں چارلی کا وارنٹ لے کر آیا ہوں۔ اسے آج ہر صورت میں گرفتاری دینا ہوگی۔"

جون اور نیل اپنی علیحدہ گاڑیوں میں ایک بار پھر سائیٹ پر پہنچ گئے تھے۔ ربتا انہیں بیریئر ہٹا کر آگے نہیں آنے دے رہی تھی جس پر جون نے اسے وارنٹ نکال کر دکھایا۔

چارلی وہاں نہیں تھا، شاید پولیس کو آتا دیکھ کر چھپ گیا تھا۔

کسی خیال کے تحت جون نے سائیٹ پر کام کرنے والوں کے منیجر کو اپنے پاس بلایا اور جنگل میں واقع کنویں کا پوچھا۔ منیجر نے بتایا کنواں یہاں قریب ہی ہے۔ جون اسے ساتھ لے کر آگے گیا تو وہاں جنگل کا نام و نشان نہ تھا لیکن ایک اسٹیل کا بنا ہوا بڑا گول ڈھکن ایک جگہ زمین پر رکھا تھا۔ منیجر نے ڈھکن ہٹایا تو نیچے کنواں نظر آنے لگا۔

جون نے کنویں میں جھانکا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے والی ہو گئیں۔ کنویں کی تہ میں چارلی بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کنویں میں دیوار پر سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں لیکن موسم کے اثرات کی وجہ سے شاید زنگ آلودہ تھیں اس لیے چارلی کا اوپر نکلنا ناممکن تھا۔ اس نے نیچے سے بتا دیا تھا کہ پولیس سے چھپنے کے لیے وہ کنویں میں اترا تو سیڑھی کی ٹیک ٹوٹ گئی اور وہ پانی میں گر گیا تھا۔

اسے نکالنے کے لیے رسی منگوائی گئی اور پھر نیل رسی کے سہارے نیچے اترا اور چارلی کو حفاظت سے اوپر پہنچا دیا۔

"دیکھنا پھر اور بھی نیچے موجود ہے یا نہیں؟"

جون نے اوپر سے چلا کر پوچھا۔

"اور کچھ تو نہیں ہے بس یہ سائیکل ہے۔"

کنویں میں پانی شاید بہت کم تھا کیونکہ نیل سائیکل سمیت اوپر آیا تھا تو اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔

"نیل تم اسے تھانے لے جاؤ اور پھر ایما سے ملنے اسپتال چلے جانا۔ میں ایبٹ کے گھر جا رہا ہوں۔" جون نے حاکمانہ انداز میں نیل کو کہا تھا۔

☆☆☆

جون کو جو ہاتھوں سے بنائی ہوئی پینٹنگز ایبٹ کے گھر سے ملی تھیں ویسی ہی ملتی جلتی تصاویر ربتا کی دی گئی البم میں بھی شامل تھیں۔ یہی گورکھ دھندا سلجھانے جون اس وقت ایبٹ والے گھر چلا آیا تھا۔ احتیاطاً جون نے ٹارچ ہاتھ میں پکڑی تھی مبادا ضرورت پڑ جائے۔ پورے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر باغیچہ جانے والی سیڑھیوں کی جانب احتیاط سے قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اسے سیلن زدہ بو محسوس ہوئی جیسے پرانے گھروں میں عموماً ہوتی ہے۔ گھر کی کھڑکیاں دروازے اگر بند رکھے جائیں تو ایک ناقابل برداشت بو پیدا ہو ہی جاتی ہے جس کے بعد اندرونی دیواروں کا پلاستر کمزور ہو کر گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہ گھر انیس سال سے ہمیشہ اندھیرے میں ڈوبا ہی دیکھا گیا تھا تو جون کو اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ سیڑھیوں پر چڑھتے اور اترتے ہوئے اسے اپنے قدموں کی دھمک بدلتی محسوس ہوئی۔ ایسی آواز کا مطلب یہی تھا کہ گھر کے نیچے کوئی تہ خانہ موجود ہے لیکن اس کا دروازہ کہیں موجود نہیں تھا۔ جون نے ٹارچ جلا کر دیواروں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ تھپکانے سے اسے معلوم ہو گیا کہ دیوار کا کون سا حصہ اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور کون سا حصہ پلستر بورڈ سے۔ اس حصے کو اوپر نیچے ہلا کر دیکھا لیکن کچھ نہ ہوا۔ پھر سائیڈوں میں دباؤ ڈال کر ہلایا جلایا تو ایک مستطیل شکل کا ٹکڑا اچانک اپنی جگہ سے کھسکا اور دوسری جانب دیوار میں گھس گیا۔ نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ جون آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا لیکن جونہی اس کے پاؤں نیچے فرش پر پہنچے ایک سخت چیز اس کے سر کے پچھلے حصے پر پڑی اور وہ آہ کر کے فرش پر گر گیا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے

...تی تھی۔ حملہ آور ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ... ہوٹ کی تھی، اس کے ہاتھ میں بیس بال کا بیٹ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال نہیں تھے لیکن سر پر جگہ جگہ نشان تھے۔ لباس کے ... نظر آ رہے تھے۔ ... اور تیکھے نقوش والا چہرہ بھی زخموں سے سجا تھا۔ بیس بال بیٹ اٹھائے وہ اس آدمی ... کی جانب سفاکی سے دیکھ رہا تھا۔

"گیری، گیری میں جم ہوں۔" جون آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں گومڑا ابھر آیا تھا اور محسوس ہو رہا تھا شاید خون بھی رس رہا ہو۔

"کون گیری؟ میں مائیکل ہوں۔" حملہ آور کے منہ سے خرخراہٹ نما آواز بلند ہوئی۔

"تم گیری ہو، ربتا کے بیٹے... تمہیں ربتا یاد ہے؟" وہ اسے دوبارہ مارنے کے لیے آگے آ رہا تھا لیکن ربتا کا نام سن کر وہ رک گیا۔

جون کا تیر نشانے پر لگا تھا۔

"مجھے یہ نام یاد ہیں، لیکن مما اور پاپا مجھے کہتے تھے میں مائیکل ہوں، ان کا مائیکل! اس لیے میں مائیکل ہوں۔"

اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ جیسے کسی اور دنیا کا باسی تھا۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مائیکل ہے یا گیری۔

"تم مارک، جیک، ڈونا اور ایما کے ساتھ جنگل میں تھے، یاد کرو پھر وہاں کیا ہوا تھا؟"

وہ جو بھی تھا پریشان نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔

"ہاں جیک نے اس لڑکے کو پانی میں زبردستی ڈبو رکھا اور پھر...... وہ لڑکا مرنا شروع ہو گیا۔ نہیں نہیں وہ مرا نہیں۔ ایما اس کے جسم سے پانی نکال رہی تھی اور وہ پھر مرنے لگا...... اوہ نو! نہیں میں مرا نہیں تھا۔ ہاں انہوں نے پھر مجھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے سگریٹ جلایا اور مجھے داغتے رہے اور پھر مجھے مار کر پھینک دیا تھا۔"

گیری ایسے بات کر رہا تھا جیسے وہ پانی میں ہے اور کوئی اسے زبردستی پانی میں ڈوبنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں ربط بالکل بھی نہیں تھا۔

"کیا وہ مارک نہیں تھا جس نے تمہیں مارنے کی کوشش کی؟"

جون نے آرام سے پوچھا، وہ حرکت بھی نہیں کر رہا تھا کہ کہیں گیری اس پر پھر حملہ نہ کر دے۔

بمبئی کی ایک معروف ادب پرور اور بزرگ شخصیت کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی تھی جس میں جوش، جگر، حفیظ جالندھری، مجاز اور ساغر نظامی جیسے شعرا بھی شریک تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی جس کی ... جانے خود کی غزل کے نمناک شعروں کی طرح سہمی سہمی سی ایک ننھی سی آٹوگراف بک پر دستخط لے رہی تھی۔

آپ جہاں ایسی محفل کی موجودگی میں یہ نوعمر حسینہ لڑکی ... انداز میں پیش کر رہی تھی، چنانچہ اس تقاضے کے پیش نظر جگر مراد آبادی نے آٹوگراف بک میں لکھا ہے۔

ازل ہی سے چمن بند محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے
وہیں اک پھول مرجھا رہا ہے

اور جب حفیظ صاحب کی باری آئی تو انہوں نے معصوم لڑکی کے چہرے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولے میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں، کب کھلنا کب مرجھانا ہے

اس کے بعد آٹوگراف بک دوسرے شاعروں کے پاس سے ہوتی ہوئی جوش صاحب کے سامنے آئی تو انہوں نے لکھا۔

"آٹوگراف بک ایک ایسا اصطبل ہے، جس میں گدھے اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔"

دراصل جہاں جگر اور حفیظ کے برمحل شعروں نے ان کے حسن تخیل کو تازگی اور شگفتگی بخشی، وہاں دوسرے کئی شاعروں کے اوٹ پٹانگ شعر انہیں ناگوار گزر رہے تھے۔

☆☆☆

جوش صاحب کے والد نے ان کے ہاتھوں اپنے استاد حضرت جلال لکھنوی کے پاس گھی بھجوایا مگر انہوں نے واپس کر دیا، اس سے پہلے انہوں نے کوئی تحفہ یا سوغات واپس نہ کی تھی، چنانچہ وہ حضرت جلال کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ کیا خطا ہوئی جو آپ نے گھی واپس کر دیا۔ حضرت جلال نے برہمی کے ساتھ فرمایا۔

"واپس نہ کرتا تو کیا کرتا، تم نے ایسا بدتمیز ملازم بھیجا تھا جس نے میرے دروازے پر آ کر پکارا 'جلال بوت'۔"

"نہیں وہ جیک تھا۔ مارک گروہ کا باس تھا لیکن جیک اصل میں اس کو ہر غلط کام کے لیے آگے کر دیتا تھا۔ مجھے وہ کنویں میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے ہوش آیا تو میں بھی کنویں سے نکل آیا تھا اور پھر مجھے مما اور پاپا اپنے گھر لے آئے۔"

کیری کو شاید سب یاد تھا لیکن کر کر رہا تھا۔

"ایبٹ اور للی کے ساتھ کیا ہوا تھا کیری؟" جون نے پھر پانسہ پھینکا۔

"مما، للی مما کچن میں گر گئی تھی۔ میں نے پاپا کو کہا مما کو ٹھیک کر دے جیسے انہوں نے مجھے ٹھیک کیا جنگل سے لاکر۔ پاپا نے کہا وہ مر گئی ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں بھاگ کر اوپر چلا گیا۔ اوہ! یہ کھڑکیاں میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ پاپا کہتا تھا مائیکل تم اس تہ خانے میں رہا کرو۔ باہر کی دنیا بہت ظالم ہے وہ تمہیں مار ڈالے گی۔ میں کبھی اوپر نہیں گیا تھا۔ اوپر سب کچھ بہت اچھا تھا۔ میں ایک کمرے میں گیا وہاں میری بچپن کی تصویریں پڑی تھیں۔ پاپا مجھے کہنے لگا مائیکل آؤ نیچے چلیں...... وہ سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا مجھے مائیکل نہ کہو، تمہارا مائیکل تو مر گیا تھا۔ میں کیری ہوں، تم نے جھوٹ بولا تھا کہ میں مائیکل ہوں۔ وہ مجھے کھینچ کر نیچے لے کر جانا چاہتا تھا اور پھر میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ نیچے فرش پر گر گیا۔"

کیری باتوں اور توجہ کا ترسا ہوا لگتا تھا۔ جون کی ہمدردی دیکھ کر وہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ اس کا دماغ جیسے دس گیارہ سالہ بچے کا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات بالکل بچوں والی تھیں۔

"میں نے مارک کو بھی مار دیا تھا۔ میرے سامنے ایک آدمی اس کی کار پر پینٹ پھینک کر گیا جبکہ مارک اور ڈونا باغیچے میں کھڑے آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ڈونا چلی گئی تو میں نے مارک کو مار کر اس کی کار میں ڈال دیا۔ اگلی رات میں نے ڈونا کو مارنا تھا پھر وہ باغیچہ میں آکر سگریٹ پینے لگی تو میں نے اس کا سگریٹ چھینا اور اس کے جسم پر داغ لگاتا رہا اور آخر میں چھری مار کر ختم کر دیا......"

کیری ہر ایک بات بتا رہا تھا۔

"تم کیری سمن ہو مائیکل ولسن نہیں ہو۔ مائیکل ولسن تو ایلم کی گاڑی سے ٹکرا کر ہلاک ہو گیا تھا۔"

جون نے اسے پھر سے باور کرانا چاہا۔

"ہاں میں کیری سمن ہوں، ہاں میں کیری ہوں۔"

ایک بار پھر اس کے چہرے پر سفاکی نظر آنے لگی۔ اس نے بیٹ اٹھایا اور ایک بار پھر جون کو سر پر رسید کر دیا۔ جون نے بڑی کوشش کر کے ضرب اپنے کندھوں پر سہی لیکن کرنا بہتر سمجھا اور پھر جھوٹ موٹ کا بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

"آئی ایم سوری نیل! میں تم سے جھوٹ بولتی رہی۔ اُمید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔" ایما نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

نیل اس وقت ایما کے پاس اسپتال پہنچا تھا۔ کچھ دیر حال احوال پوچھنے پر گزر گئے تھے لیکن ایما بار بار معذرت کر رہی تھی۔

نیل کے پاس مائیکل اور کیری کے بچپن کی تصاویر تھیں۔ مائیکل کی تصویر دیکھ کر کہنے لگی۔

"یہ ان کے گھر میں موجود بہت بڑے تہ خانے کی تصویر ہے جو ایبٹ اور للی نے مائیکل کے لیے بنایا تھا۔ یہ تہ خانہ مائیکل کا بیڈ روم، اسٹڈی روم سب کچھ تھا۔ ہم گھنٹوں وہاں کھیلا کرتے تھے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ اس گھر میں تہ خانہ بھی ہے۔ مجھے ابھی وہاں جانا ہوگا کیونکہ جون کی جان کو خطرہ ہے۔" نیل نے پُرجوش لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اسپتال سے نکلا اور پھر تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ایبٹ کے گھر کے پاس پہنچ گیا۔ جون کی کار باہر ہی موجود تھی۔ تین چار گھنٹے سے جون کا اس کے ساتھ رابطہ نہیں تھا اس لیے جب تہ خانہ کے بارے میں پتا چلا تو اس کی چھٹی حس نے الارم بجا دیا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ایبٹ کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ سے وہ اپنا سروس پستول اٹھا لایا تھا۔ جون کا کہیں نام و نشان موجود نہیں تھا پھر وہ باغیچہ میں جانے والی سیڑھیوں کی جانب آیا تو وہاں اسے ایک دروازہ کھلا نظر آیا۔ قریب جانے پر اسے سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ وہ ابھی اپنا پاؤں اٹھا کر نیچے سیڑھی پر رکھنے ہی لگا تھا کہ اچانک اس پر افتاد آپڑی۔ ہوا میں اڑتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے کسی جنگلی بھینسے نے اسے ٹکر مار دی ہو۔ نیل کچن کے سامنے والے حصے میں زمین کی خاک چاٹ کرتا ہو گیا تھا۔ اس اچانک حملہ کی وجہ سے اس کا پستول بھی گر گیا تھا۔ حملہ آور اب دوبارہ اس پر جھپٹنے کو تیار تھا۔ نیل جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر حملہ آور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ یہ ایک

مضبوط جسم کا اور متناسب قد و قامت کا شخص تھا۔ اس بار پہل نیل نے کی اور اسے زور سے پیٹ میں لات رسید کر دی لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے تابڑ توڑ چار پانچ مکے اس کی چھاتی پر برسائے لیکن بے سود۔ اس بار حملہ آور کا داؤ چل گیا، اس نے اس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا زور سے دے مارا۔ نیل کا تکلیف کی شدت سے برا حال تھا۔ اس کے منہ سے کراہیں خارج ہونا شروع ہو گئیں۔ زمین پر گر کر اس بار اٹھنا ناممکن لگ رہا تھا۔ اس نے زمین پر پڑے پڑے اس کی پنڈلیوں پر زوردار ٹھوکر ماریں تو وہ بھی نیچے گر گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے لیکن مخالف زیادہ طاقتور تھا۔ اسے گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں پر لے گیا اور پھر تہ خانے والی سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیا۔ نیل کا جسم سن ہو چکا تھا اس لیے اسے تہ خانے کے فرش پر گر کر بھی کسی قسم کا احساس نہ ہوا۔ ہمت مجتمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا تو شکر ادا کیا کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ ایک کونے سے اوں اوں غوں کی آواز آئی تو نیل سمجھ گیا کہ باس کی خاطر مدارات...... ہو چکی ہے۔ جون کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔

"یہ کیری سمن تھا، جیک نے ہی اسے پانی میں ڈبویا تھا۔" جون نے ٹیپ ہٹتے ہی کہنا شروع کر دیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں باس؟ مارک نے نہیں بلکہ جیک نے اوہ... جیک نے کتنے جھوٹ بولے۔"

"ہاں جھوٹ تو بہت بولے لیکن اسے اب گرفتار بھی تم نے ہی کرنا ہے۔" جون نے کہا تو نیل بول پڑا۔

"لیکن باس اب کیری کو کیسے تلاش کریں گے؟ اس کے ہاتھ بھی کافی وزنی تھے۔" نیل نے شرمندگی سے کہا۔

جون بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

جون نے اسے کچھ کاغذات دکھائے اور کہا۔

"مجھے پتا ہے کیری اب کہاں ملے گا۔ یہ وہی پٹیشن ہے جو مارتھا کے ہاتھ سے گر گئی تھی، کیری کو لفافہ ملا تو اسے اندر لے آیا ہوگا۔ کیری گھر کے اندر آنے جانے کے لیے یہ پچھلے باغیچے والا راستہ اختیار کرتا تھا اس لیے فی الحال کسی کی نظروں میں نہ آیا تھا۔ جب میں نے اس کا پورا نام لیا تو مجھے باندھنے کے بعد یہ ریتا سمن کا ایڈریس ڈھونڈنے لگا تھا اور پھر اوپر گیا تو تمہارے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔"

☆☆☆

جب جون وہاں پہنچا تو بیریئر ہٹے ہوئے تھے۔

سائیٹ پر کام زور و شور سے چل رہا تھا اور تمام علاقہ ہموار کیا جا چکا تھا۔ ریتا اور مارتھا ایک درخت کے سائے میں بیٹھی تھیں اور ساتھ دو تین احتجاج کرنے والی خواتین بھی ہلکی آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔

"کہاں ہے وہ؟" جون نے ریتا سے جا کر پوچھا۔

"شش، آہستہ بولیں پلیز۔"

ریتا سرگوشی میں بولی اور پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر گھر کے اندر چلی گئی۔ جون آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا اس کے پیچھے گیا۔ اوپر بیڈ روم میں ایک عجیب نظارہ اس کا منتظر تھا۔ ریتا ایک اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی اور بیڈ پر کیری سکون کی گہری نیند سو رہا تھا۔ ریتا کے چہرے پر ممتا کا نور بکھرا تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ اس کا جگر گوشہ انیس سال بعد اپنے گھر آیا تھا۔ بچوں جیسی معصومیت اس کے چہرے سے عیاں تھی اور سوتے ہوئے بھی وہ مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وقت جیسے ریتا اور کیری کے لیے تھم گیا تھا۔ جون ایسے ابدی لمحات میں دخل در معقولات نہیں چاہتا تھا اس لیے ریتا کو آہستہ سے سرگوشی میں کچھ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل آیا۔

"باس! کیا ہم اندر جا کر اسے گرفتار کرلیں؟" نیل نے ساتھی پولیس والوں کی جانب دیکھ کر کہا۔

"ارے نہیں، پہلے تو چارلی کو چھوڑ دو اور ہاں جیک کو جس طرح مرضی ہے جا کر گرفتار کرلو۔"

جون نے نیل کی جانب دیکھا اور پھر بھاری لہجے میں کہنے لگا۔ "نیل! ایک ماں اپنے لخت جگر کو انیس سال بعد اپنے سامنے آرام کرتا دیکھ رہی ہے اور میں اس سے یہ لمحات کسی بھی صورت نہیں چھیننا چاہتا۔ وقت نے اس سے بہت سے ایسے لمحات چھین لیے لیکن آخر میں انصاف بھی کر دیا۔ ایبٹ اور للی نے خود غرضی سے ریتا سے اس کی روح چرا لی، دوسری جانب جیک، مارک، ڈونا اور ایما نے بھی ایک معصوم کو مرتا چھوڑ دیا اور اس کی ماں کو کچھ نہ بتا کر زندہ درگور کر دیا تھا۔ قدرت نے اپنا انتقام خود ہی لے لیا۔"

انسپکٹر جون کی باتیں سن کر مارتھا بھی خوش ہو رہی تھی۔ اسے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ پولیس والے اتنے کٹھور اور سنگدل نہیں ہوتے۔

"بہت بہت شکریہ انسپکٹر۔" مارتھا جون کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ عقیدت سے تھام کر بولی تھی۔

++

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

فائر بریگیڈ نے ہاردے کے ہوٹل کو لگی آگ پر قابو پالیا تھا۔ علی کی ہاردے سے بات ہوئی تھی۔ اگلے دن علی اور جیک گھومنے پھرنے چلے گئے تھے۔ علی اکیلا عمارت میں موجود تھا کہ دیپک.... ایک مسلح آدمی جیک کو ریوالور کی زد پر لیے عمارت میں داخل ہوا اس نے جیک پر تشدد کیا اور علی کے بارے میں دریافت کیا پھر علی اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا جیک نے اس مسلح آدمی کو بے رحمی سے مار دیا۔ علی اور جیک رشی ہوٹل گئے۔ وہاں علی نے شلپا سے ملاقات کی اور اس سے دیپک کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ دیپک چھٹیوں پر ہے۔ علی اور جیک واپس چلے گئے۔ راستے میں علی کو راموو دکھائی دیا وہ اسے اپنے ساتھ عمارت میں لے گئے۔ علی نے اس سے دیپک کے گھر کے بارے میں پوچھا اور اسے تہ خانے میں بند کر کے وہ دونوں رات کی تاریکی میں دیپک کے گھر چلے گئے۔ وہاں پہلے ہی ان کے لیے جال بچھایا جاچکا تھا راموو نے بتایا تھا کہ دیپک کے ساتھ اس کی ادھوا بہن رہتی تھی۔ جیک باہر کار میں بیٹھا رہا جبکہ علی کوٹھی میں داخل ہوگیا اور کسی نے عقب سے اس پر حملہ کردیا۔ سر فرش سے ٹکرانے کے باعث علی بے ہوش ہوگیا۔ وہ جب ہوش میں آیا تو تہ خانے میں تھا۔ وہاں راموو نے علی پر تشدد کی انتہا کردی تھی۔ اس دوران جیک کو بھی وہاں لایا گیا۔ فرار کے دوران جیک کو گولی لگ گئی اور اس کی [illegible] ہوگئی۔ علی بڑی مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ رات کے وقت اسے دیال سنگھ نامی ٹیکسی ڈرائیور مل گیا جس نے اسے علی کی مطلوبہ جگہ پر اتار دیا لیکن وہ پریشان تھا کہ اتنی رات کو علی سنسان جگہ پر کیوں اترا تھا۔ اسی لیے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی تو علی پریشان ہوگیا۔

(اب آگے پڑھیں)

جیسے جیسے وہ کار قریب آتی جارہی تھی میرے وجود پر اضطراری کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی اب قریب آگئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ کار سبک رفتاری سے میرے سامنے سے گزر گئی اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ اس میں تین افراد سوار تھے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ تینوں دیپک کے ساتھی ہیں تاہم میں نے خود کو تسلی دی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

کار کافی دور جاچکی تھی اس لیے میں جھاڑیوں سے باہر نکل کر تیز تیز قدموں سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ اگر وہ دیپک کے ساتھی تھے تو وہ دیال سنگھ کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اس سے میرے بارے میں پوچھیں گے۔ میں نے یہاں عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ میں راستے میں ہی اتر گیا تھا۔ اگر دیال سنگھ ان کو جہاں میں اترا تھا اس جگہ کی نشان دہی بھی کرتا ہے تو بھی وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

چونکہ یہاں رہتے ہوئے میں راستوں سے واقف ہوچکا تھا اس لیے میں شارٹ کٹ راستوں سے ہوتا ہوا ہاردے کی عمارت میں پہنچ گیا۔ گیٹ کی چابی آنجہانی جیک کے پاس تھی اس لیے میں گیٹ کود کر اندر داخل ہوا تھا۔ باقی کمروں کی چابیاں وہ کہاں رکھتا تھا یہ مجھے معلوم تھا۔ پوری عمارت گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ البتہ لان کی جھاڑیوں سے جھینگروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

میں نے برآمدے میں پڑے گملے میں سے کمرے کی چابی تلاش کی جو مجھے مل گئی۔ یہاں سے جاتے وقت میں نے جیک کو دیکھا تھا اس نے دروازہ بند کرنے کے بعد چابی اسی گملے میں رکھ دی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چابی میز پر رکھ کر اسٹور روم کی طرف بڑھا۔

میں لے اسٹور روم میں داخل ہوکر خفیہ تہ خانے کا دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اترنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک سیڑھیوں پر چھپے ہوئے راموو نے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر سیڑھیوں پر دھکا دے دیا تھا اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے لڑھکتا ہوا تہ خانے کے فرش پر جاگرا۔

یقیناً راموو کو دیپک نے فون پر اطلاع کردی ہوگی کہ میں ان کے چنگل سے نکل جانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ظاہر ہے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں فرار ہونے کے بعد واپس ادھر ہی آؤں گا اس لیے وہ پہلے ہی سیڑھیوں پر میری تاک میں موجود تھا۔

میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا تو راموو جلد بازی میں سیڑھی چڑھتے ہوئے پھسل گیا تھا لیکن فوراً سنبھل گیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ وہ تہ خانے سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ فوراً میرے دماغ میں یہ خیال ابھرا کہ اگر راموو نے تہ خانے سے نکلنے کے بعد دروازہ بند کردیا تو میں تہ خانے میں قید ہوجاؤں گا۔ مجھے باہر سے تو تہ خانے کا دروازہ کھولنے کا میکنزم معلوم تھا لیکن اندر کا پتا نہیں تھا کیونکہ میں دروازہ کھول کر باہر جاتا تھا اور میکنزم کے ذریعے دروازہ بند کرتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ راموو سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کا پیر پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کا پیر میرے ہاتھ میں آتے آتے رہ گیا اور وہ تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ شکر، بوکھلاہٹ میں راموو کو دروازہ بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی جب انسان بوکھلاہٹ کا شکار ہو تو اس کی عقل خبط ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے قاصر ہوجاتا ہے، اسے صرف اتنا یاد ہوتا ہے کہ جان کیسے بچائی جائے۔ راموو کا بھی یہی حال تھا لیکن یہ پریشانی بھی دامن گیر تھی کہ اگر وہ بدبخت اس عمارت سے نکل گیا تو پھر رات کے اندھیرے میں اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اس علاقے میں زیادہ عمارتیں اور مکانات نہیں تھے زیادہ تر کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اگر وہ کسی کھیت میں چھپ گیا تو پھر اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور کسی چیز کی پروا کیے بغیر جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ راموو اسٹور روم سے نکل کر ہال کمرے کی طرف جارہا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال لیا اور راموو کو دھمکی دی۔

”رک جاؤ راموو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔“

راموو پر شاید میری دھمکی کا اثر نہیں ہوا تھا یا شاید وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے گولی چلائی تو گولی کی آواز پورے سناٹے میں گونج جائے گی اور ممکن ہے کوئی پولیس کو اطلاع کردے اس طرح میں پکڑا جاؤں گا۔

میں نے راموو کے پیچھے جاتے ہوئے ریوالور ہال میں پڑے صوفے پر پھینکا اور راموو کے پیچھے دوڑا۔ وہ عمارت سے نکل کر گیٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک ڈنڈا پڑا دکھائی دیا تو میں نے وہ اٹھایا اور اسے گھما کر راموو کی طرف اچھال دیا۔ ڈنڈا اس کی پنڈلی پر لگا اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

زندگی ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، شاید ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ لمبی عمر جیے۔ راموو بھی اپنی جان بچانا چاہتا تھا تبھی اس نے پنڈلی کی تکلیف کی پروا کیے بغیر دوبارہ اٹھ کر گیٹ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا تو وہ دھڑام سے منہ کے بل گر گیا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے وہیں پڑا ڈنڈا اٹھا کر اس کی ٹانگ پر دے مارا۔ اس نے ٹانگ پیچھے کرنے کی کوشش کی لیکن پنڈلی پر ڈنڈا لگ ہی گیا۔

اس بار راموو کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی اور وہ مینڈک کی طرح پھدکنے لگا۔ اس کی حالت خستہ تھی لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈنڈا فضا میں بلند کیا اور دوبارہ رسید کردیا وہ تھوڑا سا پیچھے کھسکا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے خوف بھرے لہجے میں بولا۔ ”ت...... ت...... تمہیں...... بھ...... بھگوان کا واسطہ...... م...... م...... مجھے معاپھ (معاف) کر دو۔“

میرے پورے وجود میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ جواباً میں نے اس کی ٹانگ پر ڈنڈا رسید کردیا۔ وہ ٹانگ پکڑ کر رونے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھ سے معافیاں مانگ رہا تھا یہاں تک کہہ رہا تھا کہ تم جو کہو گے میں وہی کروں گا، میں تمہارا داس بن جاؤں گا لیکن تاریخ گواہ ہے، ہندو بنیے نے کبھی وعدے کا پاس نہیں کیا، ہر موڑ پر اس نے مسلمانوں کو دھوکا دیا ہے۔ اگر میں راموو پر اعتبار کرلیتا تو میرا خیال ہے مجھ سے بڑا بے وقوف اس دنیا میں نہ ہوتا۔

”بدبخت...... تیری وجہ سے جیک اپنی جان سے گیا ہے۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ کہنے کے ساتھ ہی میں نے اس کی ٹانگ پر دوبارہ ڈنڈا مارا پھر تو جیسے مجھ پر جنون طاری ہوگیا اور میں نے اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ درحقیقت مجھ پر جیک کی موت کا غصہ طاری تھا۔ اگر یہ بدبخت راموو دیپک کو فون کرکے میرے منصوبے کے بارے میں نہ بتاتا تو وہ بے چارہ اپنی جان سے نہ جاتا۔ بالآخر اس کے سر پر پڑنے والے ڈنڈے کی ضرب بے ہوشی کا سبب بن گئی۔ میرا سانس بھی بے اعتدال ہوچکا تھا۔ میں نے وحشت بھرے انداز میں ڈنڈا ایک طرف پھینکا اور ہانپتے ہوئے راموو کی طرف دیکھا۔

میں اسے آسان موت نہیں مارنا چاہتا تھا، میں اسے ایسی موت مارنا چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی روح موت کے تصور سے لرز جائے۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور اس کے بھاری وجود کو گھسیٹتے ہوئے راہداری اور ہال سے گزرتا ہوا اسٹور میں لے گیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اس بدبخت روسیاہ انسان کی چیخوں سے کوئی اس طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ اس طرح مسئلہ پیدا ہوسکتا تھا اس لیے باقی کی پوچھ گچھ کے لیے میں نے خفیہ تہ خانے کا انتخاب کیا تھا۔

میں نے خفیہ میکنزم کے ذریعے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور راموو کے بھاری وجود کو سیڑھیوں پر پہنچا کر پیر سے دھکا دیا تو وہ عالم بے ہوشی میں سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا تہ خانے کے

فرش پر جا گرا۔ میں نے تہ خانے کا دروازہ خفیہ میکنزم کے ذریعے بند کیا اور سیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں پہنچا۔ غصے کی حالت میں، میں نے اس کے پہلو میں ٹھوکر ماری تو بے ہوش ہونے کے باوجود اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

میں نے اسے سیدھا کر کے دیوار کے ساتھ لگا کر بٹھا دیا اور اس کے کرتے کی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک جیب سے سیل فون مل گیا۔ میں نے کال میموری چیک کی تو سب سے پہلا نمبر دیپک کا تھا اور وقت آدھا گھنٹا پہلے کا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب میں فرار ہوا تھا تو دیپک نے رامو کو کال کر کے میرے بارے میں آگاہ کر دیا اور جب میں پہنچا تو رامو مجھ پر قابو پانے کے لیے تاک میں تھا۔

میں نے سیل فون مزید چیک کیا تو غصے سے میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ رامو نے دیپک کو بھی کال کی تھی اور وہ وقت رات نو بجے کا تھا۔ گویا اس نے تہ خانے میں جاتے ہی دیپک کو کال کر کے میرے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میں سیل فون آف کرنا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً وہ وائبریٹ ہونے لگا۔ رامو نے اس کی آواز بند کر کے اسے وائبریٹ پر لگا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دیپک کال کر رہا ہے۔

میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا لیا لیکن میں بولا نہیں۔ لمحہ بھر کے بعد دیپک کی بے چینی میں ڈوبی آواز میری سماعت میں پڑی۔ "رامو...... کیا ہوا...... کیا وہ آیا...... تم نے اسے بے ہوش کیا؟"

میں نے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تاہم میں ضبط کھو بیٹھا۔ "دیپک! جس دن تم میرے ہاتھ لگے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا اور تمہاری لاش کو بھوکے کتوں کے سامنے پھینک دوں گا جو بوٹیوں کو نوچ نوچ کر دعوت اڑائیں گے۔"

دوسری طرف یوں خاموشی چھا گئی جیسے میں نے اس کے کان میں سیسہ انڈیل دیا ہو البتہ اس کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ یقیناً خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ رامو کی جگہ میں بات کر رہا ہوں۔

"رامو...... رامو کہاں ہے؟" کچھ دیر کے بعد دیپک نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"ابھی تو وہ بے ہوش ہے لیکن کچھ دیر کے بعد وہ نرک میں پہنچ جائے گا۔" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "اور ہاں...... اپنے گرو گھنٹال رتن کمار کو میرا پیغام دے دینا کہ میں اسے بھی بہت جلد جہنم پہنچا دوں گا۔"

کہنے کے ساتھ ہی میں نے رابطہ منقطع کر کے فون ہی آف کر دیا۔ یہ امکان کسی طرح بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ دیپک، رامو کے سیل فون کی لوکیشن معلوم کرنے کی پوری کوشش کر سکتا تھا۔ فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس میں خاصہ وقت لگ سکتا تھا اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ رامو کو جہنم پہنچا کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔

یہاں سے جانے کی وجہ یہ تھی کہ رتن کمار کے ہرکارے میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اگر سگنل کے ذریعے رامو کا سیل فون ٹریس ہو گیا تو وہ لوگ یہاں تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے پھر میرے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

میرے پاس سیل فون نہیں تھا کہ میں ہاروے سے رابطہ کر کے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیتا۔ یقیناً جیک کا فون بھی دیپک کے ساتھیوں نے نکال لیا ہوگا۔ جس وقت جیک کی جان گئی تھی اس وقت مجھے کسی چیز کا ہوش تھا اور نہ ہی ادراک کہ میں اس کی تلاشی لے کر چیک کرتا۔

میں نے اچانک رامو کی طرف دیکھا تو چونک پڑا۔ خون کی ایک لکیر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کا سر اوپر کیا اور اس کی گردن کی مخصوص رگ پر ہاتھ رکھا تو اگلے ہی لمحے میرے منہ سے گہری سانس نکل گئی۔ رامو مر چکا تھا۔ شاید سر پر پڑنے والے ڈنڈے کی ضرب ہی اس کی موت کا باعث بنی تھی اور وہ عالم بے ہوشی میں ہی مر گیا تھا۔ مجھے اس کے یوں اچانک مرنے پر افسوس ہوا کیونکہ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا تب ہی مجھے سکون ملتا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں رامو کی لاش کہیں دور پھینک آتا۔ بالفرض اگر میں اس کی لاش پھینک بھی آتا اور کسی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو اس نے پولیس کو بتا دینا تھا۔ پولیس سے ہوتے ہوئے یہ اطلاع میڈیا اور ممکن تھا رتن کمار یا دیپک تک پہنچ جاتی اور ان کو یقین ہو جاتا کہ میں اُسی علاقے میں کہیں چھپا ہوا ہوں۔ پھر میری تلاش شروع ہو جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہاروے کی یہ عمارت ان کی نظروں میں آ جاتی اور میں چوہے دان میں پھنس جاتا۔

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے رامو کی لاش تہ خانے میں چھوڑ کر فجر کے وقت نکل

جانا چاہیے کیونکہ اُس وقت یہاں سے نکلنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہاں تک کہ کسی بھی سواری کا ملنا بھی مشکل تھا۔ دوسرے اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ مجھے چور یا ڈاکو سمجھ لے گا۔ میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا تھا پہلے ہی میں تلخیِ ایام کے بہت سے ادوار سے گزر چکا ہوں۔ ہر کسی نے میرا نقصان کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس لیے میں نے یہاں سے صبح ہی نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے باقی وقت اونگھتے جاگتے میں گزارا۔ ایک بار چائے کی طلب ہوئی تھی جو میں نے خود ہی بنائی تھی۔

صبح کے چار بجے کا وقت تھا جب مجھ پر نیند غلبہ پانے لگی۔ ساتھ ہی کسلمندی بھی محسوس ہو رہی تھی تاہم میں نے واش روم میں جا کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور بڑے سے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔

گرمی اور دھوپ میں بھاگ دوڑ کے دوران میری رنگت سانولی پڑ چکی تھی۔ ہلکی ہلکی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ میرا لباس بھی گرد آلود تھا۔ رات کو عمارت میں آتے ہی مجھے لباس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ پیشانی پر پڑنے والا نیل بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔

میں نے کمرے میں جاتے ہی الماری کھولی اور جیک کا ایک سوٹ منتخب کر کے دوبارہ واش روم میں گھس گیا۔ شاور لینے کے بعد میری کسلمندی دور ہو گئی اور میں خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ گو دماغ پر نیند کا ہلکا ہلکا خمار تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں اس پر قابو نہ پا سکتا۔ گزرے حالات و واقعات نے مجھے کندن بنا دیا تھا۔ میں ہر طرح کے سرد و گرم سے نمٹنے کا عادی ہو چکا تھا۔

میں نے جیک کا سوٹ زیب تن کیا اور واش روم سے باہر آ گیا۔ مجھے الماری میں ایک کیپ بھی پڑی دکھائی دی تھی اور مجھے اچانک ہی اس کا خیال آ گیا تھا جو دھوپ سے بچانے کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اب جلد از جلد اس ٹھکانے سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا چاہتا تھا تا کہ رتن کمار کے خلاف کھل کر کام کر سکوں۔

ناشتے کی طلب تھی لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ شہر جا کر کچھ کھاؤں پیوں گا۔ میں نے کیپ سر پر جمائی اور اپنے لباس سے انڈین کرنسی، ریوالور اور راموں کا سیل فون سوٹ کے جیبوں میں منتقل کر دیا۔ دروازوں کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کودنے سے پہلے میں نے درزوں سے باہر کا جائزہ لیا پھر کان لگا کر سن گن لی۔

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ باہر کوئی موجود نہیں ہے تب میں نے گیٹ پر چڑھ کر باہر جھانکا اور قریب و دور میں کسی کو نہ پا کر باہر کود گیا۔ کافی دور پہاڑوں سے قدرے فاصلے پر لوگ پتھر توڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہ دی ہوگی۔ اگر دیکھا بھی ہوگا تو سرسری طور پر۔

میں تیز تیز چلتا ہوا ایک طرف بڑھا۔ اگرچہ میری پسلیوں میں ہلکا ہلکا درد تھا لیکن قابلِ برداشت تھا۔ میں نے رات کو پین کلر لے لی تھی جس سے کافی افاقہ ہوا تھا۔

میں لمبا چکر کاٹ کر جانے کی بجائے بنجر زمین پر چلتا ہوا مین روڈ پر پہنچا۔ دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہ دے رہی تھی۔ گرمی بھی بڑھ گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ میرے جسم کے مساموں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا۔

میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر پیدل ہی شہر کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں رہتے ہوئے میں کافی راستوں سے واقف ہو چکا تھا۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں پیچھے بھی مڑ کر دیکھ لیتا تھا تا کہ اگر کوئی وہیکل آ رہی ہو تو اس سے لفٹ لے لوں۔

سڑک کے دونوں اطراف میں بنجر زمینیں تھیں۔ پہاڑوں کے پیچھے آبادی میں جانے کے لیے کچے اور غیر ہموار راستے بھی تھے۔ میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ بائیں طرف والے کچے راستے سے ایک بیل گاڑی نکلتی دکھائی دی۔ اس کا رخ شہر کی طرف تھا اور اس پر سڑکیں بنانے کے لیے استعمال ہونے والے چھوٹے چھوٹے پتھر لدے ہوئے تھے۔ بیل گاڑی والا پتھروں کے اوپر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پیلے رنگ کی پگڑی تھی۔ میں بیل گاڑی چلانے والے کو نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ اس کی میری طرف پشت تھی۔ میرے ذہن میں خیال آیا تو میں تیز تیز چلتا ہوا بیل گاڑی کی طرف بڑھا۔

وہ ایک پختہ العمر آدمی تھا۔ اس کے جسم پر دھوتی اور میلی سی بنیان تھی۔ رنگت تانبے کی طرح گہری سانولی تھی۔ اس کے چہرے پر داڑھی تو نہیں تھی لیکن مونچھیں گھنی اور سفید تھیں۔ اس نے مجھے دیکھا تو شاید میرے لباس کی وجہ سے رعب میں آ گیا۔ فوراً ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر "نمسکار مہاراج" کہہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ہندو ہے۔ اس نے بیل گاڑی روک دی تھی۔

اُس کے نمسکار کے جواب میں، میں نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اور پوچھا۔ "کیا تم شہر جا رہے ہو؟"

"ہاں مہاراج۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواباً کہا۔ "تم بھی شہر جانا چاہتے ہو گے لیکن سواری نہیں مل رہی ہوگی، یہاں سے سواری ملنا بہت مشکل ہے مہاراج، تم میری گاڑی میں بیٹھ سکتے ہو۔ میں تم کو شہر چھوڑ دوں گا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے بیل گاڑی میں بیٹھنے کی آفر کیوں دے رہا ہے۔ درحقیقت وہ میری شخصیت کے رعب میں آ گیا تھا اور اسے توقع تھی کہ میں شہر پہنچنے کے بعد اسے کچھ پیسے انعام کے طور پر بھی دے دوں گا۔ بہرکیف میں بیل گاڑی پر چڑھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تو اس نے بیل گاڑی آگے بڑھا دی۔

"مہاراج! کس بستی کے رہنے والے ہو۔ میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تو میں نے کرتار پور کا نام لے دیا۔ میں اسے کسی قسم کے شک و شبے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ گاؤں اور پہاڑوں پر رہنے والے لوگ شہر کے لوگوں کی بہ نسبت خاصے ہوشیار اور جہاندیدہ ہوتے ہیں۔ میری بات سن کر وہ مطمئن ہو گیا۔ جب میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"جیتے رہو مہاراج۔" وہ خوش ہو کر بولا تو میں نے سر کو جنبش دے دی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دھرمندر۔" اس نے جواب دیا۔ "میں کرتار پور کے قریب کے گاؤں میں رہتا ہوں۔"

جواباً میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

بیل گاڑی آگے بڑھتی رہی اور ہم دونوں خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی لیکن گرمی کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ سورج نے گویا آگ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ دیہاتوں اور پہاڑوں میں رہنے والے لوگ گرمی اور سردی کے عادی ہوتے ہیں اس لیے وہ ان موسموں کی پروا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جسم ٹھوس اور طاقت ور ہوتے ہیں۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ عبور کیا تھا کہ دفعتاً ہوا کے دوش پر گاڑیوں کی آوازیں لہراتی ہوئی ہماری سماعتوں میں پڑیں۔ دھرمندر نے تو گردن موڑ کر پیچھے دیکھنا گوارا نہ کیا لیکن میں نے بے اختیار چونکتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا تو کافی دور دو گاڑیاں دوڑتی ہوئی آ رہی تھیں۔ جب وہ مزید تھوڑا آگے آ گئیں تو میں نے دیکھا، ان میں سے ایک ٹیکسی تھی تو دوسری کار۔ ٹیکسی آگے تھی جبکہ کار اس کے پیچھے۔

نہ جانے کیوں میرے وجود میں سنسناہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی اور میرے دماغ نے خطرے کا الارم بجانا شروع کر دیا۔ میں نے دھرمندر کی طرف دیکھا تو وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔ میں اگر پتھروں پر لیٹ جاتا تو بھی ٹیکسی اور کار میں بیٹھے لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ بادلِ نخواستہ میں پتھروں پر لیٹ گیا جیسے میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔

شاید دھرمندر کو محسوس ہو گیا تھا تبھی اس نے گردن موڑ کر استفسار کیا۔ "مہاراج! کیا بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔

میرے کان پیچھے سے آنے والی ٹیکسی اور کار کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ احتیاطاً میں نے جیب میں موجود ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی تھی۔

تقریباً تین منٹ ہی گزرے تھے کہ دونوں گاڑیاں بیل گاڑی کے قریب سے گزرتی چلی گئیں۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ دونوں گاڑیاں بیل گاڑی سے قدرے دور جا چکی ہیں تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اگلے ہی لمحے میں بے اختیار چونک پڑا کیونکہ ٹیکسی اور کار قدرے دور سڑک کے کنارے رک گئی تھیں۔ میں نے غور کیا تو وہ دونوں گاڑیاں اسی جگہ رکی ہوئی تھیں جہاں گزشتہ رات میں ٹیکسی سے اترا تھا۔

میرے وجود میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے ٹیکسی سے نکلنے والے ڈرائیور کو پہچان لیا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں دیال سنگھ تھا اور دوسری کار سے نکلنے والے دیپک کے ساتھی تھے جو میری تلاش میں آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ساری صورتِ حال سمجھ میں آ گئی تھی۔ رات جس کار کو میں نے دیکھا تھا اس میں دیپک کے ساتھی سوار تھے اور انہوں نے یقیناً ہوٹل والے لڑکے سے میرے اور دیال سنگھ کے بارے میں معلوم کیا ہوگا اور پھر ہمارے پیچھے آئے ہوں گے۔

یقیناً لڑکے نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ دیال سنگھ کا دوست دھرم سنگھ کرتار پور میں رہتا ہے اور وہ سواری کو اتارنے کے بعد دھرم سنگھ کے پاس چلا جائے گا اسی لیے دیپک کے ساتھی دیال سنگھ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ انہیں اسی جگہ لے گیا تھا جہاں میں اترا تھا۔

اُس جگہ دیال سنگھ کو لانے کا مقصد یہی تھا کہ وہ یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ اس نے مجھے رات کہاں ڈراپ کیا تھا۔

دیال سنگھ سڑک کے دوسرے کنارے کھڑا دیپک کے ساتھیوں کو تاڑ رہا تھا۔ یقیناً دیال سنگھ کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ دیپک کے ساتھیوں کو بالکل ٹھیک جگہ پر لے آیا تھا۔

میرے دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فوراً قرب وجوار کا جائزہ لیا۔ میرے بائیں طرف کھائیاں تھیں لیکن وہ زیادہ گہری نہیں تھیں البتہ ان کے کناروں پر خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اگر میں کسی کھائی میں چھلانگ لگا تا تو بہ آسانی چھپ سکتا تھا چنانچہ کچھ سوچ کر میں نے دھرمندر سے کہا۔ "سنو......"

"کہو مہاراج؟" دھرمندر فوراً میری طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے پیشاب کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چلتے رہو۔ میں پیشاب کر کے آرہا ہوں۔"

"مہاراج! اگر کہو تو میں رک جاتا ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔

"نہیں۔" میں نے انکار کر دیا۔ اس کا رکنا دیپک کے ساتھیوں کو مشکوک کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے مہاراج۔"

"اور سنو۔ وہ سامنے کار والے کھڑے ہیں۔ اگر وہ تم سے کسی ایسے نوجوان کے بارے میں پوچھیں جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو تو تم انکار کر دینا کہ تم نے ایسے کسی شخص کو نہیں دیکھا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دراصل وہ میرے ساتھ شہر میں کام کرتے ہیں اور میری ان سے رنجش چل رہی ہے۔ میں تمہیں مزید پیسے دوں گا۔ سمجھ گئے ہو نا؟" کہنے کے ساتھ ہی میں نے سو کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تو ایک بار پھر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"سمجھ گیا ہوں مہاراج! تم چنتا مت کرو۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" دھرمندر نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں چلتی بیل گاڑی سے اتر کر سانپ کی طرح ایک کھائی میں رینگ گیا۔

کھائی زیادہ گہری نہ تھی اگر میں کھڑا ہو جاتا تو اس کا کنارہ میرے پیٹ تک آتا تھا جس پر جھاڑیاں تھیں۔ کھائی میں پہنچتے ہی میں نے تھوڑا سا سر باہر نکالا اور میری نظریں دیال سنگھ اور دیپک کے ساتھیوں پر جم گئیں۔ دیپک کے ساتھی اب کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں سے جا رہے تھے البتہ دیال سنگھ ابھی تک سڑک کنارے ہی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا شاید وہ کسی سے رابطہ کر رہا تھا۔

دیپک کے ساتھی شہر کی طرف جانے کی بجائے بیل گاڑی کی طرف آگئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے آدمی نے دھرمندر کو بیل گاڑی روکنے کا اشارہ کیا تو اس نے گاڑی روک دی۔

اس نے کار والے نے کچھ پوچھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے میرے ہی بارے میں پوچھا ہوگا کیونکہ دھرمندر نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ تبھی کار والے نے کچھ کہا تھا اور کار میں بیٹھ گیا تھا پھر وہ لوگ کرتار پور کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ جب کار کافی دور چلی گئی تو میں جھاڑیوں سے نکل آیا۔ دھرمندر اپنی بیل گاڑی روکے کھڑا تھا۔ میں نے جیب سے ایک اور نوٹ نکال کر دھرمندر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "دھنے واد۔ یہ تمہارا انعام۔"

دھرمندر نے نوٹ لے کر اپنی دھوتی میں چھپایا اور استفسار کیا۔ "مہاراج! کیا تم ہتیارا ہو؟"

"ارے نہیں دھرمندر۔" میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اچھا تم جاؤ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

دھرمندر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں تیز تیز چلتا ہوا ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی بیل گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ دیال سنگھ کو میری آمد کا احساس ہو گیا تھا تبھی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں، اس نے جلدی سے سیل فون کان سے ہٹالیا۔

میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں اپنی زبان میں کہا۔ "او تسی کتھے سی؟" (تم کہاں تھے)

"چلو دیال سنگھ۔ باقی باتیں راستے میں کریں گے۔" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"او تسی کو تین چار بندے تلاش کر رہے ہیں۔" دیال سنگھ نے کہا۔ "تسی دی تلاش میں وہ میرے دوست دھرم سنگھ کے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ تسی کو راستے میں اتار دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ مجھے اِدھر لے آئے۔ وہ اب تسی دی تلاش میں کرتار پور گاؤں گئے ہیں۔"

"ہاں میں نے دیکھا ہے ان کو۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سرکار! چکر کیا ہے؟ وہ تسی کیوں تلاش کر رہے ہیں؟" دیال سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا تو مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"میں نے کہا نا، ٹیکسی میں بیٹھو باقی باتیں راستے میں کریں گے۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "اب چلو، وہ دوبارہ اِدھر آگئے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تمہیں بھی نقصان پہنچ جائے۔ چلو۔"

دیال سنگھ بھی شاید میری بات سمجھ گیا تھا اس لیے جلدی سے بولا۔ "ہاں سرکار، تسی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جان ہے تے جہان ہے ورنہ کچھ نہیں۔ چلو۔"

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ بیل گاڑی اب کافی دور جا چکی تھی۔ دیال سنگھ نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ میں نے بیک مرر میں دیکھ لیا تھا کہ ہمارے عقب میں دیپک کے ساتھی نہیں آرہے تھے اس لیے میں مطمئن تھا۔ چند لمحوں کے بعد ٹیکسی بیل گاڑی کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ دھرمندر نے مجھے دیکھا تھا۔

"بتاؤ سرکار، مسئلہ کیا ہے؟" دیال سنگھ نے میری طرف دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "وہ کون لوگ ہیں اور تسی کے خون کے پیاسے کیوں ہو رہے ہیں؟ تسی نے ان کا کیا نقصان کیا ہے؟"

"دیال سنگھ، بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"کتنی لمبی سرکار۔" اس نے پوچھا تو مجھے اس کے احمقانہ سوال پر ہنسی آگئی۔

"تسی ہنس کیوں رہے ہو سرکار؟" دیال سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ویسے ہی ہنسی آگئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے جو مجھے تلاش کر رہے تھے، انہوں نے میرے بارے میں تمہیں کیا بتایا تھا؟"

"او جی کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا ہتیارا ہے۔ اس نے ان کے کئی بندوں کی ہتیا کی ہے۔" دیال سنگھ نے جواباً کہا پھر لحہ بعد مستفسر ہوا۔ "کیا تم واقعی ہتیارے ہو سرکار۔"

"تم کیا کہتے ہو میرے بارے میں؟" میں نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ "کیا میں ہتیارا ہو سکتا ہوں؟"

میرے سوال پر دیال سنگھ گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہوا پھر بولا۔ "سرکار، مجھے تو تسی ہیرو لگتے ہو، میرا دل نہیں مانتا کہ تسی ہتیارے ہو سکتے ہو۔ تسی مجھے پوری بات بتا دو تو تسی کی مہربانی ہوگی۔"

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں دیال سنگھ۔" میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی بتا دو سرکار۔" دیال سنگھ نے بے ساختہ کہا۔ "ویسے کچی بات ہے میں نے ایسے سین فلموں میں دیکھے ہیں کہ ایک منش کے پیچھے بہت سارے منش ہوتے ہیں اور وہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آتا۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ شاید اسے کسی فلم کا سین یاد آیا تھا۔

"دیال سنگھ۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ فلم نہیں حقیقت ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ جو میرے پیچھے ہیں وہ پاکھنڈی لوگ ہیں۔ انہوں نے میرے دوست کی ہتیا کی ہے اور میں اپنے دوست کے ہتیاروں سے لینا چاہتا ہوں اسی لیے وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔"

دیال سنگھ کے چہرے پر خوف کے سائے لہرائے۔ کچھ دیر تو وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اس کے بولنے پر پابندی لگا دی ہو۔ وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہا، بولا۔ "او جی...... مجھے تسی کے دوست کی ہتیا پر بہت افسوس ہوا ہے، تسی کے ساتھ واقعی انیائے ہوا ہے۔ لیکن سرکار، کون لوگ ہیں یہ؟"

"یہ بہت بڑا گینگ ہے دیال سنگھ۔ اگر تمہیں ان کے کرتوتوں کا پتا چل جائے تو تم بھی ان پر تھوتھو کرو گے۔" میں نے تنفر سے کہا۔

ٹیکسی اب مضافات سے نکل کر شہری حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ سڑک کے دائیں سائیڈ پر کچھ دکانیں تھیں جن میں پرچون، فرنیچر، ویلڈنگ کی دکانیں نمایاں تھیں۔ کچھ ریڑھی والے بھی کھڑے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ کچھ بچے جنہوں نے نیکریں پہنی ہوئی تھیں کھیل کود میں مصروف تھے۔ وہ بالکل ہی ویسا سماں تھا جیسا ہمارے ہاں دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ ایک مسجد بھی دکھائی دی تھی جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں بڑی محویت سے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور مجھے اپنے ملک کے دیہات یاد آرہے تھے۔

"سرکار! اگر تسی کو مناسب لگے تو مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتا دو۔" کچھ دیر کے بعد دیال سنگھ نے کہا تو میں بے اختیار چونک کر حال میں لوٹ آیا۔

وہ کچھ زیادہ ہی متجسس ہو رہا تھا۔

"رتن کمار کو جانتے ہو؟"

"رتن کمار؟" اس نے زیرلب دہرایا اور سوچنے لگا پھر جیسے اسے یاد آگیا تو اس نے استفسار کیا۔ "وہی رتن کمار جس کا بہت بڑا ہوٹل ہے؟"

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ بعدازاں میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور اینڈرسن کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جب اس سے ملاقات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے میں سوار ہوتے ہی میں نے ڈرائیور کو چیتن جی روڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ اینڈرسن کی رہائش گاہ چیتن جی روڈ پر ہی تھی۔ لوکیشن میرے ذہن میں محفوظ تھی اس لیے مجھے پریشانی نہیں تھی۔

رکشے کا ڈرائیور سانولی رنگت کا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا آدھا سر بالوں سے عاری تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ اس نے میلا سا پاجامہ اور ہاف بازوؤں والی پیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ ڈرائیور نے رکشے کی رفتار کم کردی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میں دراصل اپنی ماں اور بہن مرینہ کے حوالے سے سوچنے میں مگن تھا جن کی مجھے کوئی خیر خبر نہیں تھی البتہ میں اس حوالے سے مطمئن تھا کہ وہ دونوں الماس حیدر کے گھر رہ رہے تھے اس لیے محفوظ تھے۔

شانزے کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھ سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی یقیناً مضطرب ہوگی جیسے اس کا خیال آتے ہی میں مضطرب ہوا تھا۔ اچانک مجھے شور وغل سنائی دیا تو میں نے گردن اونچی کرکے سامنے دیکھا۔ لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ ٹریفک بھی بلاک تھا۔

"یارا! آگے ٹریفک بلاک ہے۔" دفعتاً ڈرائیور نے اپنی گردن موڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹریفک کیوں بلاک ہے؟" میں نے بیزاریت سے پوچھا۔

"یارا! ممبئی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ یہاں کی سڑکوں پر ٹریفک بہت بلاک رہتا ہے۔" ڈرائیور نے تبصرہ کیا یا شاید اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

"ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے جواباً کہا۔

"آپ بیٹھو، میں دیکھ کر آتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے۔" ڈرائیور نے کہا اور رکشے سے اتر کر لوگوں کے جم غفیر کی طرف چلا گیا۔ میں نے بھی پچھلے دنوں اخبار میں ایک سیاح کے حوالے سے اس کے خیالات پڑھے تھے۔ اس سیاح کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کے خیالات یاد تھے۔ اس نے کہا تھا کہ سیاح اکثر کسی بھی شہر کے بارے میں صرف دو باتوں کا سوچتے ہیں یعنی اچھا یا برا۔ اس حوالے سے ممبئی ایک بڑا شہر ہے۔ ایک ایسا شہر، جہاں مسائل زیادہ ہیں۔ اگر ایک مغربی سیاح یہاں آتا ہے تو اسے ٹریفک جام کے سبب گاڑی کے ذریعے محض تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اگر آپ ممبئی کو معیارات کے حوالے سے جانچنے لگیں تو پھر شاید کوئی بے وقوف ہی اس شہر کا رخ کرے۔

اخبارات میں اس شہر کے مسائل کے حوالے سے بھی میں نے خبریں پڑھی تھیں۔ ممبئی میں ٹریفک جام رہنا معمول کی بات تھی۔ یہ شہر ایک طرف تو ارب پتیوں اور فلمی ستاروں کا شہر کہلاتا ہے اور دوسری جانب اسی شہر میں غریب بستیاں غربت کی انتہا کا نمونہ ہیں لیکن اس کے باوجود بھی لوگ ممبئی کا رخ ضرور کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو معاشی ضروریات یہاں لے آتی ہیں جبکہ کچھ کو ایک بڑے شہر کی زندگی اور اس کا رنگا رنگ ثقافتی تنوع یہاں کھینچ لاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے نوجوانوں کے لیے یہاں موجود بالی ووڈ صنعت بھی کشش کا باعث ہے اور وہ قسمت آزمائی کے لیے یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

گرمی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ پسینے کے سبب میری شرٹ بھیگ چکی تھی اور رکشے میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اسی لیے میں تازہ ہوا کھانے کے لیے رکشے سے نیچے اتر آیا۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور گاڑیوں سے آگے لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ڈرائیور ہانپتا کانپتا واپس آگیا۔ وہ بھی پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے آدھے گنجے سر پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بیزاریت تھی۔

"کیا مسئلہ ہوگیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہی ہندو مسلم فساد۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر میں چونکا۔

"ہوا کیا ہے، آپ نے یہ معلوم کیا؟"

"ہاں باؤ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ رکشے میں بیٹھو، میں بتاتا ہوں۔ گرمی بہت ہے۔"

ہم رکشے میں بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔ "ایک ہندو لڑکے نے مسلم لڑکی کو چھیڑا تھا۔ اس لڑکی کا بھائی بھی ساتھ ہی تھا، اس نے جب ہندو لڑکے کو منع کیا تو وہ باز نہ آیا اور اپنے ساتھیوں کو بلا لیا بس اسی وجہ سے ان کی لڑائی ہوگئی۔ انتہا پسند ہندوؤں نے تو مسلمانوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ مسلمانوں پر تشدد کرنے اور انہیں جان سے مارنے کے تو وہ موقعے

ڈھونڈا کرتے ہیں۔ انتہا پسند ہندوؤں کو پتا چل جائے کہ کسی مسلم کے گھر کی فریج میں گائے کا گوشت موجود ہے بس پہلے وہ گھر میں گھس کر لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں پھر خود پولیس کو اطلاع کردیتے ہیں اور پولیس گھر کے سربراہ کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ سرکار بھی ایسے لوگوں کے خلاف ایکشن نہیں لیتی۔ مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ پتا نہیں یہ ظلم کب ختم ہوگا؟"

اس کے لب ولہجے سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور اسے ایسے فسادات پر تاسف ہے۔ وہ بے چارہ اپنی طرف سے تو یہ سب بول گیا تھا لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں یا ہندو۔ شاید اگر میری جگہ کوئی انتہا پسند ہندو اس کے رکشے میں سوار ہوتا اور وہ اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تو اس نے اس ڈرائیور کو نہیں چھوڑنا تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ لمحہ بھر کے بعد مجھے اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات محسوس ہوئے۔ شاید اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اسے میرے سامنے ہندوؤں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"جی...... وہ...... میرا......" کہتے کہتے وہ خاموش ہوگیا۔

"ارے پریشان مت ہوں، میں تو ویسے ہی آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا تاکہ اس کا خوف کم ہو۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر شاید اس کی جان میں جان آئی تھی تبھی وہ بھی ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا نام قادر ہے باؤ......"

"میں سمجھ گیا کہ آپ مسلمان ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں بھی مسلمان ہوں۔ آپ نے جو باتیں کی ہیں بالکل بجا کی ہیں لیکن خیال رکھیں، کبھی یہ باتیں کسی انتہا پسند ہندو کے سامنے نہ کردیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو باؤ۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ہمارے رکشے کے پیچھے بھی گاڑیوں کی قطاریں لگ گئی تھیں اس لیے ڈرائیور رکشا پیچھے بھی نہیں موڑ سکتا تھا۔ ہم بھی ٹریفک میں پھنس ہی گئے تھے۔ گاڑیوں میں بیٹھے لوگ ہارن پر ہارن بجا رہے تھے اور فضا ہارنوں کی آوازوں سے مرتعش ہو رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سورج بھی سوا نیزے پہ پہنچتا جا رہا تھا۔

میرا کھلے عام پھرنا میرے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا اس لیے میں نے وہاں سے پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ نہ جانے ٹریفک کب بحال ہو تب تک تو گرمی سے جسم کا سارا عرق ہی نکل جائے گا۔ میں نے سو کا ایک نوٹ ڈرائیور کو دیتے ہوئے کہا۔ "قادر صاحب، آپ کا شکریہ۔ میں آگے پیدل چلا جاؤں گا۔"

ڈرائیور قادر نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں گاڑیوں کے درمیان راستے پر چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب میں مجمع کے قریب پہنچا تو وہ منظر دیکھ کر ہی میرے ہوش اڑ گئے۔

ایک لڑکا زمین پر پڑا تھا اور تین لڑکے اسے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ ٹھوکریں کھانے والے لڑکے کی حالت بے حد خراب تھی اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے وہ قریب المرگ ہو۔ ایک لڑکی مسلسل چیخ چیخ کر ان تینوں لڑکوں کو زمین پر پڑے لڑکے کو مارنے سے روک رہی تھی ساتھ ہی وہ قرب وجوار میں کھڑے لوگوں سے مدد کی اپیل بھی کر رہی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس لڑکے کو ان تینوں کے عتاب سے بچاتا۔

اس لڑکی اور لڑکے کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جسے ان لڑکوں نے چھیڑا ہوگا اور برا لگنے پر ان تینوں لڑکوں نے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ وہ تینوں لڑکے اپنے حلیوں سے ہی ہندو لگ رہے تھے۔ پتلونوں کے ساتھ ٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ ہر لڑکے کی کلائی میں دھاگا بندھا ہوا تھا۔ ان کے پیروں میں جوگرز تھے۔ ان کے رنگ بھی سانولے تھے۔ ایک کے ماتھے پر قشقا بھی تھا۔

انڈیا میں ہندو مسلم فسادات عام تھے۔ ہم اکثر خبرناموں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے تشدد آمیز مناظر دیکھتے رہتے ہیں۔ اس روز میں اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ رہا تھا اور بالآخر میرے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔

میں نے طائرانہ نظر قرب وجوار میں تماشا دیکھنے والوں پر ڈالی۔ سب لوگ دائرے کی صورت میں یوں کھڑے تھے جیسے ان کے سامنے مداری بندر کا تماشا دکھا رہا ہو۔ پھر آگے بڑھ کر میں نے ایک لڑکے کو بازو سے پکڑ کر ایک سائیڈ پر کر دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے ہیرو بننے کا شوق تھا۔ مجھ سے مسلمان لڑکے پر ہونے والا تشدد دیکھا نہیں گیا تھا۔ وہ تینوں اس لڑکے کو یوں پیٹ رہے تھے جیسے وہ انسان نہیں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

میں نے جس لڑکے کو بازو سے پکڑ کر ایک سائیڈ پر کیا تھا اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اسے پسند نہ آیا ہو کہ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر کیوں کیا ہے۔ اس کے ساتھی لڑکے بھی اب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور زمین پر پڑے لڑکے کو چھوڑ کر میری سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نے مجھے سر سے پاؤں تک یوں دیکھا جیسے قسائی بکرے کا جائزہ لیتا ہے۔

زخمی لڑکے کی بہن اس کے پاس بیٹھی اسے اٹھنے میں مدد دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس لڑکے کی حالت دیکھ کر میرے خون کا ہر قطرہ تیزاب بن کر میرے وجود میں آگ کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

''کون ہے بے تو؟'' جائزہ لینے والے لڑکے نے ٹھیٹھ ہندی میں مجھ سے تنفر بھرے لہجے میں میرے بارے میں پوچھا۔ مجھے اس کا لہجہ اچھا نہ لگا تبھی جواب دینے کی بجائے میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''رشتے میں تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں، نام ہے شہنشاہ۔'' میں نے انڈین فلم شہنشاہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تو وہاں موجود لوگ دبے دبے انداز میں ہنس دیئے۔ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ ڈائیلاگ مجھ سے کیسے ادا ہو گیا۔ بہرکیف ان لڑکوں کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس لڑکے نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے نئی نئی فلم دیکھی ہے اسی لیے ڈائیلاگ مار رہا ہے۔''

''تم تینوں اس لڑکے کو کیوں مار رہے ہو؟'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا حالانکہ مجھے سب کچھ معلوم تھا پھر بھی میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''ابھی بتاتا ہوں شہنشاہ کی اولاد۔'' اس نے اشتعال بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ اس نے میرے منہ پر گھونسا مارنا چاہا لیکن میں چشم زدن میں سر جھکا گیا ورنہ منہ پر پڑنے والا اس کا گھونسا میرے منہ پر نیل ضرور چھوڑ جاتا۔

اگلے ہی لمحے میں نے اسے اٹھا کر اس کے دوستوں پر پھینک دیا جو میری طرف آ رہے تھے۔ تینوں ایک ساتھ زمین پر گرے۔ ایک لڑکے کی ہلکی سی کراہ بھی سنائی دی تھی شاید وہ دو لڑکوں کے نیچے دب گیا تھا۔ پھر اٹھنے کے ساتھ ہی ان تینوں نے مجھے ماں بہن کی غلیظ گالیاں دیں۔ فرط اشتعال سے میرا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ ہی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ میں نے ایک کی ناک پر گھونسا مارا، دوسرے کا بازو مروڑ کر اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ ناک پر گھونسا کھانے والا اپنے تیسرے ساتھی سے ٹکرا گیا تھا اس لیے وہ مجھ پر حملہ نہ کر سکا۔

ہمارے چاروں طرف دائرے کی صورت میں موجود لوگ بہ دستور تماشا ہی دیکھ رہے تھے۔ لڑائی، مارکٹائی والے واقعات تو ویسے بھی لوگوں کے لیے دلچسپی کا سامان بنا کرتے ہیں۔ لوگوں کو شاید یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں کسی انڈین فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ چاہے ہمارے ملک کی فلم انڈسٹری کی کسی فلم کی شوٹنگ سڑک پر ہو یا بالی ووڈ کی فلم کی شوٹنگ، لوگ دلچسپی سے اور مفت میں شوٹنگ دیکھ لیتے ہیں اور پھر یار دوستوں میں بیٹھ کر اس کا بڑے ہی فخریہ انداز میں تذکرہ کرتے ہیں جیسے فلم کی شوٹنگ دیکھنا ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہو۔

ناک پر گھونسا کھانے والے لڑکے کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا جسے وہ ہتھیلی سے مسلسل صاف کرنے میں مصروف تھا۔ میں ذرا سا ان کی طرف سے غافل ہوا تھا کہ ان دونوں نے مل کر اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔ ایک کے ہاتھ میں چاقو تھا اور اس نے اپنی دانست میں میرے سینے میں چاقو مارنے کی کوشش کی تھی۔

کاتب تقدیر جب تک نہ چاہے مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چاقو پکڑے لڑکے نے اپنی طرف سے تو مجھے چاقو مارنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اس کا پیر رپٹ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا گیا البتہ اس کے دوسرے ساتھی کا گھونسا میرے منہ پر پڑا تھا اور میں بھی چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا تھا۔ غصے کی شدت سے میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ قبل اس کے وہ دوبارہ مجھ پر وار کرتا، میں نے امریکن ریسلر رومن رینز کی طرح اچھل کر اس کی کنپٹی پر مکا مارا تو وہ اچھل کر زمین پر گرا اور کراہنے لگا۔

میں ایک اور لڑکے کی طرف بڑھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ تیسرے لڑکے نے بھی اٹھنے میں دیر نہ لگائی۔ جاتے وقت وہ مجھے دھمکیاں دینا نہ بھولا تھا کہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرا باپ بہت بڑا آدمی ہے وہ تجھے نرک سے بھی نکال لائے گا۔

مجمع بھی آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ساتھ ہی گاڑیاں بھی کچھوے کی رفتار سے رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی اس لڑکے اور لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ ون وے روڈ تھا اس لیے دوسری طرف گاڑیاں نہیں تھیں۔

مجھے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں رتن کمار کے ساتھی میری تلاش میں وہاں نہ پہنچ جائیں۔ وہ گینگسٹر تھا اور اس کے آدمی پورے ممبئی میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ جدید دور تھا میں نے دیکھا جب میں ان لڑکوں کی ٹھکائی کر رہا تھا تو کئی لوگ ویڈیوز بھی بنا رہے تھے۔ ممکن تھا انہوں نے سوشل میڈیا پر بھی وائرل کر دی ہوں۔ اگر رتن کمار یا اس کے کسی ساتھی نے ویڈیو دیکھ لی تو وہ مجھے پہچان جائیں گے اور وہاں پہنچنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کریں گے۔ وہ میرے جانی دشمن تھے اور مجھے کسی صورت زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔

میں زخمی لڑکے کی طرف بڑھا جو اپنی بہن کے ساتھ ایک طرف کھڑا مشکور نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زخمی تھا اور منہ سے بھی خون نکل رہا تھا۔ دائیں طرف والی آنکھ پر نیل کا نشان تھا۔ اسے مارنے والے لڑکوں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ اسے ٹھوکریں کہاں کہاں لگ رہی ہیں بس وہ اسے مارتے ہی رہے تھے۔ ان تینوں لڑکوں نے اس لڑکے کا مار مار کر برا حشر کر دیا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بھی تشکر آمیز تاثرات تھے۔ میرے اندازے کے مطابق لڑکے کی عمر بیس اکیس سال ہو گی اور لڑکی اٹھارہ سال کے لگ بھگ دکھائی دی تھی۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' میں نے از راہ ہمدردی پوچھا۔

''ہاں بھائی، میں ٹھیک ہوں۔'' لڑکے نے جواباً کہا۔

''بھیا! میرا خیال ہے آپ کو اسپتال جانا چاہیے۔'' لڑکی اپنے بھائی سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ زخمی ہیں۔''

لیکن اس نے انکار کر دیا۔ تبھی لڑکا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری جان بچائی۔ آپ صرف ایک اور مہربانی کر دیں، اگر آپ کے لیے ممکن ہو۔''

''ہاں بتاؤ۔''

اس سے بات چیت کرنے کے دوران میں سرسری انداز میں قرب و جوار میں بھی نظریں دوڑا رہا تھا۔ ابھی تک راستہ کلیئر نہیں ہوا تھا۔ گاڑیاں ابھی بھی گزر رہی تھیں۔ میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن نہ جانے وہ لڑکا اب مجھ سے کیا چاہتا تھا میں اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''آپ نے دیکھا کہ میں زخمی ہوں اور اس حالت میں میرے لیے موٹر بائیک چلانا مشکل ہے۔'' اس نے جائزہ پیش کرنے کے بعد کہا۔ ''اگر آپ ہمیں ہمارے گھر تک چھوڑ دیں تو......''

میں سوچنے لگا کہ کیا میں ان کی مدد کروں؟ کیا میں انہیں ان کے گھر تک چھوڑ آؤں؟ مجھے تو ہاروے سے جلد از جلد ملنا تھا کیونکہ میرے پاس رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں کب تک سڑکوں پر بھٹکتا رہتا۔ رتن کمار کے ساتھی بھوکے کتوں کی طرح ہر طرف میری بو سونگھتے پھر رہے تھے لیکن وہ لڑکا مجھ سے مدد طلب کر رہا تھا اور کسی کی مدد کرنا ثواب کا کام تھا چنانچہ میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اگر آپ کے لیے ممکن نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔'' دفعتاً لڑکے کی آواز میری سماعت میں پڑی۔ میں سوچ کی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں تم دونوں کو تمہارے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں ہامی بھرتے ہوئے کہا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔

گاڑیوں کا رش کم ہو گیا تھا اور سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو چکے تھے۔ شاید کسی نے بھی پولیس کو کال نہیں کی تھی ورنہ پولیس اب تک وہاں پہنچ چکی ہوتی۔ سڑک کے کنارے ہی اس لڑکے کی موٹر بائیک کھڑی تھی۔ میں نے موٹر بائیک سنبھال لی۔ وہ لڑکا میرے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کی بہن اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

''مجھے راستہ بتاتے جانا۔'' میں نے کک مار کر موٹر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا گھر چور بازار کے پیچھے والی گلی میں ہے۔'' لڑکے نے جواباً کہا۔ ''آپ چور بازار مارکیٹ کے بارے میں تو جانتے ہی ہوں گے؟''

میں نے چور بازار کے بارے میں پڑھا ہوا تھا...... چور بازار تاریخی نوعیت کا تجارتی مرکز ہے۔ یہ بھنڈی بازار کے قریب مٹن اسٹریٹ پر واقع ہے۔ اس بازار کی عمر لگ بھگ ایک سو پچپن سال ہے۔ چور بازار صبح گیارہ بجے سے شام ساڑھے سات بجے تک کھلا رہتا ہے۔ جمعے کے دن نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے یہ بازار چند گھنٹوں کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ ہے۔ اس علاقے میں جیب کتروں کی بہتات ہوتی ہے۔ شروع میں اس کا نام ''شور بازار'' تھا کیونکہ یہاں شور بہت ہوتا تھا۔ چور بازار میں پرانی اور استعمال شدہ چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں ایک دکان ''مٹنی مارکیٹ'' کے نام سے مشہور ہے جہاں پر پرانی

ہندوستانی فلموں کے پوسٹر ملتے ہیں۔
ایک اور روایت کے مطابق آزادیِ ہند سے قبل ملکہ برطانیہ کی آمد پر اس کے استقبال کے لیے گیٹ وے آف انڈیا ممبئی کے ساحل پر تعمیر کیا گیا جہاں اس کا جہاز لنگر انداز ہوا۔ ملکہ کو جہاز سے فوری طور پر محل لے جایا گیا۔ محل غالباً آج کا ہوٹل تاج تھا جو گیٹ وے آف انڈیا کے روبرو قائم ہے۔

ملکہ کے ساتھ آئے ساز و سامان میں ایک وائلن بھی تھا۔ جب ملکہ نے سمندر کی پرشور لہروں پر ایک نغمہ چھیڑنے کی غرض سے وائلن طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ غائب ہے۔ گیٹ وے آف انڈیا سے محل کے درمیان میں وائلن غائب کر دیا گیا تھا۔

ملکہ برطانیہ کا وائلن چوری ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا علاقہ چھان مارنے کے بعد وہ وائلن موجودہ مولانا شوکت علی روڈ پر فروخت ہوتا ہوا پایا گیا۔ ملکہ کو وائلن کی بازیابی کی اطلاع ملی تو اس نے اس بازار کو تھیف مارکیٹ یعنی "چور بازار" کہہ کر پکارا۔

"ہاں جانتا تو ہوں لیکن راستہ ٹھیک سے یاد نہیں۔" میں نے توجیہہ پیش کی۔

"ٹھیک ہے، میں راستہ بتاتا جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں ممبئی کی سڑکوں پر موٹر بائیک دوڑاتا رہا اور وہ لڑکا جس نے اپنا نام جمیل بتایا تھا، راستہ بتاتا رہا۔ پون گھنٹے کے اندر اندر ہم چور بازار میں پہنچ گئے۔ وہاں اُس وقت بھی خاصہ رش تھا۔ فروش کی دکانوں کے علاوہ لوگوں نے ریڑھیاں بھی لگائی ہوئی تھیں پھر ہم چور بازار سے ہوتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔

وہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی دکھائی دیے جنہوں نے ماتھوں پر تلک لگایا ہوا تھا۔ میں نے جمیل کی رہنمائی میں کچھ دور جانے کے بعد ایک گھر کے دروازے کے سامنے موٹر بائیک روک دی۔ اس مکان کے ساتھ بھی کئی مکان بنے ہوئے تھے جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر تھے۔

دونوں بہن بھائی اتر گئے تو میں بھی نیچے اتر گیا۔ لڑکی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر بیل بجا دی تھی اور چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازہ کھولنے والا ایک بچہ تھا جس کی عمر غالباً دس بارہ سال تھی۔ لڑکی اندر چلی گئی اور بچہ وہیں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔

"اب مجھے اجازت؟" میں نے اجازت طلب نظروں سے جمیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی آپ کو ایسے کیسے جانے دوں گا۔" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آیئے میں آپ کو اپنی امی سے ملواتا ہوں۔ وہ آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔ ویسے آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میرا نام علی ہے۔" میں نے اپنا اصل نام ہی بتانا مناسب سمجھا کیونکہ وہ بھی تو مسلمان ہی تھا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آیئے، اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور چائے بھی پیتے ہیں۔"

میں وہاں سے جانا چاہتا تھا لیکن جمیل کے بے حد اصرار، خلوص اور محبت نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ اس نے موٹر بائیک پکڑی اور لڑکے سے کہا۔ "اختر، دروازہ کھولو۔"

اختر نے دروازہ کھولا تو وہ موٹر بائیک گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور ساتھ ہی اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ میں جھجکتا ہوا اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے والا پورشن تین کمروں، کچن، باتھ روم اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ دیواروں پر کئی جگہوں سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ کئی جگہوں سے سفیدی بھی اڑی ہوئی تھی۔ جمیل کی امی ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ ان کی آنکھوں پر نظر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ چہرہ چمکتا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے ان کے چہرے پر نور برس رہا ہو۔ ان کے ہاتھ میں ایک تسبیح تھی۔

میں مؤدبانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے ان کے سامنے جھکا تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے شفقت بھرے انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جمیل کی بہن رابعہ کچن میں چلی گئی تھی۔ مجھے وہاں ایسے محسوس ہوا جیسے میں اپنوں میں بیٹھا ہوں۔ اس لمحے مجھے اپنی امی اور بہنیں بھی شدت سے یاد آئیں اور میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ تبھی جمیل کی امی مستفسر ہوئیں۔ "بیٹا جمیل! تم نے اپنے دوست کا تعارف نہیں کرایا؟"

"امی جان!" جمیل نے پرسوچ لہجے میں جواب دیا پھر لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ "آج اگر یہ نہ ہوتے تو ان لڑکوں نے مجھے مار ہی ڈالنا تھا۔"

جمیل کی امی یک دم سے رہ گئیں۔ چہرے پر تفکرات کے سائے منڈلانے لگے۔ ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جمیل نے معتدل لہجے میں ساری بات بتا دی۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ رابعہ کالج میں پڑھتی تھی۔ جس کالج میں وہ پڑھتی تھی اسی کالج میں وہ تینوں لڑکے بھی پڑھتے ہیں وہ کافی دنوں سے رابعہ کو تنگ کر رہے تھے۔ رابعہ کے والد نے کئی بار ان تینوں لڑکوں کی پولیس میں بھی شکایت درج کرائی ہے لیکن پولیس ان کے خلاف ایکشن نہیں لے رہی۔ ان میں سے ایک لڑکے کا تعلق بدنام زمانہ ہندو تنظیم شیوسینا سے ہے اسی وجہ سے پولیس بے بس ہے۔ اس دن ان تینوں لڑکوں نے رابعہ کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور وہ اپنے پروگرام پر عمل درآمد بھی کر جاتے اگر جمیل مزاحمت نہ کرتا۔ جب جمیل نے مزاحمت کی اور رابعہ کو موٹر بائیک پر بٹھا کر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش رائیگاں گئی۔ ان تینوں لڑکوں نے جالیا اور پھر جمیل کو مارنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکے نے وہاں موجود سب لوگوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی بھی آگے بڑھا تو اسے کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس نے اپنا تعلق بھی بتایا تھا شاید اسی وجہ سے وہاں موجود کسی بھی شخص کو ہمت نہیں ہوئی تھی۔ سب تماشائی بنے جمیل کو پٹتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

جمیل کی امی تشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں پھر جب وہ بولیں تو ان کے لہجے میں ممنونیت کا عنصر نمایاں تھا۔ "بیٹا! یہ تمہارا ہم پر احسان ہے کہ تم نے میرے بیٹے اور بچی کی جان غنڈوں سے بچائی۔ یہ موئے ہندوؤں نے مسلمانوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ آئے روز کسی نہ کسی بہانے سے مسلمانوں پر تشدد کیا جا رہا ہے اور سرکار۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئیں پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "سرکار تو ان راکھشسوں سے پوچھتی تک نہیں۔ اس نے ان غنڈوں، موالیوں کو کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ مجھے تو بہت فکر ہو رہی ہے۔"

"اماں جی، آپ فکر مت کریں اللہ بہتر کرے گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر سرکار ان غنڈوں کے خلاف ایکشن نہیں لیتی تو کوئی بات نہیں، اللہ تو ہے نا، وہی ان سے حساب لے گا۔"

"ہم نے ہر فورم پر ان موالیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔" جمیل کی امی اپنی جھونک میں بولتی جا رہی تھیں۔ "ہر دروازہ کھٹکھٹایا ہے جہاں سے انصاف کی توقع تھی لیکن کسی نے بھی ہماری نہیں سنی۔ ہندو تو ذرا ذرا سی بات پر کاٹ ڈالنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔"

اسی لمحے رابعہ چائے بنا کر لائی تو جمیل کی امی خاموش ہو گئیں۔ ہم سب وہیں بیٹھ کر چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران جمیل کی امی نے مجھ سے پوچھا۔ "علی بیٹا! یہ تو تم نے بتایا نہیں کہ تم کہاں رہتے ہو، والد کیا کرتے ہیں، تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

یہ سوالات میرے لیے پریشان کن تھے اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں کیا جواب دوں؟ چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد میں جمیل کی امی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بھی میری طرف ہی متوجہ تھیں۔ "اماں جی! میں ممبئی کا رہنے والا نہیں ہوں۔ جاب کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ والد نہیں ہیں، والدہ بیمار رہتی ہیں۔ ایک بہن اللہ کو پیاری ہو گئی ہے جبکہ دوسری گھر پر ہے۔"

"ممبئی میں کہاں رہتے ہو بیٹا!" جمیل کی امی نے استفسار کیا۔ "کیا یہاں کوئی رشتے دار وغیرہ رہتے ہیں؟"

"نہیں اماں جی۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر لمحاتی توقف کرنے کے بعد دوبارہ بولا۔ "ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ جیسے ہی کوئی جاب ملی تو مکان کرائے پر لے لوں گا۔"

"بیٹا! ہمارے مکان کا اوپر والا پورشن کرائے کے لیے خالی ہے۔" اماں جی نے خالی کپ میز پر رکھنے کے بعد کہا۔ "اگر تم چاہو تو کرائے پر لے سکتے ہو، میں تم سے مناسب کرایا لوں گی۔"

"ٹھیک ہے اماں جی۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد کہا۔ "میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

"ارے بیٹا، اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟" جمیل کی امی نے کہا۔ "میرے گھر کے اوپری پورشن کو کرائے پر حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگوں نے کہا ہے لیکن میرا دل نہیں مانا اس لیے میں نے کسی کو نہیں دیا۔ تم شریف اور خاندانی ہو، سب سے بڑھ کر مسلمان ہو، اس لیے تم سے بات کی۔ اگر تمہارا دل مطمئن نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں بھی زور نہیں لگاؤں گی۔"

جواباً میں نے خاموشی اختیار رکھی۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں جمیل کی امی کی یہ پیش کش قبول کر لوں یا نہیں؟ ویسے ایک پہلو سے میں نے سوچا تو مجھے وہ پورشن محفوظ ٹھکانہ دکھائی دی۔ میں یہاں رہ کر رتن کمار کے خلاف کام کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہاروے سے کب رابطہ ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں، اسی لیے میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔

جمیل کی امی میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے میرے

چہرے پر ابھرنے والے اتار چڑھاؤ کو نوٹ کر رہی ہوں۔ تاہم میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے اماں جی، مجھے آپ کی پیش کش قبول ہے۔"

جمیل کی امی نے یوں گہری سانس لی جیسے ان کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ انہوں نے کہا۔ "تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے بیٹے۔"

"اماں جی! کرایا کتنا ہوگا؟" میں نے کرائے کی بابت پوچھنا مناسب سمجھا۔ ہاروے کے ٹھکانے پر الماری سے مجھے جتنی کرنسی ملی تھی وہ میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اگر میں کسی ہوٹل میں بھی رہنا چاہتا تو کم سے کم چار پانچ مہینے تو بہ آسانی گزارے جا سکتے تھے۔ جمیل کی امی نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔

"بیٹے! تم نے میرے بیٹے کی جان بدمعاش ہندوؤں سے بچائی ہے اور یہ ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ ابھی چونکہ تمہاری کوئی جاب نہیں لگی اس لیے میں تم سے کرایا وصول نہیں کروں گی، ہاں جب تمہاری جاب لگ جائے گی تو پھر تمہیں جو مناسب لگے کرایا دے دینا۔ بس میں چاہتی ہوں کہ میرے مکان کا اوپر والا پورشن آباد ہو جائے۔ پچھلے دنوں ایک خاندان پورشن کرائے پر حاصل کرنے کی خاطر آیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے اماں جی۔" میں نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے، شرط زیادہ مشکل نہیں ہے، بس میری التجا ہے کہ آپ نے ماننی ہے۔"

"بیٹا! تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔" اماں جی متذبذب ہو کر بولیں۔ "اچھا بتاؤ کیا شرط ہے؟"

میں نے جیب سے پانچ ہزار کے لگ بھگ رقم نکال کر اماں جی کی طرف بڑھائے تو انہوں نے حیرت سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے بیٹا؟"

"اماں جی! یہ کچھ پیسے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ یہ رکھ لیں کیونکہ میرے کھانے پینے کے سامان کے لیے بھی تو آپ کو پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔"

"لیکن بیٹا......"

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اماں جی، براہ کرم انکار نہ کریں۔ میں جس دوست کے پاس رہتا تھا اسے بھی تو پیسے دیتا تھا۔ اگر آپ کو پیسے دے رہا ہوں تو اس میں انکار والی کوئی بات نہیں بنتی۔ پلیز رکھ لیں۔" میرا انداز التجائیہ تھا۔

اماں جی نے تذبذب کے عالم میں رقم لے لی۔ جمیل اور رابعہ خاموش تھے۔ اماں جی نے مجھے دعا دی۔ "اللہ تمہیں خوش رکھے۔" میں نے دل میں آمین کہا۔

جمیل مجھے اوپر والا پورشن دکھانے کے لیے لے گیا تھا۔ اس کی بھی ویسی ہی حالت تھی جیسے نیچے والے پورشن کی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ پلستر اکھڑا ہوا تھا، فرش بھی کئی جگہوں سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ ایک کھڑکی کی جالی غائب تھی۔ بہرکیف وہ استعمال کے قابل تھا۔ باہر جانے کے لیے سیڑھی پر دو دروازے تھے۔ ایک باہر کی طرف کھلتا تھا دوسرا گھر کے اندر۔

جمیل نے بتایا تھا کہ اس کے والد کی چور بازار مارکیٹ میں عطر کی دکان ہے۔ ان کی دکان کے ساتھ ہی ایک ہندو کی بھی عطر کی دکان ہے۔ ہندو لوگ اس کے والد سے عطر نہیں خریدتے تھے بلکہ ہندو کی دکان پر چلے جاتے ہیں۔ مجھے انڈیا میں بسنے والے مسلمانوں کی حالت زار کا علم تھا اور جب میں مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوتے دیکھتا یا پڑھتا تھا تو دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ ان بدمعاش ہندوؤں پر غصہ بھی بہت آتا تھا جو مسلمانوں کو مختلف بہانوں سے تشدد کا نشانہ بناتے تھے۔ کبھی گاؤ ماتا کے نام پر، کبھی ہندوستان میں رہنے کی پاداش میں، کبھی مسلمان ہونے پر۔ گو جس علاقے میں جمیل رہتا تھا وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ علاوہ ازیں وہاں غربت اور پس ماندگی بہت زیادہ تھی۔ نزدیک ہی انتہا پسند ہندو بھی رہتے تھے جو ذرا سی بات پر خون خرابے پر اتر آتے تھے۔ جمیل نے بتایا تھا کہ اس نے نوکری کے لیے ہر محکمے میں اپلائی کیا تھا لیکن مسلمانوں پر نوکریوں کے دروازے بند ہیں۔ ہر محکمے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ تبھی وہ بے روزگار ہے۔ اس کے والد کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ اسے کوئی کاروبار کھلوا کر دے سکیں۔ ان کا اپنا کاروبار متعصب ہندوؤں کی وجہ سے مندے کا شکار تھا۔ وہ بڑی مشکل سے گھر کے اخراجات پورے کر رہے تھے۔ شکر کی بات یہ تھی کہ وہ گھر ان کا اپنا تھا۔

ہم کمرے میں آگئے جبکہ رابعہ اماں جی کے کہنے پر اوپر والے پورشن میں صفائی کرنے چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد پورشن رہنے کے قابل ہو گیا تھا اور میں وہاں شفٹ ہو گیا۔ میرے لیے یہ خوش آئند بات تھی کہ وہ مسلمان گھرانا تھا۔ یہاں میں سکون سے رہ سکتا تھا۔ مجھے نیند آ رہی تھی اس لیے میں نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور بیڈروم میں جا کر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

چھت پر پرانے زمانے کا ایک زنگ آلود پنکھا تھا جس کے چلنے کی آواز سے کمرے کی فضا مرتعش ہو رہی تھی۔ اسپیڈ بھی زیادہ تیز نہ تھی بہرحال غریب آدمی کے لیے تو ایسے پنکھے بھی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔

جب میں بیدار ہوا تو شام کا بوجھل اندھیرا رات کے گہرے دھندلے میں ڈھل رہا تھا۔ گزشتہ رات کی تکان چند گھنٹوں کی نیند کے باعث اتر چکی تھی۔ میں نے ایک لمبی انگڑائی لی اور پھر واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہونے کے بعد میں نے کھڑکی کھول دی۔ اس کھڑکی سے سامنے والے گھر کا فرنٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ سامنے والا گھر بھی دو منزلہ تھا اور گلی کی طرف ایک کھڑکی بھی تھی جو بند تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے آہٹ سنائی دی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ رابعہ تھی۔ اسے وہاں دیکھ کر میں چونکا۔ اس نے کہا۔ "آ جائیں، کھانا لگ گیا ہے۔ ابو بھی آ گئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تم چلو، میں آتا ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد میں نیچے پہنچ گیا۔ برآمدے میں چٹائی کے اوپر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور دسترخوان کے چاروں طرف گھر کے مکین بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں جمیل کے والد بھی شامل تھے۔

اُن کا نام شرافت علی تھا۔ وہ اپنے نام کی طرح ہی انتہائی شریف اور رحم دل دکھائی دیتے تھے۔ چہرے پر سنت نبوی تھی۔ وہ ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان ایک صحت مند اور دراز قامت انسان تھے۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ شاید اماں جی نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے انہوں نے بھی شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنوں میں موجود ہوں۔

ہم نے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا۔ چونکہ میں رات سے بھوکا تھا اس لیے میں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد میں، جمیل اور اس کے والدین کے ساتھ رات دس بجے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ رابعہ اپنے کمرے میں تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اماں جی بھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ انہیں نیند آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ تہجد کے وقت اٹھتی ہیں، تہجد اور فجر پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سوتی ہیں۔ شرافت صاحب نے بھی اپنی دکان کے بارے میں وہی کچھ بتایا تھا جو مجھے جمیل پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ کوئی عطر کا کاروبار ختم کر کے کوئی اور کاروبار کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ میں نے استفسار کیا۔ "نئے کاروبار کے حوالے سے آپ کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟"

"سوچ رہا ہوں کہ پرچون کی دکان کھول لوں۔" انہوں نے اپنا ارادہ بتایا۔

"ابو! آپ جو بھی کام کرلیں، متعصب ہندو پھر بھی آپ کی دکان سے سامان نہیں خریدیں گے۔" جمیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "بلکہ وہ دوسروں کو بھی اکسائیں گے کہ آپ کی دکان سے سودا سلف نہ خریدیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو برخوردار۔" شرافت صاحب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور گہری سانس بھری۔ لمحاتی توقف کے بعد انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "پھر آخر ایسا کیا کام کروں کہ کاروبار میں ترقی ہو اور گھر بھی چلتا رہے۔ جمیل بھی نوکری کی تلاش میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ ایسا کوئی محکمہ نہیں جہاں جمیل نے اپلائی نہ کیا ہو بس دل پر پتھر رکھ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اچھا خیر، میں چلتا ہوں اس حوالے سے بعد میں ڈسکس کریں گے مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔"

ایک دن میں، میں ان سب سے یوں بے تکلف ہو گیا تھا جیسے میں بھی اس گھر کا فرد ہوں یا وہ لوگ میرے اپنے ہوں۔ بہرکیف میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے شرافت علی صاحب اور ان کی فیملی سے ملوا دیا تھا لیکن میں نے قصد کر لیا تھا کہ میں ان کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شرافت صاحب کے جانے کے بعد ہم باتیں کرنے لگے۔ جمیل نے بتایا کہ اس نے چودہ جماعتیں پاس کی ہوئی ہیں اور وہ بھی کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے لیکن کافی عرصہ گزرنے کے باوجود اسے نوکری نہیں مل رہی۔ اس نے چند روز پہلے ہی ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کے لیے سی وی جمع کرائی ہے اور اسے اُمید تھی کہ اس کمپنی میں اس کی جاب لگ جائے گی۔ چونکہ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا اس لیے نیند تو میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی البتہ جمیل کی شکل سے لگتا تھا کہ اسے نیند آ رہی ہے۔ اس نے جب جماہی لی تو میں نے کہا۔ "جمیل! اب مجھے چلنا چاہیے۔ رات کافی ہو گئی ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جمیل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں نے مصافحہ کیا اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے پورشن میں چلا گیا۔ حبس زدہ موسم میں کمرے میں سونا میرے لیے ناقابل برداشت تھا اس لیے میں نے ایک چارپائی اٹھائی اور صحن میں بچھا دی۔ بستر بچھانے اور تکیہ رکھنے کے بعد میں بھی لیٹ گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا اور چاند بھی اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ کہیں کہیں بادل کے آوارہ ٹکڑے آوارہ گردی کرنے میں مصروف تھے۔

میں کافی دیر بستر پر لیٹا رہا تھا لیکن نیند کی دیوی مہربان نہ ہوئی تو میں نے بالآخر اٹھ کر صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ یکایک مجھے رامو کے سیل فون کا خیال آیا تو میں نے جیب سے نکال کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سا بٹنوں والا موبائل تھا۔ رامو کی تلاش جاری ہوگی۔ مجھے یقین ہے دیپک کے ساتھی ہاروے کی عمارت تک نہیں پہنچ سکے ہوں گے۔ بالفرض محال اگر وہ پہنچ بھی گئے ہوں گے تو وہ تہ خانہ کسی صورت بھی تلاش نہیں کر سکے ہوں گے اور بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے ہوں گے۔

میں نے سیل فون تکیے کے نیچے رکھا اور ٹہلنے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لیے لائحہ عمل سوچنے لگا۔ یہ بھی خیال دامن گیر تھا کہ ممکن ہے، دیپک نے ہاروے کے اس ٹھکانے پر جہاں اینڈرسن اور اس کی فیملی رہائش پذیر تھی، پر بھی "چھاپہ" مارا ہو اور میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ اس ٹھکانے کے بارے میں ہاروے کا منیجر موہن جانتا تھا۔ اس نے یقیناً رتن کمار کو ہی بتایا تھا تبھی اس نے مجھے جال میں پھانسا تھا۔ ایک لحاظ سے میرا اینڈرسن کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

دفعتاً میری نظر سامنے والے گھر پر پڑی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اندر لائٹ روشن تھی اور میں نے غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے منڈیر سے جھانکا۔ سامنے ہی ایک لڑکی میز پر کتاب کھولے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں قلم تھا جسے وہ انگلیوں کے درمیان گھما رہی تھی۔ اس کے دائیں طرف لیپ ٹاپ اوپن تھا لیکن اس کی ساری توجہ کتاب کی طرف تھی۔

وہ بائیس، تئیس سالہ لڑکی تھی۔ رنگت خاصی گوری تھی۔ اس نے سر کے بالوں کو دو چٹیوں میں باندھا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ وہ ایسے انہماک سے پڑھائی میں مصروف تھی کہ جیسے اس نے پوری کتاب کا ایک ایک لفظ ذہن میں بٹھانا تھا۔ کہتے ہیں کہ عورت کی حس بہت تیز ہوتی ہے اگر کوئی اسے دیکھ رہا ہوتا ہے تو اسے محسوس ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس لڑکی کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ تبھی اس نے نظر اٹھا کر بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

معلوم نہیں وہ لڑکی اٹھ کر کھڑکی پر آئی تھی یا نہیں، اس نے مجھے دیکھا بھی تھا یا نہیں لیکن میں دوبارہ اس غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ مجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں دم سادھے لیٹا رہا اور خود کو ملامت کرتا رہا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ٹھنڈی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا چلنے لگی۔ موسم کافی سہانا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے کچھ ٹکڑے موجود تھے جو آوارہ گردیاں کرتے پھر رہے تھے۔ مجھے کب نیند آ گئی پتا ہی نہ چلا البتہ صبح جب بیدار ہوا تو آسمان پر کالی گھٹاؤں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چلنے والی ہوا نے موسم سہانا کر دیا تھا۔ آسمان پر بجلی بھی چمک رہی تھی اور کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔

میں نے چارپائی اندر کمرے میں رکھی ہی تھی کہ جمیل آ گیا۔ شاید وہ مجھے جگانے آیا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ "ناشتا تیار ہے۔ آ جائیں۔"

"تم چلو، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہونے اور بعد ازاں ناشتا کرنے کے بعد میں جمیل کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شرافت صاحب تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی دکان پر چلے گئے تھے۔ میں اور جمیل چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے کہ دفعتاً بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" جمیل نے کہنے کے بعد کپ میز پر رکھا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے ایک لڑکی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کا گھر سامنے والا تھا اور وہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے خدشہ ہوا کہ شاید وہ میری شکایت لگانے آئی ہے۔ تاہم میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ دونوں برآمدے میں آئے تو جمیل نے

وی سے کہا۔ "رابعہ بیٹا! کمرے میں سے قلم لا دو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی تاہم میں نے اس کی طرف دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ رابعہ کے کمرے میں چلی گئی تو میں نے جمیل سے استفسار کیا۔ "کون ہے یہ لڑکی؟"

"سامنے والے گھر میں رہتی ہے۔" جمیل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "رابعہ کی گہری سہیلی ہے۔ اس سے ملنے آتی رہتی ہے۔"

میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ چائے پینے کے بعد میں اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ میں جتنی دیر برآمدے میں بیٹھا رہا تھا وہ لڑکی رابعہ کے کمرے میں تھی۔ کب گئی تھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ موسم بے حد شاداب تھا اس لیے میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میرا ارادہ اینڈرسن کے پاس جانے کا تھا تاکہ اس سے ہاروے کا نمبر لے کر ہاروے سے بات کر سکوں۔ معلوم نہیں اسے دیپک کی موت کی خبر ملی بھی تھی یا نہیں۔

میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں جس مقصد کے لیے انڈیا آیا تھا وہ جلد از جلد مکمل کر کے واپس پاکستان جانا چاہتا تھا۔ میں رتن کمار کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ رتن کمار کا نام سے جاننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کے ساتھی مجھے پورے ممبئی میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے لیکن میں مطمئن تھا کہ وہ کسی صورت مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے کیونکہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں جمیل کے گھر کا اوپر والا پورشن کرائے پر حاصل کر کے رہ رہا ہوں گا۔

میں کمرے میں کرسی پر بیٹھا اسی سوچ و بچار میں تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر بھی آ رہے تھے۔ بادل زور سے گرجے اور لمحہ بھر کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں اٹھ کر کھڑکی پر چلا گیا اور بوندا باندی دیکھنے لگا۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر بارش کے چھینٹے میرے چہرے پر بھی پڑ رہے تھے۔ میرا دل کیا کہ میں بھی شرٹ اتار کر بارش میں نہاؤں لیکن میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ تبھی جمیل آ گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پکوڑوں سے بھری پلیٹ اور بائیں ہاتھ میں چائے سے بھرا کپ تھا۔

"لیں علی بھائی، مزے کریں۔" اس نے پلیٹ اور کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ جمیل جانے کے لیے مڑا تو میں نے اسے آواز دی۔ "بات سنو جمیل۔"

اس نے پلٹ کر استفسار کیا۔ "جی علی بھائی۔"

"مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔" میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی ایک گرما گرم پکوڑا بھی اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ "کیا تم میرے ساتھ چل سکتے ہو؟"

"ہاں ضرور بھائی۔" جمیل نے جواباً کہا۔ "کب جانا ہے؟ ابھی تو بارش ہو رہی ہے۔"

"بارش رک جائے پھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ جمیل چلا گیا اور میں کرسی پر بیٹھ کر پکوڑے اور چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

بارش رکنے کی بجائے مسلسل برس رہی تھی اور بالآخر دن بارہ بجے کے قریب بارش کا سلسلہ موقوف ہو گیا لیکن آسمان پر گہرے سیاہ بادل بدستور موجود تھے۔ یہی لگ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد بارش نے پھر برسنا شروع کر دینا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس موسم میں باہر نکلوں یا ابھی انتظار کروں؟ سڑکوں پر پانی تالاب کی صورت میں موجود ہوگا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے بالآخر کل پر ٹال دیا اور جمیل کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے جواباً "ٹھیک ہے بھائی، جیسا آپ چاہیں" کہا تھا۔

☆☆☆

اس رات بھی بارش صبح تک وقفے وقفے سے ہوتی رہی تھی۔ موسم میں بھی خاصی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جب صبح بیدار ہوا تو بارش رک گئی تھی اور آسمان بھی قدرے صاف تھا۔ میں جب تیار ہو کر نیچے آیا تو اماں جی کے ذریعے یہ خبر سننے کو ملی کہ جمیل کو رات سے بخار ہے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ بستر پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ رابعہ چادر درست کرتی باہر جا رہی تھی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے میرے بھائی کو؟" میں نے بستر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بس ہلکا سا بخار ہو گیا ہے۔" جمیل نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی نقاہت تھی۔

"ڈاکٹر کے پاس گئے؟"

"نہیں بھائی۔" جمیل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میڈیسن کھائی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے جواباً کہا۔

"بھائی! آپ کو ایک بات بتانی تھی۔" جمیل نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا تو میں نے بے اختیار چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"کل سامنے والے گھر کی لڑکی آئی تھی نا؟"

"ہاں۔" اس کے ذکر پر میں چوکنا ہو گیا۔ یقیناً وہ میرے بارے میں شکایت کرتی ہوگی۔ میں نے سوچا۔

"وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔" جمیل نے بتایا۔

"کیا پوچھ رہی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"یہی کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔" جمیل نے گہری سانس بھر کر کہا۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔ "رابعہ نے اس سے کہا کہ آپ ہمارے دور کے رشتے دار ہیں اور نوکری کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔"

میں نے بھی گہری سانس بھری۔ صد شکر کہ اس نے تاک جھانک کی شکایت نہیں کی تھی۔ ورنہ میں اپنی نظروں میں خود ہی گر جاتا۔ بہرکیف میں نے جمیل سے پوچھا۔ "کیا مجھے تھوڑی دیر کے لیے موٹر بائیک مل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔" جمیل نے کہا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی چابی فوراً میرے حوالے کردی۔

میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد استفسار کیا۔ "مجھے چیتن جی روڈ پر جانا ہے۔ کیا تم میری رہنمائی کرسکتے ہو؟"

جمیل نے کاغذ پر باقاعدہ ایک نقشہ بنا کر مجھے چیتن جی روڈ کے بارے میں سمجھایا اور میں نے سارے مدو ذہن نشین کرلیے۔ بہرحال، مقدم کے طور پر میں نے اس نے کاغذ پر بنا نقشہ اپنی جیب میں رکھ لیا تاکہ اگر مشکل پیش آئے تو اس نقشے کی مدد حاصل کرسکوں۔

میں کمرے سے نکل گیا۔ بائیک صحن میں کھڑی تھی۔ میں نے جاتے میں کمرے کی رابعہ کو دروازہ بند کرنے کا کہا اور خود موٹر بائیک لے کر باہر نکل گیا۔ ہیلمٹ پہننے کے سبب کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔

کسی کسی گلی میں بارش کا پانی موجود تھا اور کم سن بچے اس گندے پانی میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ان بچوں کو کوئی بھی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا کہ اس گندے پانی سے وہ بیمار پڑ سکتے ہیں۔ میرے اپنے ملک کے بھی لوگوں کا یہی حال تھا۔ بارش سے گلیوں اور سڑکوں پر جو پانی جمع ہوجاتا تھا بچے اس میں خوب نہاتے تھے۔

آبادی سے نکل کر میں مین روڈ پر پہنچا اور پھر ایک سمت کا انتخاب کرکے موٹر بائیک دوڑادی۔ کئی سڑکوں پر بارش کا پانی موجود تھا۔ میں موٹر بائیک لے کر آگے بڑھتا رہا۔ خدشہ تو تھا کہ پلگ میں پانی جانے کے سبب موٹر بائیک بند ہوسکتی ہے اور پھر ہوا بھی وہی تھا۔

جیسے ہی میں پانی سے نکل کر صاف روڈ پر پہنچا تو موٹر بائیک نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ میں نے کک پر کک ماری لیکن موٹر بائیک نے اسٹارٹ ہونا تھا نہ ہوا۔ میں نے قرب و جوار میں دیکھا کہ شاید کسی مکینک کی دکان موجود ہو۔ وہاں جتنی بھی دکانیں تھیں ان میں موٹر بائیک مکینک کی دکان نہیں تھی۔ بادل نخواستہ مجھے واپس جانا پڑا۔ آسمان پر بادلوں نے پھر ڈیرا جمانا شروع کردیا تھا اور بارش کا بھرپور امکان تھا لہٰذا میں نے تیز تیز چلنا شروع کردیا تاکہ بارش کے شروع ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ میں نے ہیلمٹ نہیں اتارا تھا۔ رتن کمار کے ساتھیوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ میرے آس پاس ہی موجود ہوں۔ احتیاط لازمی تھی اس لیے میں احتیاط کررہا تھا۔

ایک بار پھر میں انہی راستوں سے گزر رہا تھا۔ پانی میں موٹر بائیک کھینچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ میرے علاوہ اور بھی کئی لوگ ایسے تھے جن کی موٹر بائیکس پانی کی وجہ سے بند ہوگئی تھیں اور وہ انہیں کھینچتے ہوئے لے جارہے تھے۔ بہرکیف ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں جمیل کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی تو جمیل کے چھوٹے بھائی اختر نے دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور ساتھ ہی ایک سائیڈ پر ہوگیا تو میں سلام کا جواب دیتے ہوئے موٹر بائیک کھینچتا ہوا اندر داخل ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ گھر میں ہو کا عالم طاری تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھر کے مکین موجود نہ ہوں۔ میں نے ہیلمٹ اتارا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اختر سے استفسار کیا۔ "کیا جمیل گھر میں موجود نہیں ہے؟"

"بھائی جان اپنے کمرے میں ہیں۔" اختر نے جواباً کہا۔ "اماں اور باجی ساتھ والے ہمسائے کے گھر گئے ہیں۔ انہیں گئے ہوئے دیر ہوگئی ہے۔"

میں نے جواباً سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ اسی لمحے جمیل بھی اپنے کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ "علی بھائی! کام ہوگیا؟"

"نہیں جمیل۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "راستے میں بہت پانی تھا۔ راستے میں موٹر بائیک بند ہوگئی تھی۔ جب کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہیں ہوئی تو میں واپس آگیا۔"

"اوہ، آپ کا تو لباس بھی بھیگ گیا ہے۔" جمیل نے میرے لباس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھہریں، میں اپنا ایک سوٹ لاتا ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے لباس پر نظر ڈالی تو واقعی میرا لباس خراب ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج شام کو میں اپنے لیے ایک سوٹ بھی خریدلوں گا۔ کچھ دیر کے بعد جمیل آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ تھا۔ میں نے سوٹ لے کر شکریہ ادا کیا اور اپنے اوپر والے پورشن میں چلا گیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں خود کو بے حد پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ چونکہ جمیل قد و قامت میں میرے قد کے برابر ہی تھا اس لیے اس کا لباس مجھے فٹ آیا تھا۔ میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو میری شیو اور سر کے بال کافی بڑھے ہوئے تھے۔ رنگت بھی قدرے سانولی ہو رہی تھی۔

میں کمرے میں آکر بستر پر نیم دراز ہوا اور ایک بار پھر میری ذہنی رو رتن کمار کی طرف بھٹک گئی۔ مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب میں اس کا خانہ خراب کروں گا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی روح بلبلاتی رہے گی۔ دفعتاً بادل زور سے گرجے تو میں رتن کمار کے خیالوں سے باہر نکل آیا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی اور خنکی بڑھ رہی تھی۔ جمیل اور اس کے گھر والے میرے لیے کسی نعمت سے کم ثابت نہیں ہوئے تھے۔ میں سوچتا ہوں اگر جمیل اور اس کی بہن رابعہ مجھے نہ ملتے تو نہ جانے میں اس خراب موسم میں کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ ہوٹل میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رتن کمار کے ساتھی یقیناً میری تلاش میں ہوٹلوں کی خاک چھان رہے ہوں گے۔ میں جمیل کے گھر میں خود کو محفوظ تصور کررہا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد بوندا باندی نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کرلی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جمیل کی اماں اور بہن گھر واپس آگئی تھیں یا ابھی پڑوس میں ہی بیٹھی تھیں۔ میں نے اس بارے میں جاننا مناسب نہ سمجھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھائے۔ رابعہ میری چھوٹی بہن جیسی تھی۔ میں شانزے کے علاوہ اور کسی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ شانزے کا عکس میرے دماغ کے پردے پر ابھرا تو میرے منہ سے ایک آہ سی نکل گئی۔ میرا اسیل

اسپنسر کو رنگ برنگے کاغذ پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر رنگ کے کاغذ تھے۔ جن کے اس نے رائٹنگ پیڈز بنا رکھے تھے اور وہ اپنی یادداشتیں رنگین کاغذوں پر تحریر کیا کرتا۔ ایک بار وہ ایک ایسا گوند بنانے کی کوشش کررہا تھا جس سے چیزوں کو بہت مضبوطی کے ساتھ جوڑا جاسکے۔ اس کی میز پر نہ جانے کیسی کیسی اشیا پھیلی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ گوند بنانے کے مرحلے میں تھا۔ اس کی انگلیاں گوند سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس کیفیت میں اس کی انگلیاں قریب رکھے ہوئے رنگین کاغذوں سے مس ہوگئیں اور ان خوبصورت رنگین کاغذات پر گوند لگ گئی۔ اسے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا اور غصہ بھی آیا۔ کیونکہ وہ ان کاغذات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جب ان کاغذات کی طرف دھیان دیا تو گوند لگے ہوئے کاغذات آسانی سے الگ بھی ہوگئے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ان رنگین کاغذات کی پرچیاں بنائیں اور ان کے کناروں پر وہی گوند لگا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپکاتا چلا گیا۔ اور اس طرح جو ایجاد سامنے آئی وہ آپ کے سامنے ہے۔ جی ہاں اسے پوسٹ اٹ نوٹ کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشنری کی دکان پر مل جائے گی۔ رنگین کاغذات کی بے شمار پرچیاں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی۔

کسی کو اپنا فون نمبر یا کچھ اور لکھ کر دینا ہو تو ایک ایک پرچی الگ کرتے جائیں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ بظاہر معمولی سی ایجاد لیکن کتنی اہم ہے۔

مرسلہ: زاہد خان، دینہ

فون دیپک کے پاس تھا جس میں سب کے نمبر محفوظ تھے۔ بتا نہیں اس بدبخت دیپک نے میرے سیل فون کے ساتھ کیا کیا تھا۔ بہرحال مجھے رامو کے سیل فون کا خیال آیا تو میں نے تکیے کے نیچے دیکھا۔ تکیے کے نیچے سیل فون موجود نہیں تھا۔

پھر مجھے پریشانی نے گھیرا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں رات کو سویا تھا تو میں نے رامو کا سیل فون تکیے کے نیچے ہی رکھا تھا لیکن اب وہ تکیے کے نیچے سے غائب ہو چکا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رامو کا سیل فون کہاں چلا گیا تھا۔

کہیں کوئی میری غیر موجودگی میں تو نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا لیکن کمرے کے آثار ایسے دکھائی نہ دیتے تھے جس سے میں کسی نتیجے پر پہنچتا کہ کوئی یہاں آیا تھا۔ میں داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچتا رہا کہ اچانک مجھے اپنے لباس کا خیال آیا۔ میں نے جلدی سے اپنے لباس کی تلاشی لی تو پتلون کی جیب سے رامو کا سیل فون مل گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی کہ میں نے جمیل اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بدگمانی کی تھی۔

بستر پر نیم دراز ہو کر میں سیل فون کو دیکھنے لگا۔ شاید یہاں سے جاتے وقت میں نے سیل فون اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا اور گمان یہی تھا کہ تکیے کے نیچے ہی پڑا ہے۔ اگر رامو کی لاش برآمد نہیں کی گئی ہوگی تو اب تک تہ خانے میں اس کی لاش کی بدبو پھیل چکی ہوگی اور یقیناً بدبو آس پاس رہنے والوں کو عمارت کی طرف متوجہ کر رہی ہوگی۔

بارش مسلسل تیز ہو رہی تھی۔ ہر جگہ جل تھل ہی ہو چکا تھا۔ میں سیل فون کو دیکھنے میں محو تھا کہ اچانک مجھے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آہٹیں سنائی دیں تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور جمیل اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون تھا۔ میں نے مذاقاً کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ آج بھی موسم اچھا ہے تو میرے لیے پکوڑے اور چائے لے کر آئے ہوں گے۔"

جمیل کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔ "اگر آپ کہیں تو میں ابھی پکوڑے اور چائے بنوا دیتا ہوں۔" جمیل نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھیں بھائی! آپ کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہو چکی ہے اور ایک ہزار کے لگ بھگ لائکس بھی حاصل کر چکی ہے۔" جمیل نے سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اس سے سیل فون لیا اور اپنی ویڈیو دیکھنے لگا۔ اس ویڈیو میں، میں ان لڑکوں کی پٹائی کر رہا تھا جنہوں نے جمیل کو زدوکوب کیا تھا۔ کسی منچلے نے ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر وائرل کر دی تھی۔ اس ویڈیو میں میرا چہرہ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن پہچاننے والے مجھے پہچان بھی سکتے تھے۔ میں نے سر پر کیپ پہنی ہوئی تھی اور دوران فائٹنگ میرے سر سے کیپ کہیں اتر گئی تھی۔

جمیل کے لیے یہ خوشی لیکن میرے لیے تشویش کا باعث تھی۔ اس ویڈیو کے ذریعے دیپک اور اس کے ساتھی مجھ تک پہنچ سکتے تھے اس لیے ایک نئی پریشانی دامن گیر ہو گئی تھی تاہم میں نے خود پر قابو رکھا تھا اور اپنے چہرے پر ایسے تاثرات نہ لایا تھا جس سے جمیل کو شک پڑ جاتا اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا۔

"لوگ بہت تیز ہیں۔ جہاں کہیں کوئی واقعہ دیکھا فوراً ہی ویڈیو بنانا شروع کر دیتے ہیں۔" میں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں علی بھائی۔" جمیل نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ "لوگوں کو اور کوئی کام بھی نہیں ہے۔ اچھا خیر، میں چلتا ہوں اور آپ کے لیے پکوڑے اور چائے بنواتا ہوں۔ پھر مل بیٹھ کر کھائیں پئیں گے اور گپیں ہانکیں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی جمیل اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے سیل فون اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ ویڈیو کس نے دکھائی ہے؟"

"ساتھ والے پڑوس میں رابعہ کی سہیلی ہوتی ہے اسی نے بتایا تھا کہ ہم بہن بھائی کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہے۔" جمیل نے جواباً کہا۔ "چنانچہ رابعہ نے گھر آ کر ویڈیو سرچ کی تو سامنے آ گئی۔"

جمیل کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر تشویش میں گھر گیا۔ بے چینی مجھ پر غالب آ گئی تھی اور میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ گو وہ ویڈیو لوگوں کے لیے دلچسپی کے سامان سے بھرپور تھی لیکن میرے لیے خطرناک تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں میرے دشمن مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ ایسی صورت حال میں جمیل اور اس کے گھر والوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

رتن کمار، دیپک اور دیگر بدکار انسان کم جانور زیادہ تھے۔ وہ میری وجہ سے ان بے گناہ لوگوں پر بھی چڑھ دوڑنے۔ صرف ویڈیو دیکھنے کے بعد جمیل اور رابعہ کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ جو لڑکے رابعہ کو تنگ کرتے تھے ظاہری بات ہے وہ بھی جانتے ہوں گے کہ رابعہ کس کالج میں پڑھتی ہے۔ کسی نہ کسی ذریعے سے میرے دشمن رابعہ کے گھر کا ایڈریس کالج انتظامیہ سے حاصل کر سکتے تھے پھر انہیں جمیل کے گھر تک پہنچنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسی صورت حال میں کیا کروں؟ وقت کم تھا اور مجھے جلد سے جلد کچھ کرنا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد جمیل ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے آ گیا۔ ٹرے میں گرما گرم پکوڑوں سے بھری پلیٹ رکھی ہوئی تھی، ساتھ ہی چائے سے لبالب دو کپ بھی تھے جن میں سے ہلکی ہلکی بھاپ بھی اٹھ رہی تھی۔

جمیل نے ٹرے میز پر رکھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "آئیں علی بھائی!"

ہم دونوں پکوڑے کھانے اور چائے نوش کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ موضوع گفتگو وہی ویڈیو تھی۔ جس نے مجھے پریشانی میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ شاید یہ انسانی حس تھی کہ جمیل نے میری پریشانی بھانپ لی تھی۔ اس نے پُرغور نظروں سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ "علی بھائی! کیا کچھ ہوا ہے؟"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تاہم میں نے نارمل لہجے میں استفسار کیا۔ "نہیں، تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"میں نے نفسیات پر کافی مضامین پڑھے ہوئے ہیں اس لیے مجھے بھی انسان کی نفسیات کے متعلق معلومات ہیں۔ آپ کے چہرے کے تاثرات ایسے ہیں جیسے آپ اندر ہی اندر کچھ پریشان ہیں۔ شاید میرا اندازہ غلط بھی ہو لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انسان جب پریشان اور بے چین ہوتا ہے تو اس کے اندر کی بے چینی اور پریشانی کی ہلکی سی رمق چہرے پر ظاہر ہو جاتی ہے۔" جمیل نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا تو میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ارے نہیں یار، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، بس میں کچھ سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ مستفسر ہوا۔

"کچھ خاص نہیں۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "خیر چھوڑو یہ باتیں، اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"سب کچھ آپ کے سامنے ہے بھائی۔" جمیل ہلکا سا مسکرایا۔

"مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟"

"آپ کو بتایا تو تھا کہ سرکاری محکموں کے علاوہ اب ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کے لیے سی وی دی ہوئی ہے۔ شاید آپ بھول گئے ہیں۔" جمیل نے بتایا تو مجھے یاد آ گیا۔ مجھے اندر ہی اندر خفت ہوئی۔ تاہم میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں، تم نے بتایا تھا۔ سوری یار، میں بھول گیا تھا۔"

"آپ کی تعلیم کیا ہے اور کہاں جاب کے لیے اپلائی کیا ہے؟" جمیل کے پوچھنے پر میں نے کچھ سوچا اور لمحاتی توقف کے بعد جواباً کہا۔

"میں بھی چودہ جماعتیں پاس ہوں۔ اور تمہاری طرح نوکری تلاش کر رہا ہوں۔"

"ان شاء اللہ آپ کو بھی نوکری مل ہی جائے گی۔" جمیل نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بستر پر نیم دراز ہو کر گہری سوچوں میں گم ہو گیا۔ بارش مسلسل برس رہی تھی۔ تقریباً دن بارہ سوا بارہ بجے کا وقت تھا جب بارش کی رفتار ہلکی ہوئی تھی۔

مجھے وہاں رہتے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ بارش نے نظام زندگی اور کاروبار درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ شرافت صاحب بھی دو دن سے دکان پر نہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی دکان کے آگے بھی بارش کا پانی تالاب کی صورت میں جمع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے دکان تک جانے کا راستہ ہی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں قرب و جوار میں بھی ساری دکانیں بند تھیں۔

بارش کی وجہ سے میں بھی وہاں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے رتن کمار، دیپک اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میرے لیے ان کے بارے میں آگاہی بے حد ضروری تھی کیونکہ میں کسی چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنسنے کا متحمل نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کی بار اگر میں رتن کمار کے ہاتھ لگ گیا تو اس نے مجھے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی۔ امکان تو نہیں تھا کہ میرے دشمن جمیل کے گھر تک پہنچ سکیں گے لیکن پھر بھی تقاضائے وقت احتیاط ضروری تھی۔

میں ہر طرح سے محتاط تھا۔ جمیل کے ذریعے بھی اس ویڈیو کے حوالے سے سن گن لیتا رہتا تھا لیکن فی الوقت سب ٹھیک چل رہا تھا۔ کئی بار میں نے رامو کا سیل فون آن کرنے کا سوچا

تھا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیتا تھا۔ دماغ میں یہی بات ہوتی تھی کہ کہیں راٹھو کے سیل فون کی سگنل کے ذریعے لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو اور وہ بدبخت رتن کمار یہاں تک پہنچ جائے۔ میں خود اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے مکمل تیاری کی ضرورت تھی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کا ہوٹل بھی تھا لیکن میں اس کے ہوٹل نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے وہاں بھی یقیناً مجھے پھانسنے کے لیے جال بچھا رکھے ہوں گے اور میرے وہاں پہنچنے کا منتظر ہوگا۔

جس قماش کا انسان تھا علیٰ ہذا القیاس وہ اپنے ہوٹل میں کم کم ہی بیٹھتا ہوگا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو بھی ہو لیکن خوب صورت لڑکیوں کے حصول کے لیے وہ اپنے ملک سے دوسرے ممالک کے سفر کرتا رہتا تھا۔ کئی بار مجھے اس کی امریکا میں موجودگی کا علم ہوا تھا لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ وہ میرے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا ورنہ میں اسے تڑپا تڑپا کر جہنم میں پہنچا دیتا۔

میرے شب و روز اسی گھر میں گزرنے لگے۔ مجھے وقت پر ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا مل جاتا تھا۔ تیسرے روز جاکر بارش کا سلسلہ تھما تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ آہستہ آہستہ نظامِ زندگی اور کاروبارِ زندگی معمول پر آنے لگا۔ شرافت صاحب بھی دکان پر جانا شروع ہو گئے تھے۔ بارشوں کی وجہ سے جمیل اپنی موٹر بائیک درست نہیں کرا سکا تھا۔ گو اس نے خود ٹھیک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید پانی انجن میں چلا گیا تھا جس کی وجہ سے بائیک میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

میرے پاس دیال سنگھ کا نمبر تھا اور میں اسے کال کرکے بلانے کا سوچنے لگا۔ میں کافی دیر تک سربگریباں بیٹھا دیال سنگھ کے حوالے سے سوچتا رہا۔ بالآخر میں نے بلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر اعتبار کرنے کے لیے میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نے اکیلے ہی اینڈرسن کی رہائش گاہ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ کافی دنوں سے میں گھر میں محصور تھا اور گھر بیٹھ بیٹھ کر اکتا گیا تھا چنانچہ میں جمیل کو مطلع کرکے گھر سے نکلا اور مین سڑک کی طرف بڑھا۔ چور بازار میں پہنچا تو وہاں کافی گہما گہمی تھی۔ کچھ سڑکوں پر پانی موجود تھا اور لوگ اپنی مدد آپ کے تحت دکانوں کے سامنے جمع پانی نکالنے میں مصروف تھے۔

میں لوگوں پر سرسری نظر ڈالتا ہوا مین سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک آٹو رکشا موجود تھا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا کسی سواری کا منتظر تھا۔ ڈرائیور ایسے لوگ بے حد تیز طرار ہوتے ہیں۔ سواری کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ اس نے سفر کرنا ہے۔ میں جب رکشے کے قریب پہنچا تو ڈرائیور نے ہندی میں پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے سرکار؟“

میں نے ڈرائیور کا جائزہ لیا۔ اس کے ماتھے پہ سندور تھا۔ کرتہ اور لنگی میں پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ دائیں ہاتھ کی کلائی میں لوہے کا ایک کڑا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ میں نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”چیتن جی روڈ کی طرف چلو۔“

”جو حکم سرکار۔“ کہنے کے ساتھ ہی ڈرائیور نے آٹو رکشا اسٹارٹ کرنے کے بعد گردن باہر نکال کر عقب میں دیکھا کہ کہیں کوئی گاڑی وغیرہ تو نہیں آ رہی۔ ایک گاڑی آ رہی تھی جب وہ گزر گئی تو اس نے رکشا موڑا اور پھر بجلی کی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔ میں دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ آج کسی سڑک پر کوئی مسئلہ نہ ہو اور میں بخیر و عافیت چیتن جی روڈ پر پہنچ جاؤں۔

صد شکر کہ ڈرائیور نے چالیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد مجھے چیتن جی روڈ پر پہنچا دیا۔ میں نے اسے کرایا دیا اور پھر فٹ پاتھ پر چڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سر پر کیپ پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اینڈرسن کی کوٹھی کی تلاش تھی۔ میں کافی دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا لیکن مجھے اینڈرسن کی کوٹھی دکھائی نہ دی۔ شاید میں لوکیشن بھول گیا تھا۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ میری ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں لوکیشن بھول گیا تھا حالانکہ میری یادداشت بہت اچھی تھی۔

میں الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آتے جاتے لوگ مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالتے اور اپنے اپنے راستے ہو لیتے۔ مصلحتوں کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے واپس چلے جانا چاہیے البتہ میں کل دوبارہ آکر اینڈرسن کی کوٹھی تلاش کروں گا۔ میں نے آٹو رکشے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ دوسری سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ میں کچھ سوچ کر سڑک کراس کرکے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

ٹیکسی کے اندر ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ میں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دفعتاً میری نظر ٹیکسی کے ڈیش بورڈ پر پڑی۔ ڈیش بورڈ پر ایک قلم پڑا ہوا تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے یاد آ گیا کہ ایسا ہی قلم دیال سنگھ کے پاس بھی تھا جس سے اس نے مجھے اپنا نمبر لکھ کر دیا تھا۔ کیا یہ دیال سنگھ کی ٹیکسی

تھی، میں نے سوچا۔ میں نے ٹیکسی کے گرد گھوم کر دیکھا تو میرے منہ سے طویل سانس نکل گیا۔ وہ ٹیکسی سو فیصد دیال سنگھ کی تھی۔ میں نے قرب و جوار میں دیکھا تو سامنے ہی ایک گلی سے دیال سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں جھومتا ہوا آ رہا تھا۔

سڑک کراس کرکے جب اس نے ٹیکسی کے پاس کھڑے مجھے دیکھا تو وہ یوں رک گیا جیسے اس کے پیر زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں اور غیر یقینی لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”او سرکار، تسی وجود ہی ہو نا؟“ (او سرکار۔ آپ وجود ہی ہیں نا؟)

”دیال سنگھ! تم تو یوں ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے صدیوں بعد مجھ سے مل رہے ہو؟“ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہرّے۔“ اس نے پُرجوش انداز میں نعرہ لگایا اور آگے بڑھ کر والہانہ انداز میں مجھ سے چھپکلی کی مانند چمٹ گیا۔ اس کا انداز دیدنی تھا۔ وہ مجھ سے زبردستی گلے مل رہا تھا اور مجھے خاصی کوفت محسوس ہوئی تھی۔ تاہم مجھے بھی مجبوراً اس کی گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے ہی دینا پڑا۔

”بس کرو دیال سنگھ! کیا مجھے مارنے کا ارادہ ہے؟“ میں نے بالآخر تنگ آتے ہوئے کہا۔ بڑی ہی مشکل سے اس نے میری جان چھوڑی تھی۔ میری بات پر وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔

”سرکار! تسی اتنے دنوں سے کہاں تھے؟“ اس نے استفسار کیا۔ ”میں نے تسی کے فون کا بہت انتظار کیا تھا پر تسی نے فون ہی نہیں کیا۔ کم از کم مجھے اپنا نمبر ہی دے دیتے، میں خود ہی فون کر لیتا۔ مجھے تسی کی بہت چنتا تھی۔“

”میرا فون گر گیا تھا دیال سنگھ!“ میں نے بہانہ تراشا۔

”اوہو۔“ دیال سنگھ نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”سرکار! تسی کے پاس میرا نمبر تو ہے، تسی مجھے فون کر دیتے۔ میں تسی کو نیا فون لا دیتا۔ اچھا خیر ہے، مارکیٹ کھلنے والی ہیں، تسی میرے ساتھ چلو، میں تسی کو نیا فون دلا دیتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اسے روکا۔ ”جب ضرورت پڑی تو خرید لوں گا۔“

”ہیں......“ دیال سنگھ نے ہیں کو لمبا کھینچا۔ ”آج کے دور میں موبائل فون تے سب کی ضرورت بن گئی ہے۔ اس کے بغیر تو بندے کی دنیا ویران اور اندھیری ہے۔ تسی کو فون کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے سرکار۔ اچھا تسی ٹیکسی میں بیٹھو۔ باقی باتیں اندر بیٹھ کر کرتے ہیں۔“

ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ دیال سنگھ نے ٹیکسی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی تو میں نے پوچھا۔ ”دیال سنگھ! تم کہاں سے آ رہے تھے؟“

”ایک بوڑھی سواری تھی۔“ دیال سنگھ نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے کہا کہ میں اکیلی سڑک کراس نہیں کر سکتی اس لیے میں نے اسے سڑک بھی کراس کرائی اور اس کے گھر تک چھوڑ آیا۔“

پتا نہیں وہ مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ تاہم میں نے خود ہی پوچھ لیا۔ ”دیال سنگھ! مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟“

”رتن کمار کے پاس۔“ دیال سنگھ نے جواباً کہا تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میرے اعصاب بھی تن گئے اور دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ میں پُرغور نظروں سے دیال سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے بے ساختہ انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے ہی بولا۔

”سرکار! پریشان ہو گئے نا...... میں تسی کے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔ میرے مذاق پر ناراض نہ ہونا سرکار!“

اس کی بات پر میرے تنے ہوئے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس اپنے اندر اتار لی۔ دیال سنگھ کے مذاق نے حقیقتاً مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دیال سنگھ بدستور ہنس رہا تھا۔

”اتنا مت ہنسو دیال سنگھ، کہیں پیٹ میں بل ہی نہ پڑ جائیں۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ واقعی دیال سنگھ مجھ سے ایسے فرینک ہو گیا تھا جیسے ہم بچپن کے دوست ہوں اور ایک ساتھ پلے بڑھے ہوں۔

”پیٹ میں بل پڑ ہی گئے ہیں سرکار۔“ دیال سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ میں سے منرل واٹر کی بوتل نکالی اور ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ پانی بھی پی لیا۔ اس نے بوتل واپس ڈیش بورڈ میں رکھی اور مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”سرکار! ناراض تو نہیں ہوئے نا؟“

”نہیں دیال سنگھ۔“ میں نے بھی زیرلب مسکراتے

ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟"
"ہوٹل جا رہے ہیں سرکار۔"
"کیوں؟"
"سرکار! تسی کو بھوک لگی ہوگی ناشتا واشتا کھاتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور باتیں کریں گے۔" دیال سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہ جانے مجھے کیوں اس کی مسکراہٹ مکروہ لگی تھی اور میرے دل میں اس کے خلاف شک کا بیج بونا شروع ہوا۔
"نہیں دیال سنگھ۔ مجھے بھوک نہیں ہے، میں ناشتا کر چکا ہوں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اگلے چوک پر اتار دو۔"
"سرکار! میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔" دیال سنگھ نے اپنے حوالے سے توجیہہ پیش کی۔ "چلو تسی ناشتا نہ کرنا، چائے پی لینا۔"
میرے دل اور دماغ میں وسوسوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ دیال سنگھ مجھے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا اس کا والہانہ انداز مصنوعی تھا؟ میں نے سوچا۔ شاید دیال سنگھ نے میرے دماغ میں آئی باتیں میرے چہرے پر ابھرے تاثرات کے ذریعے پڑھ لی تھیں تبھی اس نے میری طرف دیکھ ایک نظر ڈالی اور جھینپتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "سرکار! کیا تسی کے دل میں میرے لیے شک ہے؟"
"نہیں تو۔ تم نے کیسے سوچ لیا؟" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواباً کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف سے کسی قسم کے شک میں مبتلا ہو۔
"بس مجھے ایسا لگا ہے۔" دیال سنگھ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اگر تسی کو مجھ پر شک ہے تو سرکار، تسی جتھے کہو گے میں تسی کو اتار دیتا ہوں۔ دیال سنگھ ہر چیز برداشت کر سکتا ہے پر اس پر کوئی شک کرے یہ برداشت نہیں ہوتا۔" وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں اور چہرے کے تاثرات نے مجھے الجھا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہے دیال سنگھ بھی ویسے ہی رنگ بدل رہا ہے۔
"ارے یار، تم تو جذباتی ہی ہو گئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں بھلا تم پر کیوں شک کروں گا؟ شک کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔"
"وجہ" اس نے زیرِ لب دوہرایا۔ "وجہ تو کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً رتن کمار۔ شاید تسی کا خیال ہے کہ میں رتن کمار کے لیے کام کرتا ہوں اور میں تسی کو دھوکا دے رہا ہوں۔ اب بتاؤ سرکار، میرے ساتھ ہوٹل چلتے ہو یا کہیں اتار دوں؟"
"دیکھو دیال سنگھ۔" میں بولا تو میرا لہجہ کافی سنجیدہ تھا۔ "مجھے تم پر تو کیا اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں۔ میں جس صورتِ حال سے گزر رہا ہوں شاید تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ رتن کمار کے ساتھی بھوکے کتوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی نقصان سے دوچار ہو۔"
"سرکار! پاکھنڈیوں کے خلاف کام کرنا تو اچھی بات ہے۔ تسی نے جب بتایا کہ رتن کمار پاپی اور پاکھنڈی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے نفرت ہی ہے۔ بہرحال اگر تسی کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ میری آشیرباد تسی کے ساتھ ہے۔"
اس کی جذباتی باتیں سننے کے باوجود نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ مصنوعی باتیں کر رہا ہے۔ شاید وہ مجھے اپنی باتوں سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے دل میں اس کی جذباتی باتیں سمانے کی جگہ نہیں تھی۔ میں جانتا تھا جب تک میرا وجود رتن کمار کے لیے باعثِ خطرہ ہے وہ چین سے بیٹھنے والا نہیں۔ اس کے کتے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور میں کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ بھی تھی۔ رتن کمار شاید بھول گیا تھا کہ آنے والے دن اس کے لیے یومِ مکافات بھی ہو سکتا تھا۔
دفعتاً دیال سنگھ کی جیب میں موجود اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی تو میری ذہنی رو رتن کمار سے بھٹک کر اس کی جیب میں بجنے والے سیل فون کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ سے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔ "کس کا فون ہے؟"
لمحاتی توقف کے بعد اس نے جیب سے سیل فون نکال کر اس کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ پھر ایک بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو سرکار۔" کہنے کے بعد وہ دوسری طرف سے کچھ سننے لگا۔ پھر وہ مختصر وقفے سے دوسری طرف سے سن کر جواب دینے لگا۔ "جی سرکار، حکم کرو...... میں قریب میں ہی ہوں...... تسی کہاں جانا ہے...... مورتی مندر...... ٹھیک ہے سرکار...... میں سواری کو رام چوک پر اتار

کر دس منٹ میں تسی کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"
"تسی" اس کی زبان پر چڑھا ہوا تھا اس لیے وہ بڑی روانی سے بول جاتا تھا۔ بات کرنے کے بعد اس نے سیل فون جیب میں رکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "سرکار! ایک پرانی سواری ہے جسے ہر منگل کو مورتی مندر چھوڑنا ہوتا ہے...... تسی ناراض نہیں ہونا سرکار۔"
"ارے نہیں دیال سنگھ، یہ تمہارے کمانے کا سمے ہے تو میں کیوں ناراض ہوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا تو دیال سنگھ بھی مسکرا دیا۔ پھر اس نے بتایا کہ اگلا چوک جس کا نام رام چوک ہے مجھے وہاں اتار دے گا۔ میں نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ہی اس نے مجھے ایک چوک پر اتار دیا اور کہا۔ "سرکار! گرو جی کی کرپا سے پھر ملیں گے۔"
"ضرور۔" میں نے جواباً کہا۔ پھر دیال سنگھ نے ٹیکسی دائیں طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑ دی۔ جب اس کی ٹیکسی ٹریفک کے اژدحام میں گم ہو گئی تو میں نے ایک آٹو رکشے کی طرف دیکھا جو سڑک کی دوسری طرف کھڑا تھا۔ میرے لیے یوں سڑکوں پر پھرنا مجھے کسی مشکل سے دوچار کر سکتا تھا اسی لیے میں ہر قسم کی احتیاط کر رہا تھا۔ میں نے ٹریفک سے بچ کر سڑک کراس کی اور آٹو رکشے کے پاس پہنچ گیا۔ ڈرائیور پان والی دکان سے شاید پان خریدنے گیا ہوا تھا۔ تبھی اس نے مجھے دور سے اشارہ کیا کہ میں آ رہا ہوں۔
میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آٹو رکشے میں بیٹھ گیا۔ دفعتاً میری نظر آٹو رکشے کے دائیں طرف والے بیک مرر پر پڑی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ مجھے دو شخص دکھائی دیے جو تلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میرے وجود میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑتی چلی گئیں۔ یہ وہی دو تھے جو میری تلاش میں دیال سنگھ کے پیچھے گئے تھے۔ وہ اسی طرف ہی آ رہے تھے جدھر میں آٹو رکشے میں موجود تھا۔ فوری طور پر میں یہ نتیجہ اخذ نہ کر سکا کہ کیا ان دونوں کو دیال سنگھ نے بلایا ہے یا یہ میری تلاش میں اُدھر آ نکلے ہیں؟
مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں جال میں پھنس گیا ہوں۔ آگے کھائی اور پیچھے کنواں تھا۔ اگر میں آٹو رکشے سے باہر نکلتا تو ان کی نظروں میں آ جاتا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دیال سنگھ غدار ہے۔ وہ مجھے باتوں میں لگا کر رام چوک کی طرف لایا تھا اور اسے جس نے فون کیا تھا اس نے کوڈ ورڈ میں اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ مجھے رام چوک پر اتار رہا ہے۔ شاید وہ دونوں منش وہاں پہلے سے موجود تھے یا قریب میں تھے کہ فوراً ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اگر انہوں نے مجھے آٹو رکشے میں سوار ہوتے دیکھا ہوتا تو وہ رکشے کی طرف ضرور آتے۔ میری نظریں بدستور بیک مرر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ رکشے سے تھوڑا آگے جانے کے بعد آس پاس میں پُرغور نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہاں بہت سے لوگ موجود تھے جن میں کچھ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے جبکہ کچھ وہاں کھڑے تھے۔ میں ان لوگوں کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل سکتا تھا لیکن فی الوقت وہ دونوں سامنے ہی کھڑے کانا پھوسی کر رہے تھے۔ مجھے دیال سنگھ پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ مجھے اس پر پہلے ہی شک تھا اب تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ رتن کمار کا نمک خوار تھا بھلا کیسے وہ اس سے غداری کر سکتا تھا۔ یقیناً اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ میرا نام علی ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔
میرے دل میں دیال سنگھ کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی جس نے میرے وجود کو خاکستر کر دیا۔ میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ میں نے قصد کر لیا تھا کہ اگر پھر کبھی اس سے ٹاکرا ہوا تو اسے غداری کا سبق ضرور سکھاؤں گا۔
کچھ ہی دیر میں آٹو رکشے کا ڈرائیور بھی آ گیا۔ اس کے منہ میں پان تھا۔ وہ پان یوں چبا رہا تھا جیسے بھینس جگالی کرتی ہے۔ آٹو رکشے کے قریب پہنچ کر اس نے منہ زمین کی طرف کر کے پان کی پیک پھینکی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
وہ ہندو تھا۔ اس کے ماتھے پر قشقا تھا۔ اس نے پاجامہ اور کرتہ زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ اس کی رنگت تانبے کی طرح تھی۔ اس نے سر میں تیل لگا کر بال سیٹ کیے ہوئے تھے۔ رکشے میں بیٹھتے ہی اس نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چھما (معافی) چاہتا ہوں مہاراج۔ آپ کو انتجار (انتظار) کرنا پڑی۔ پان والے کے پاس آج زیادہ رش تھا اس لیے دیر ہو گئی۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے رکشا بھی اسٹارٹ کر دیا۔ "کہاں چلو گے مہاراج؟"
ہندو لوگ اپنے سے بڑی ذات کے لوگوں کو مہاراج کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاید رکشے والے نے بھی مجھے کسی بڑی ہندو ذات کا سمجھ لیا تھا۔ میں نے جواباً کہا۔ "چور بازار کی طرف چلو۔"
"ٹھیک ہے جناب۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر منہ باہر نکال کر زمین پر پیک پھینکی اور رکشا آگے بڑھا دیا۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا، وہ کانا پھوسی کرنے

کے بعد ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ جب آٹو رکشا ان کے قریب سے گزرا تو میں نے فی الفور چہرے پر ہاتھ رکھ دیا اور تمسخر بھری نظروں سے ان کو دیکھا۔

"مجھے تلاش کرتے رہو بچو، میں تو گیا۔" میں نے دل ہی دل میں ان کا مضحکہ اڑایا۔ جب آٹو رکشا کافی دور چلا گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف نکل گیا تھا۔ اگر وہاں دیال سنگھ ہوتا تو پھر گڑبڑ ہو سکتی تھی اور میں ہر گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی میرا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا۔ اچانک ہی میری نظر بیک مرر پر پڑی تو میرا اطمینان غارت ہو گیا۔ وہ دونوں ایک موٹر بائیک پر سوار رکشے کے پیچھے آ رہے تھے۔ شاید ان میں سے کسی ایک نے مجھے دیکھ لیا تھا یا آٹو رکشے میں میری موجودگی کا شک ہو گیا تھا۔ بہرکیف میں چوکنا ہو گیا تھا۔

موٹر بائیک آٹو رکشے کے قریب آنے کی بجائے صرف تعاقب تک ہی محدود رہی تھی۔ شاید وہ اس انتظار میں تھے کہ رکشا کسی سنسان راستے سے گزرے اور وہ اسے رکوا کر کارروائی کر گزریں۔ میں کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ رکشا ڈرائیور کو تعاقب کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ ایسے لوگ تو بے حد چاق و چوبند ہوتے ہیں لیکن وہ ڈرائیور تو اپنی دنیا میں مست جگالی کرنے میں مگن تھا۔ میری نظریں موٹر بائیک پر جمی ہوئی تھیں۔ رکشا ڈرائیور مختلف سڑکوں سے رکشا گزارتا آگے بڑھائے چلا جا رہا تھا اور ہمیں سفر کرتے ہوئے بیس منٹ ہونے والے تھے۔ رکشا جس سڑک کی طرف مڑتا، دونوں اسی طرف آ جاتے جس سے میں کنفرم ہو گیا تھا کہ ان دونوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ رکشے میں، میں ہی سوار ہوں۔

دفعتاً میرے دماغ میں خیال آیا کہ اگر دونوں یونہی میرا تعاقب کرتے رہے تو وہ جمیل کا گھر دیکھ لیں گے۔ اس طرح میرے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی مشکل کا شکار ہو سکتے تھے۔ ان دونوں سے جان چھڑانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے اپنے دماغ کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیے تھے۔ میں پُرغور نظروں سے قرب و جوار میں بھی دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت میں کسی پُرہجوم جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں ان دونوں کو چکما دے سکوں۔ پھر جیسے ہی مجھے ایک مارکیٹ کے باہر ہجوم دکھائی دیا تو میں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سنو! مجھے اس جگہ اتار دو۔" کہنے کے ساتھ ہی میں نے مارکیٹ کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

ڈرائیور نے رکشے کی رفتار قدرے کم کی اور حیرت سے مستفسر ہوا۔ "آپ نے چور بازار نہیں جانا؟"

"نہیں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے اس لیے میں یہیں اترنا چاہتا ہوں۔"

"اگر مارکیٹ میں کام ہے تو میں آپ کا انتجار (انتظار) کر سکتا ہوں۔" اس نے رکشے کی رفتار مزید کم کرتے ہوئے کہا کیونکہ ہم مارکیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ مارکیٹ گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس بیچنے والی دکانوں پر مشتمل تھی۔ لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے اور سڑک پر گاڑیوں کا اژدحام تھا۔ ڈرائیور نے ایک گاڑی سے قدرے فاصلے پر رکشا روک دیا۔

"نہیں۔ تم میرا انتظار مت کرو۔" میں نے اسے منع کر دیا۔ "کتنا کرایا ہو گیا؟"

"ایک سو بیس روپے۔" اس نے پان کی پیک سے زمین کو لال کرتے ہوئے کہا۔

میں نے جیب سے پیسے نکال کر اسے دیئے اور رکشے سے اتر کر تیز تیز چلتا ہوا مارکیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت کاروبار عروج پر تھا۔ کچھ لڑکے اور مرد باہر کھڑی گاڑیوں کے مرمتی کام میں مصروف تھے۔ باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مارکیٹ کا داخلی گیٹ لوہے کا تھا اور کھلا ہوا تھا۔ مارکیٹ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ارادتاً مڑ کر منشوں کی طرف دیکھا تھا۔ موٹر بائیک رکشے سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی اور دونوں منش بھی تیز تیز چلتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے جدھر میں موجود تھا۔

"آ جاؤ، دیکھتا ہوں تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ میں ان دونوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا تھا اس لیے سامنے سے آتے شخص کو نہ دیکھ سکا اور اس سے ٹکرا گیا۔ میری بائیں کہنی اس کے پیٹ میں لگی تھی، وہ سسک کر رہ گیا۔

"اندھے ہو...... دیکھ کر نہیں چل سکتے۔" اس شخص نے غصیلے لہجے میں کہا۔ وہ سر سے گنجا تھا۔ اس کے ماتھے پر سندور کی لکیر تھی۔ اس کا جسم فربہی مائل تھا۔ توندیں باہر نکلی ہوئی تھی جیسے اس نے پیٹ پر گھڑا باندھا ہوا ہو۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک شاپر تھا شاید وہ گاڑی کا کوئی پرزہ لے

کر جا رہا تھا۔

"سوری مہاراج۔ میں نے دیکھا نہیں تھا۔" میں نے معذرت کی لیکن وہ آدمی کوئی اکھڑ مزاج تھا۔ اس نے میری معذرت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چیخ سے مشابہ لہجے میں کہا۔

"کیا سوری مہاراج۔ تمہیں دیکھ کر چلنا چاہیے۔ ایک تو میرے پیٹ میں کہنی مار دی پھر اوپر سے سوری مہاراج کہتا ہے۔ ہونہہ۔ ہٹو سامنے سے۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ہنکاری بھری۔ مجھے اس کے یوں تضحیک آمیز لہجے پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ میرے سائیڈ پر ہوتے ہی وہ آگے بڑھ گیا۔ عین اسی وقت وہ دونوں بھی میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے نکلنا چاہا لیکن انہوں نے میرا راستہ روک لیا۔ دفعتاً ایک نے جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑ کر اوپر کر دیا۔ عین اسی لمحے فضا گولی کی آواز سے مرتعش ہوئی۔ یقیناً وہاں موجود لوگ چونک پڑے ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہو۔ اچانک ہی وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

اپنا وار ناکام جاتا دیکھ اس نے پہلے مجھے غلیظ گالی سے نوازا پھر میری گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے اس کے سر پر اپنے سر کی زوردار ٹکر رسید کر دی، ساتھ ہی میں نے اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھنے والے کے پیٹ میں لات مار دی۔ دونوں کے منہ سے بیک وقت سسکاریاں نکلی تھیں لیکن لوگوں کے شور میں ان کی سسکاریاں دب گئیں۔ میں نے پہلے والے کا بازو ایک جھٹکے سے نیچے کیا اور اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا تو نہ صرف اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا بلکہ مجھے یقین تھا کہ اس کی کلائی کی ہڈی بھی تھوڑی بہت چٹخ گئی ہوگی۔ میں نے لات کھانے والے کی طرف دیکھا، طیش سے اس کے نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔ وہ مجھے یوں غصے سے دیکھ رہا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں میرا خانہ خراب کر دے گا۔ ٹکر کھانے والا ذرا سنبھل کر میری طرف بڑھا۔ جیسے ہی قریب پہنچ کر اس نے میرے منہ پر مکا مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا وار اپنے بازو پر روکا اور اس کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ یہ اس کی خوش بختی تھی کہ وہ تھوڑا سا پیچھے ہوا تھا جس کی وجہ سے میرا مکا اس کی ناک کی بجائے اس کے منہ پر لگا تھا جس سے اس کے ہونٹ کا ایک کنارہ پھٹ گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔ اس نے آستین سے منہ صاف کیا پھر وہ دونوں اکٹھے ہی مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ لات کھانے والے کا مکا میرے رخسار پر پڑا تھا جس سے مجھے ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی اور میں توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے زمین بوس ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے۔ شاید انہوں نے مجھے آسان ہدف سمجھ لیا تھا اور وہ میری مرمت کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے جلدی سے کروٹ بدل لیا اور سیدھے ہوتے ہی میں نے ایک کی ٹانگ پر ٹانگ ماری تو وہ اچھل کر پشت کے بل زمین بوس ہوا اور اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ دوسرے کے قریب آنے سے پہلے ہی میں اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں موجود لوگ تماشائی بنے ہماری فائٹنگ کا بغیر ٹکٹ مزہ لے رہے تھے۔ کسی نے بھی ہماری فائٹنگ میں مداخلت کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کا مزہ خراب ہو جائے گا۔

پہلا شخص اٹھ کر جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ اس نے دیوانہ وار مجھ پر جست لگائی تھی۔ میں نے اس کے وار کو دائیں ہاتھ سے کلائی پکڑ کر روکا اور ساتھ ہی کلائی کو جھٹکا دیا۔ وہ بلبلایا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں لات ماری اور اسے اٹھا کر مفت کے مزے لوٹنے والے لوگوں پر پھینک دیا۔ وہ تقریباً اڑتا ہوا لوگوں پر گرا اور تین چار آدمیوں کو اپنے ساتھ لیتا ہوا زمین بوس ہوا۔ نیچے گرنے والے لوگ اسے گالیاں دیتے ہوئے اٹھے اور اس پر پل پڑے۔ اس کا دوسرا ساتھی اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے پہلو میں ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح ڈکرایا۔

"اب میرے پیچھے آئے تو دونوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" میں نے ڈکراتے ہوئے شخص سے کہا اور پھر کسی فاتح کی طرح چلتا ہوا ہجوم کی طرف بڑھا۔ اپنی طرف آتے دیکھ کر ہجوم جلدی چھٹ گیا اور میں سڑک پر پہنچا تو اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی رکتی ہوئی دکھائی دی جو بلاشبہ دیال سنگھ کی تھی۔ دیال سنگھ کو دیکھتے ہی میرے رگ و پے میں نفرت اور غصے سے لاوا ابھرنے لگا تاہم اس وقت دیال سنگھ سے دو دو ہاتھ کرنے کا وقت نہیں تھا لیکن جب میں نے دیال سنگھ کو ٹیکسی سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا تو میرے اعصاب تن گئے۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

محترم ایڈیٹر

سلام شوق!

میں ایک عجیب روداد کے ساتھ حاضر ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔ ہم ہندوانہ معاشرے سے آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوپائے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں، گاؤں دیہات میں ایسے کئی رسوم رائج ہیں جنہیں سن کر لوگ حیرت سے گنگ رہ جائیں۔ اس کنواں سے جڑی باتیں بھی ایسی ہی ہیں۔ گوکہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں لیکن ایسی قابل نفرت رسوم اگر کہیں رائج ہیں تو اسے ختم ہونا چاہیے۔

غلام قادر

(کراچی)

میں پلی بڑھی ہوں۔ میں نے ایک ایسے گاؤں میں جنم لیا تھا جہاں توہمات اور جہالت کا راج تھا۔ ابا کی کچھ زمینیں تھیں جن پر وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ زمین انہیں ورثے میں ملی تھی لیکن گھر میں غربت بالکل نہیں تھی۔ ہر سال ابا کو زمینوں سے اچھی آمدنی ہوجاتی تھی اور ہمارا گزر بخوبی

ہوجاتا تھا۔ جہالت اتنی زیادہ تھی کہ گاؤں کی کسی بھی لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے انہیں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ دونوں عمر میں کافی بڑے تھے۔ میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب بڑے بھائی وسعت اللہ ساتویں میں تھے جب میں تین

سال کی ہوئی تو دونوں بھائیوں نے ابا سے ضد کر کے مجھے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ اسکول جاتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی تھی۔ صبح ابا کے ساتھ اسکول جاتی اور وہ مجھے اسکول چھوڑ کر کھیت کی طرف نکل جاتے۔

پرائمری تک کوئی پریشانی نہ ہوئی لیکن پانچویں پاس کر کے سیکنڈری میں آئی تو ایک مسئلہ یہ ہوا کہ ابا نے سیکنڈری میں داخلہ لینے پر اعتراض کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ سیکنڈری اسکول گاؤں میں نہیں بلکہ قصبے میں تھا۔ میں نے بہت کہا کہ گاؤں سے دو لڑکیاں وہاں جاتی ہیں میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ وسعت بھائی شہر سے آگئے۔ ایک بار پھر دونوں بھائیوں نے ابا کے خلاف محاذ بنالیا۔ ابا نے لاکھ حجت کی کہ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو نہیں پڑھانا چاہیے۔ وسعت

بھائی نے وضاحت مانگی تو ابا نے جواب میں کہا۔ ”ہاجرہ جو شہر جابسی تھی اس نے اپنی بیٹی کو پڑھایا تھا، دیکھو اس نے پورے خاندان کے منہ پر کالک مل کر اپنے ساتھ پڑھنے والے سے کورٹ میرج کرلی۔“

وسعت بھائی کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ”ابا کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔“

ابا نے نفی میں جواب دیا تو وسعت بھائی کو آگے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”ہاجرہ کی بیٹی کے کورٹ میرج کرنے میں تعلیم کا نہیں بلکہ تربیت کا قصور تھا۔“ وسعت بھائی نے کہا تو ابا کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

”تربیت کی بات کہاں سے آگئی۔“ ابا نے کہا تو وسعت بھائی مسکرا دیے اور کہا:

”ابا مجھے شہر گئے ہوئے ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے ہیں ورنہ میں اسی گاؤں میں پلا بڑھا ہوں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ بہت سی لڑکیاں اسکول جارہی ہیں۔ حکومت بھی چاہتی ہے کہ لڑکیاں پڑھیں۔“

اس پر ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر بولے۔ ”اگر کچھ اونچ نیچ بات ہوگئی تو۔“

وسعت بھائی ہنسنے لگے تھے۔ ”ابا آپ میری ماں اور اپنی بیوی کی تربیت پر شک کا اظہار کررہے ہیں۔“

اور ابا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ ”اگر کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار تم ہی ہوگے۔“ ابا نے کہا۔

بھائی پرجوش لہجے میں بولے۔ "ابا مجھے اپنی بہن پر پورا بھروسا ہے۔ یہ بھی آپ کا اور میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔" ابا اس فقرے پر خوش ہو گئے، انہوں نے اجازت دے دی۔

اس اسکول میں میری کئی لڑکیوں سے پہلے ہی مہینے میں دوستی ہوگئی۔ ان میں ایک تو خان صاحب کی بیٹی تھی۔ خان صاحب گاؤں کے زمیندار تھے۔ ان کی بیٹی بھی گاڑی میں اسکول آتی تھی بلکہ اکثر مجھے بھی گھر سے لے جاتی تھی۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی لیکن اس میں غرور نام کو نہیں تھا۔ اسکول سے واپسی پر وہ مجھے گھر پر ڈراپ کرتی اور پھر اپنی حویلی جاتی تھی۔ میں پرائمری کی طرح سیکنڈری میں بھی ہمیشہ اول آتی تھی جبکہ خان صاحب کی بیٹی کلاس میں آخر نمبروں میں سے ایک ہوتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور ہم نویں میں پہنچ گئے۔ یہ بورڈ کے امتحان تھے۔ خان صاحب کی بیٹی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی پڑھائی میں مدد کروں مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نے شرط رکھی کہ کام اسکول کے لیے اسے میرے گھر آنا پڑے گا اس پر اس نے کہا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بابا شاید اس کی اجازت نہ دیں۔"

میں ہنس دی۔ "تمہارے بابا کی شرافت اور دریا دلی کا تو پورا گاؤں معترف ہے۔" میں نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"شاید تم ان کے اس چہرے کی بات کر رہی ہو جو اصل میں ان کا چہرہ نہیں بلکہ نقاب ہے جو انہوں نے اوڑھا ہوا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے کسی قدر صدمے کے عالم میں کہا تھا۔ ایک باپ کے لیے بیٹی کے ایسے خیالات مجھے بہت ناگوار لگے تھے۔

"کاش میں تمہیں حقیقت بتا سکتی میری مجبوری ہے کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔" اس نے کہا۔ میرا گھر آ گیا تھا اس لیے میں اتر گئی۔

میں اس سے جدا ہو کر گھر تو آ گئی لیکن اس رات کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آ سکی۔ بار بار میرے کانوں میں خان صاحب کی بیٹی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

آخر ایسا کون سا راز ہے جسے وہ تو جانتی ہے لیکن بتاتے ہوئے خوفزدہ ہے لیکن اگلی صبح سے کچھ پہلے میں نے اس کے الفاظ ذہن سے جھٹک دیے تھے۔

"ہوگا کچھ مجھے اس سے کیا۔" میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد میں اس سے کچھ دور رہنے لگی تھی۔ نویں کے امتحان ہوئے اور ہم میٹرک میں آ گئے۔ اسکول کی ہر ٹیچر نے مبارکباد دی کیونکہ میرے نمبر اسکول میں سب سے زیادہ تھے۔

میٹرک میں اور زیادہ محنت کی اور جب امتحان کا زمانہ آیا تو سب کچھ بھول کر کتابوں میں گم ہو گئی۔ امتحانوں سے کچھ پہلے اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اسی زمانے میں وسعت بھائی بھی شہر سے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں بینک میں نوکری مل گئی تھی اور ان کی پوسٹنگ گاؤں کے ساتھ قصبے میں ہو گئی تھی۔ ادھر میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور اسکول میں سب سے زیادہ نمبر تو لیے ہی تھے ڈسٹرکٹ میں بھی میری پوزیشن آ گئی تھی۔

ابا نے میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے کالج میں داخلے کی اجازت دے دی تھی کیونکہ اب وہ صرف کسان نہیں تھے بلکہ بینک منیجر کے باپ بھی تھے۔ لوگ اب انہیں عزت دینے لگے تھے۔

شہر میں ہمارا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں تھا جس کے گھر رک کر میں تعلیم مکمل کر سکتی اس لیے وسعت بھائی نے میرے لیے ہاسٹل میں کمرا بک کروا لیا تھا۔ اسی ہاسٹل میں خان صاحب کی بیٹی بھی آ گئی لیکن گاؤں کا معاشی فرق یہاں بھی واضح تھا۔ وہ ایک بڑے کمرے میں رہتی تھی جبکہ مجھے ایک ایسا کمرا ملا تھا جہاں میرے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔

پہلی بار بھائی نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ مجھے لینے نہیں آ رہے تو میں اپنے کمرے میں اداس بیٹھی تھی کہ خان صاحب کی صاحبزادی میرے کمرے میں آئی اور کہا۔ "کیوں کیا آج تم گاؤں نہیں جا رہی۔"

میں نے کہا۔ "بھائی کا فون آیا تھا کہ بینک میں کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ شہر نہیں آ سکتے۔"

میرا جواب سن کر وہ ہنسنے لگی تھی اور کہا۔ "تو کیا ہوا تم میرے ساتھ چلو۔"

میں نے انکار کر دیا جس پر وہ بولی۔ "اسکول میں بھی تو میں تمہیں ڈراپ کرتی رہی ہوں۔"

میرا جواب تھا۔ "تب کی بات اور تھی۔ چند منٹ کی

بات تھی اور میرے ابا کی اجازت بھی تھی لیکن شہر سے گاؤں کا سفر طویل ہے اور میں نے ابا سے اجازت بھی نہیں لی۔"

میں نے جواب دیا تو اس نے کہا۔ "اب نخرے مت کرو جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو، باہر کار میں ابا منتظر ہیں۔" میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر چینج کرنے چلی گئی۔

ہم دونوں کالج کے گیٹ سے نکلے تو واقعی خان صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "آج تو دو سواریاں ہیں۔" اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ان کا انداز ہی ایسا تھا جیسے وہ کوئی ٹیکسی چلا رہے ہوں اور سواریاں دیکھ کر خوش ہو گئے ہوں۔

اس کے بعد کا راستہ کس طرح کٹا اس کے بارے میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا، پورا راستہ باتوں میں گزر گیا لیکن یہ گفتگو زیادہ تر خان صاحب سے ہوئی تھی اور وہ بھی پڑھائی کے بارے میں تھی۔ مثلاً خان صاحب نے سوال کیا، تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے تو میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ان کی بیٹی نے جواب دیا اسکول کی طرح ملوشہ یہاں بھی ہر ٹیسٹ میں اول آتی ہے اور میں اپنی تعریف سن کر شرما گئی تھی مگر خان صاحب کے فقرے نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔

"حسن اور عقل بہت کم ایک ساتھ ہوتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ ملوشہ اس کا ایک حسین امتزاج ہے۔"

خان صاحب نے ایک طرح سے میری تعریف ہی کی تھی لیکن اپنی بیٹی سے دو برس چھوٹی لڑکی کی یوں تعریف کرنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"اب تمہارے آگے پڑھنے کے بارے میں کیا ارادے ہیں؟" خان صاحب نے سوال کیا تھا۔

"میرے ابا ایک غریب کسان ہیں انہوں نے مجھے یہاں تک تعلیم کی اجازت دی یہی احسان بہت ہے۔" میں نے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ میں گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو بی اے تک پہنچی تھی ورنہ زیادہ تر لڑکیاں پرائمری تک تعلیم حاصل کر پاتی تھیں چند ایک نے میٹرک بھی کیا تھا لیکن اس کے فوری بعد ان کی شادیاں ہو گئی تھیں وہ چولہا ہانڈی کرتی اور بچوں کو سنبھالتی تھیں۔

"تمہارا بھائی بھی تو بینک میں ہے اور اس کی تنخواہ بھی بہتر ہے وہ بھی تمہارے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔" خان صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔

"کر تو سکتا ہے لیکن میرا ابا سے وعدہ تھا کہ وہ مجھے بی

اے کرنے دیں پھر جیسا وہ کہیں گے میں کروں گی۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''بہت سعادت مند بچی ہو۔'' خان صاحب نے کہا اور میں خوش ہوگئی۔ یہ فقرہ ان پر سوٹ کرتا تھا۔

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ہم گاؤں پہنچ گئے جہاں ابا نے ہمارا استقبال کیا اور انہوں نے خان صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انہوں نے ان کی بیٹی کو شہر سے گاؤں پہنچایا۔ ابا کے اصرار کے باوجود خان صاحب گھر کے اندر نہیں آئے۔ اماں اور خالہ جو اس وقت ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں انہوں نے بھی خان صاحب کا شکریہ ادا کیا اور میں ابا کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی جہاں کچھ دیر بعد ابا نے مجھ سے کہا۔ ''پلوشہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے اب تمہیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔'' ان کے لہجے میں عجیب طرح کی سنجیدگی تھی۔

''مجھے بھی اپنا وعدہ یاد ہے۔'' میں نے کہا تو ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی۔

''مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی میرا سر جھکنے نہیں دے گی۔'' ابا نے کہا اور پھر کچھ دیر رک کر بولے۔ ''بیٹی میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔''

''مگر ابا ابھی تو اگلے مہینے میرے فائنل امتحان ہونے والے ہیں۔'' میں نے صرف اتنا کہا تو ابا ہنس دیے۔

''ہم بھی تیرا نکاح کل تو نہیں کر رہے۔'' اور میں خاموش رہی پھر انہوں نے بات آگے بڑھائی۔ ''میں جانتا ہوں کہ اگلے مہینے تمہارا آخری امتحان ہے اس کے بعد میری بیٹی بی اے ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہم تمہاری شادی کردیں گے۔'' ابا نے کہا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ میں معلوم کرتی کہ میرا ہونے والا شوہر کون ہے اور کس سے انہوں نے رشتہ طے کیا ہے لیکن میں خاموش ہی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جمعہ کا روز تھا جب میں شہر سے گاؤں آئی تھی۔ ہفتہ کو وسعت بھائی کی چھٹی ہوتی تھی اور انہوں نے ناشتے کے بعد مجھ سے کہا مجھے تم سے بات کرنی ہے اور میں ان کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی جہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا رشتہ میرے خالہ زاد سے ابا نے طے کر دیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابا ایک نان میٹرک کے ساتھ میرا رشتہ کیسے طے کر سکتے ہیں لیکن میں نے کچھ کہا نہیں کیونکہ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا اور یہ وعدہ میں نے اس وقت کیا تھا جب ابا نے مجھے شہر جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ابا نے کہا تھا۔ ''دیکھو پلوشہ میں تمہیں شہر جانے کی اجازت تو دے رہا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہاں تم صرف تعلیم حاصل کرو گی اور واپسی پر جہاں میں رشتہ کروں گا اسے قبول کرو گی۔'' میں نے وہ وعدہ کرلیا تھا اور اس لیے کرلیا تھا کہ اس وقت میری نظروں میں صرف تعلیم حاصل کرنا تھی۔ بھائی سے بات کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگئی اور عادل کے بارے میں غور کرنا شروع کیا۔ عادل میرا خالہ زاد تھا لیکن بمشکل میٹرک تک پہنچا تھا اور دو بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد اس نے گاؤں چھوڑ کر قصبہ میں دکان کھول لی تھی۔ وہ ایک گھبرو جوان تھا اور گاؤں کا وہ پہلا جوان تھا جس نے موٹر سائیکل خریدی تھی اور ہر روز سویرے وہ موٹر سائیکل پر قصبہ جاتا تھا۔ وہاں دن بھر دکان میں رہتا اور شام میں گاؤں واپس آجاتا تھا۔ بظاہر عادل میں مجھے کوئی ایسی برائی نظر نہیں آرہی تھی جس کی وجہ سے میں اس سے شادی سے انکار کر سکتی اور نہ ہی میرے پاس ایسا کوئی شخص تھا جسے میں عادل کے نعم البدل کے طور پر پیش کر سکتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ کالج میں کچھ لڑکوں نے مجھ میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا لیکن میرے رویے نے ہر ایک کو مایوس کیا تھا کیونکہ مجھے ان میں سے کسی میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ مجھے ابا سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔

جب میں بھائی کے پاس سے اٹھی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اتنی ہمت جمع نہیں کر پا رہے تھے کہ مجھ سے کچھ کہہ سکتے۔ امتحانوں کے بعد گاؤں آئی تو ابا نے بتایا کہ انہوں نے خالہ کو اگلے ماہ شادی کی تاریخ دے دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے بھی اس روایت پر عمل کرنا تھا جو ہمارے گاؤں کی جہالت کی سب سے بڑی روایت سمجھی جاتی تھی اور وہ روایت یہ تھی کہ جس لڑکی کی شادی کی تاریخ طے ہوتی تو اسے گاؤں سے کچھ دور ایک کنویں پر جا کر کنویں سے پانی نکالنا ہوتا تھا۔ کنویں میں ڈول خان صاحب کا باڈی گارڈ ڈالتا تھا اگر ڈول میں پانی صاف نکلتا تو لڑکی کے پاکیزہ ہونے کی گواہی ہوتا لیکن اگر ڈول کے پانی میں مٹی ہوتی اور پانی گدلا نکلتا تو اسے غیر پاکیزہ قرار دیا جاتا۔

میں بچپن سے اس روایت کے خلاف تھی لیکن جب ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تو میں مطمئن تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پانی صاف اور شفاف ہی نکلے گا مگر پھر مجھے یاد آیا

کہ ابا کی اکلوتی بہن بھی اس عذاب سے گزری تھی۔ پھوپو رباب کا شمار گاؤں کی ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جو بلا ضرورت گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی تھیں ان کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو انہیں بھی کنویں پر لے جایا گیا جہاں ان کی ڈول میں ریت موجود تھی اور انہیں گاؤں سے کچھ دور اس کمرے میں لے جایا گیا جو کنویں سے زیادہ دور نہیں تھا اور انہیں وہاں پانچ راتیں گزارنی تھیں۔ رباب پھوپو کو اس کمرے میں چھوڑ کر جب ابا واپس آئے تو اماں نے ان سے خوب جھگڑا کیا۔

''میں رباب کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتی ہوں؟'' اماں نے کہا تھا۔

''تمہاری قسم پر کون یقین کرے گا۔'' ابا نے ناراض لہجے میں کہا تھا۔

''تم کس طرح کے بھائی ہو کہ صرف ڈول میں ریت دیکھ کر اپنی بہن کے گناہ گار ہونے پر یقین کر رہے ہو۔'' اماں نے کہا تو ابا غصہ میں آگئے۔ ''میں تمہاری قسم پر یقین کر کے گاؤں والوں سے تو نہیں لڑ سکتا۔ ویسے بھی کئی نسلوں سے گاؤں میں یہی روایت ہے کہ پانچ دن کے لیے اس گناہ گار لڑکی کو کمرے میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور پانچ دن بعد جب وہ وہاں سے آتی ہے تو اس کے پاکیزہ ہونے کا سب کو یقین ہوتا ہے۔'' ابا نے غصے سے کہا تھا اور اماں منہ دیکھتی رہ گئی تھیں مگر وہ خاموش نہیں رہی تھیں۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈول میں پہلے سے ریت موجود ہو کیا کسی نے کنویں میں ڈالے جانے سے پہلے ڈول کو دیکھا تھا۔'' اماں نے کہا اور ابا کا پارہ آسمانوں کو چھونے لگا تھا۔

''پانچ دن صبر کر لے پانچ دن بعد رباب پھر ہمارے ساتھ ہوگی۔'' ابا نے کہا اور مجھے گود میں اٹھا کر وہاں سے چلے آئے۔

☆☆☆

میں کنویں پر گئی اور ڈول سے پانی نکالا گیا۔ میں نے چاہا کہ پہلے ڈول کو چیک کرلوں لیکن جیسے ہی میں نے قدم اٹھانا چاہا ابا نے مجھے روک دیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈول کنویں سے باہر نکلا تو اس میں گدلا پانی تھا۔ مجھے اب اپنا حشر سامنے نظر آرہا تھا۔ ابا اور خان صاحب کے لوگ مجھے اس کمرے تک لائے جس میں ایک لوہے کا دروازہ تھا اور دروازے پر ایک بڑا سا تالا تھا۔

میں کمرے میں آئی تو کمرے میں پوری طرح اندھیرا نہیں تھا باہر کی کچھ روشنی کمرے میں آرہی تھی لیکن اس نیم اندھیرے کمرے میں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اس ہلکی سی روشنی میں دیکھا تو مجھے کمرے میں نہ کوئی بلب نظر آیا نہ کوئی ایسا بورڈ نظر آیا جس میں بٹن ہوتے ہیں۔ البتہ دروازہ میں ایک کنڈی نظر آئی تو میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اندر سے کنڈی لگائی۔ پھر مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا میں نے اسے کھولا تو وہ باتھ روم کا دروازہ تھا میں نے اس دروازے کو بھی اندر سے بند کرلیا۔ رات آہستہ آہستہ اتر رہی تھی اور کمرے کے اندر کا اندھیرا بھی تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔

یا اللہ کیا میرا حشر بھی پھوپو رباب کی طرح ہوگا۔ میں نے اندھیرے کمرے میں ڈر میں اپنے رب کو یاد کیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ مجھے پھوپو رباب یاد آگئی تھیں جنہیں پانچ روز بعد ابا لینے گئے تھے لیکن واپسی میں ان کی لاش لائے تھے۔ گھر پہنچنے تک ان کی لاش نیلی ہو چکی تھی۔ گاؤں والوں نے اس پر کہا تھا کہ یا تو اس نے خودکشی کی ہے یا اسے سانپ نے کاٹا ہے۔

اماں خودکشی والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے بول پڑی تھیں۔ ''خودکشی کے لیے اس کے پاس زہر کہاں سے آیا۔''

اس بات سے ابا بھی متفق ہوگئے مگر انہوں نے کہا ''کمرے میں نہ کوئی کھڑکی ہے نہ کوئی ایسا راستہ جس سے سانپ آسکے۔'' ابا نے کہا تھا۔

پوسٹ مارٹم میں شاید بات واضح ہو جاتی لیکن اس کے لیے شہر کے اسپتال لاش لے جانی پڑتی جو ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں کار صرف خان صاحب کے پاس تھی اور ابا ان سے اس درخواست کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہمارے گھر تو کار بھائی کی بینک کی نوکری کے بعد ہی آئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور میں اندھیرے کمرے میں بچھی دری پر گھٹنوں میں منہ دیے روئے جا رہی تھی اور جو سورتیں مجھے یاد تھیں انہیں دہرا رہی تھی۔ مجھے اندھیرے سے زیادہ کتوں اور بھیڑیوں کی آوازوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ قرآن کی آیتیں دہرانے سے دل کو کچھ سکون آیا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا جب پہلے اس دروازے پر دستک ہوئی جس پر تالا تھا پھر ایک وقفہ کے بعد باتھ روم کے دروازے پر بھی دستک ہوئی۔ دستک کی وجہ سے میں کچھ اور

اس میں اتارات بنانے میں کامیاب ہوگئی کہ رینگتے ہوئے باہر نکل آئی۔ میں باہر تو نکل آئی لیکن پہلا جھٹکا مجھے جگہ کو پہچاننے میں لگا تھا۔ یہ حویلی کے باہر کا عقبی حصہ تھا۔ خان صاحب کی وہ حویلی جہاں میں چند بار آئی تھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے میں خان صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اچانک میرے کانوں میں ان کی اپنی بیٹی کے الفاظ گونجے تھے۔ جسے تم ان کا چہرہ کہہ رہی ہو وہ ان کا ماسک ہے۔

خان صاحب کی شہرت ایسی تھی کہ کوئی بھی شخص ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص گاؤں کی مسجد کمیٹی کا صدر ہے اور گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی شادی ہو اس میں ہر طرح کا مالی تعاون کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اور ان کی یہی شہرت تھی جس کی وجہ سے گاؤں کی کوئی بھی عورت ان سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھی جو ان کی دل سے عزت کرتی تھی اور تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ میں حویلی میں جا کر خان صاحب کو پوری بات بتا دوں لیکن پھر میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور میں ایک اوٹ میں ہوگئی تھی کیونکہ میں نے خان صاحب کو ان کے اس باڈی گارڈ کو اپنی اس جانب آتا دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ دونوں یا ان میں سے ایک مجھے دیکھ لیتا۔ میں جس اوٹ میں تھی وہاں سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پوری طرح سے سن سکتی تھی اور انہیں کوئی ڈر تو تھا نہیں کہ وہ نیچی آواز میں بات کرتے۔ پہلی بات خان صاحب نے کی تھی۔

''آج بھی اس حرام زادی نے دروازہ نہیں کھولا تو باتھ روم والا دروازہ کاٹ دینا۔'' خان صاحب نے کہا۔

''ضروری سامان ساتھ لے لینا اور ٹارچ بھی ساتھ رکھنا۔''

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے میں باہر نکلی تھی۔ خان کے گارڈ نے وہ ڈھکن پہلے دیکھا تھا اور اسی نے خان کو متوجہ کیا تھا۔ ''صاحب مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی وہاں سے بھاگ گئی ہے۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' خان صاحب نے جواب میں کہا تھا لیکن ان کے لہجے میں بھی گھبراہٹ تھی۔

''صاحب جی آپ بھول رہے ہیں وہ رباب کی بھتیجی ہے۔'' گارڈ نے کہا۔

''رباب وہاں سے نکل تو آئی تھی لیکن مجھ سے ہی شکایت کرنے آئی تھی اس کے بعد کیا ہوا تھا وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' خان صاحب نے کہا۔

''جی صاحب رات بھر آپ اس کے ساتھ عیش کرتے رہے اور صبح میں نے اسے کو براسے ڈسوا کر لاش دوبارہ سے اس کمرے میں پہنچادی تھی۔'' گارڈ نے خباثت سے بھرپور لہجہ میں کہا تھا۔

پھوپو کی موت کی حقیقت جان کر میرا دل چاہا کہ میں چیخ مار کر رو دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس صورت میں وہ دونوں دوبارہ سے پکڑ لیتے اور میرا حشر پھوپو سے مختلف نہ ہوتا۔

میں اس وقت تک وہاں چھپی رہی جب تک وہ دونوں ڈھکن اتار کر اس سرنگ میں نہ اتر گئے اس کے بعد میں نے وہاں سے مخالف سمت میں دوڑ لگائی اور بھاگتی چلی گئی۔ رات اندھیری تھی اور میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ میں کس سمت جا رہی ہوں۔ اپنے طور پر میں گاؤں کی طرف بھاگی تھی لیکن بھاگتے ہوئے کافی دیر ہوگئی لیکن گاؤں نہیں آیا۔ پھر اچانک مجھے اپنے پیروں تلے پکی سڑک کے آثار محسوس ہوئے لیکن میں رکی نہیں بلکہ بھاگتی چلی گئی۔ میرا سانس پھول گیا تھا بھوک کی شدت سے بھی عجیب حالت ہو رہی تھی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہی مجھے دو روشنیاں اپنی جانب آتی ہوئی دکھائی دی تھیں اور میں بے ہوش ہوگئی۔ دن بھر کی بھوک میں تین کیلے کتنا سہارا دے سکتے تھے۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی اور وہ جو میری آنکھوں کے سامنے تھا وہ خان کا بیٹا تھا۔

''کون ہو تم اور اتنی رات وہاں جنگل میں کیا کر رہی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔

میں جواب دینا چاہتی تھی لیکن میری زبان سے صرف پانی نکلا تو اس نے ایک نرس کو پانی کے لیے کہا اور اگلے لمحے اس نے پانی سے بھرا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے تیزی سے وہ پانی حلق سے نیچے اتارا اور پھر کہا میں بھوکی ہوں خدا کے لیے مجھے کچھ کھانے کو دیں۔

''کھانا بھی مل جائے گا لیکن پہلے بتاؤ تو سہی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آ رہی ہو کیا کسی نے تمہیں اغوا کیا تھا۔'' میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان پا رہا تھا۔

کیونکہ میں کبھی حویلی کی طرف جاتی نہیں تھی۔ بچپن میں ایک دوبار دیکھا تھا مگر جب ہاسٹل میں آئی تو ایک بار وہ بہن سے ملنے آیا تھا۔ اسے میں نے دور سے دیکھا تھا۔ بعد میں خان صاحب کی بیٹی نے بتایا تھا کہ وہ فوج یا پولیس میں جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں کہنا چاہتی اور بہت کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن میری آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

لوٹ تو آسمان سے گر کر کھجور کے درخت میں اٹک گئی ہے۔ میں نے سوچا۔ 'اگر تم نے اسے بتا بھی دیا تو کیا ہوگا یہ اپنے باپ کے خلاف کوئی کارروائی کیوں کرے گا۔' میں نے سوچا اور اسے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''اگر تم میرے سوالوں کا جواب نہیں دوگی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا پھر وہ تم سے تمام کہانی اگلوا لیں گے۔'' اس نے کہا اور پولیس کا سن کر میں گھبرا گئی تھی۔

''سر آپ میرے محسن ہیں لیکن مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔ مجھے جانے دیں میں اپنے گھر چلی جاؤں گی اور پھر کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔'' میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے لیکن اسے رحم نہیں آیا اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور میں اٹھتی چلی گئی ایک وارڈ بوائے اور دو نرسوں کی مدد سے اس نے مجھے اپنی جیپ میں بٹھایا اور جیپ چلا دی۔

جیپ پولیس والوں کی تھی۔ کیا یہ پولیس والا ہے۔ میرے ذہن نے سرگوشی کی۔

جیپ کچھ دیر چلی تو میں نے ایک بار پھر کچھ کھانے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک بار بی کیو کے سامنے جیپ روک دی، دو پولیس کے سپاہی تیزی سے آگے آئے اور آتے ہی اسے سیلوٹ کیا۔ ''دو سینڈوچ اور دو سیون اپ لے آؤ جلدی۔'' اس نے کہا۔

''تو یہ واقعی پولیس کا کوئی افسر ہے۔'' میرے ذہن نے سرگوشی کی۔ میں سینڈوچ اور بوتل سے فارغ ہوئی تو اس نے جیپ آگے بڑھائی۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ بہن نے کوشش کا بتایا تھا۔ گویا وہ کوشش میں کامیاب ہو کر افسر بن چکا تھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' جیپ آگے بڑھی تو میں نے سوال کیا۔

''سوال کرنے کا حق ملزموں کو نہیں ہوتا۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''میں ملزمہ نہیں ہوں۔''

''یہی تو اتنی دیر سے میں معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟'' اس نے کہا۔

''میں ایک مظلوم لڑکی ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اور اس مظلوم لڑکی کا نام کیا ہے؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔ ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ جیپ تھانے میں داخل ہوگئی اور وہاں موجود سپاہیوں نے سیلوٹ کرنا شروع کر دیے۔

''میرا نام تو تمہیں تمہاری بہن بھی بتا سکتی ہے دلاور خان۔'' میں نے تلخ لہجہ میں کہا۔

''تم مجھے جانتی ہو؟''

''میں تمہیں ہی نہیں تمہارے پورے خاندان کو جانتی ہوں خاص طور پر تمہارے باپ کو جس نے شرافت اور ہمدردی کا نقاب اوڑھا ہوا ہے لیکن اصل میں شیطان ہے اور ہر برے کام میں مشغول ہے۔'' میں کہنے پر آئی تو کہتی چلی گئی۔

''تم جن کی بات کر رہی ہو وہ میرا باپ نہیں ہے بلکہ میری ماں کا دوسرا شوہر ہے۔'' دلاور خان نے مجھ پر بم گرایا تھا۔ ''اس ہوس کے پجاری نے پہلے میرے باپ کو قتل کروایا صرف اس جرم میں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس نے میری خوبصورت ماں کی جھلک دیکھ لی تھی اور اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ بیوہ ماں اور دو برس کے بچے کو وہ اپنی حویلی لے گیا اور وہاں کچھ روز بعد اس نے نکاح کا ڈراما کیا اور میرا داخلہ بہت اچھے اسکول میں کروا دیا۔''

اب میرا تمام ڈر ختم ہوگیا تھا اس لیے میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنادی جسے اس نے نہایت خاموشی سے سنا اور کہا میں ایسے ہی کسی دن کے انتظار میں تھا پھر اس نے تھانہ کے ایس ایچ او کو چھاپے کی تیاری کرنے کا کہا اور ایک بڑی پولیس پارٹی کے ساتھ وہ سیدھا اس کمرے پر پہنچا جہاں چند گھنٹے پہلے میں قید تھی۔ میں اس کے ساتھ جیپ کی اگلی سیٹ پر موجود تھی۔ پولیس کی آمد کی خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ دلاور نے اپنے پولیس والوں کو تالا توڑنے کی ہدایت کی۔ تالا توڑا گیا لیکن کمرے سے کچھ نہ ملا تو ہم باہر نکل آئے۔ باہر ایک مجمع جمع ہو چکا تھا اور ان میں ابا اور وسعت بھائی بھی تھے۔ وہ مجھے اس طرح پولیس کے ساتھ دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ پھر دلاور نے میری ہدایت پر حویلی کا رخ کیا اور

حویلی میں گھستا چلا گیا۔ وہاں اس نے خان صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ جب وہ اسے ہتھکڑیاں پہنا رہا تھا تو میں دلاور کے پیچھے ہی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر خان صاحب نے کہا۔ ''آج تو بچ گئی ہے لیکن جیل سے آکر میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوگا۔''

''جیل سے واپسی کے بارے میں اب سوچنا بھی نہیں۔'' دلاور نے کہا۔ ''جیل سے تم سیدھے پھانسی کے پھندے پر جاؤ گے۔'' دلاور کے لہجے میں پوری کائنات کی نفرت تھی۔

''بڑے مجرم کو تو گرفتار کرلیا لیکن اس کے ہر جرم کا شریک اب تک آزاد ہے۔'' میں نے گارڈ کی جانب اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے گارڈ کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور ایس ایچ او کو ہدایات دیں کہ یہ دونوں قاتل ہیں ان کی خوب خاطر مدارات کرنا۔

خان صاحب اور ان کے گارڈ کو ایس ایچ او اپنے ساتھ لے گیا۔ میں ابا اور وسعت بھائی کے ساتھ اپنے گھر آگئی جہاں گھر کے باہر ایک ہجوم جمع تھا لیکن ابا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ''اب بیٹی پلو شہ ہمیں اپنی پوری کہانی سناؤ کہ تم پر کیا بیتی اور تم ایس پی دلاور کے پاس کس طرح پہنچیں؟''

میں نے پوری داستان انہیں سنادی جسے بعد میں ابا نے ٹکڑے ٹکڑوں میں گاؤں والوں کو سنائی اور اس کے بعد گاؤں میں جیسے انقلاب آگیا۔ لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا شروع کردیا اور وہ قاتل کنواں بھی گاؤں والوں نے بند کروا دیا۔

ابا بڑے فخر سے میری تعریفیں کرتے کہ دیکھا میری بیٹی نے کیسے ہم سب کی آنکھوں سے روایت کی پٹی ہٹائی پھر انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں نے اردو لٹریچر میں داخلہ لیا تھا کہ دلاور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رشتہ لے کر آگیا۔ عادل کا رشتہ تو اسی دن ابا نے ختم کردیا تھا جب خالہ نے ڈول کا گدلا پانی دیکھ کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کو اس ناپاک لڑکی سے بچایا۔''

دلاور کا رشتہ آیا تو ابا نے مجھ سے میری مرضی معلوم کی تو میں نے کہا۔ ''ابا آپ جہاں کہیں گے شادی کرلوں گی لیکن اس بار میری شرط ہوگی کہ شادی ایم اے کرنے کے بعد ہی ہوگی۔''

ابا نے دلاور اور اس کی ماں کے سامنے میری شرط رکھی تو وہ فوراً ہی تیار ہوگئے لیکن اصرار کیا کہ شادی بعد میں ہو لیکن منگنی کی رسم اسی ہفتہ ہونی چاہیے اس پر نہ ابا کو اعتراض تھا نہ مجھے۔

منگنی کے بعد ایک روز میں نے وسعت بھائی سے کہا اس روز آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن جھجک سے گئے تھے تو وہ ہنسنے لگے۔ ''اب چھوڑو ان باتوں کو رات گئی بات گئی۔'' لیکن میں نے جب اصرار کیا۔ تو بولے۔ ''میں اس وقت تم سے تمہاری ہونے والی نند کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''تو کیوں نہیں کی۔'' میں نے کہا اور وسعت بھائی ہنس دیے۔

''جب بھی تم سے مدد چاہنے والا تھا اب بھی مدد مانگ رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور میں نے اگلے روز ایس پی صاحب کو جامعہ بلوایا۔ ''والد کی تمام حرکات سے واقف ہونے کے باوجود وسعت یہ رشتہ چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ وہ میری بہن کو بھولے سے بھی اس کے باپ کا طعنہ نہ دے۔''

میں نے دلاور کا پیغام وسعت بھائی تک پہنچایا تو انہوں نے کہا۔ ''تمہارا ہونے والا شوہر کیا مجھے اتنا گھٹیا سمجھتا ہے میں تو اس کا قائل ہوں کہ باپ کے گناہوں سے اولاد کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

اسی ہفتہ وسعت بھائی کی منگنی ہوگئی اور ہم دونوں کے ایم اے کرنے کے بعد ہمارے نکاح ہوگئے۔ دلاور کی بہن ہمارے یہاں آگئی اور میں حویلی منتقل ہوگئی جو خان صاحب کی پھانسی کے بعد دلاور اور اس کی والدہ کے نام منتقل ہوگئی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد میری لیکچرار کی نوکری ہوگئی۔ اب میں صبح کالج جاتی ہوں۔ وہاں سے واپسی پر ساس کا ہاتھ بٹاتی ہوں اور اے ایس پی دلاور کے لیے ان کے من پسند کھانے بناتی ہوں۔ نماز کی پابند میں پہلے بھی تھی لیکن اللہ کی ان مہربانیوں کے بعد اور زیادہ پابندی سے نماز پڑھتی ہوں۔ اس کی رحمتوں کا کچھ تو حق ادا کرسکوں۔

آج ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں ایک میٹرک پاس لڑکی موجود ہے۔ ایک دیے سے نہ جانے کتنے دیے روشن ہوگئے ہیں۔

++

خلوصِ نیت

جنابِ من
سلام تہنیت!
ایک ایسی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جو بہت مشہور ہے کیونکہ اس واقعہ کی خبریں اخبار و ٹی وی پر بہت چلی تھیں۔ اس سچ بیانی پر غور ضرور کریں کہ ہم احکام دین میں بھی شوبازی دکھانے سے باز نہیں آتے ایسی حرکتوں پر روک لگانا ضروری ہے۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

بقرعید کے دن نزدیک تھے۔ محلے میں روزانہ ہی منڈی سے آیا ہوا ایک کے بعد ایک قربانی کا جانور اتر رہا تھا۔ یہ قدیم شہر کا ایک بہت پرانا محلّہ تھا۔ بقرعید کے دن نزدیک آتے تو دس پندرہ دن پہلے ہی پوری گلی کی صفائی کی جاتی گھروں کے سامنے گاڑیاں و موٹر سائیکل کھڑی کرنے پر پابندی لگا دی جاتی۔ قربانی کے جانوروں کے آرام کے لیے بالوٹی ڈال دی جاتی۔ انہیں دھوپ سے بچانے کے لیے کوئی چادریں ڈال کر سائبان بنا رہا ہوتا تو کہیں رنگ برنگ قناتیں سایہ فگن ہوجاتیں۔ گھروں سے کرسیاں، چارپائیاں اور پنکھے نکال کر باہر لگا لیے جاتے۔ بچوں کے ساتھ محلے کے بزرگ بھی فجر کی نماز کے بعد جو ذرا دیر کو گھر سے ہوجاتے تو گھنٹے دو گھنٹے کی چھٹی سمجھو۔ ان دنوں صبح سے شام تک بات چیت کا موضوع قربانی کے لائے گئے جانوروں کا حسب نسب۔ عمر، رنگ۔ وزن اور قیمتوں کے گرد ہی گھومتا رہتا۔ بلاشبہ یہ

حویلی میں گھستا چلا گیا۔ وہاں اس نے خان صاحب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ جب وہ اسے ہتھکڑیاں پہنا رہا تھا تو میں دلاور کے پیچھے ہی موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر خان صاحب نے کہا۔ "آج تو بچ گئی ہے لیکن جیل سے آکر میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تیرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

"جیل سے واپسی کے بارے میں اب سوچنا بھی نہیں۔" دلاور نے کہا۔ "جیل سے تم سیدھے پھانسی کے پھندے پر جاؤ گے۔" دلاور کے لہجے میں پوری کائنات کی نفرت تھی۔

"بڑے مجرم کو تو گرفتار کرلیا لیکن اس کے ہر جرم کا شریک اب تک آزاد ہے۔" میں نے گارڈ کی جانب اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے گارڈ کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور ایس ایچ او کو ہدایات دیں کہ یہ دونوں قاتل ہیں ان کی خوب خاطر مدارات کرنا۔

خان صاحب اور ان کے گارڈ کو ایس ایچ او اپنے ساتھ لے گیا۔ میں ابا اور وسعت بھائی کے ساتھ اپنے گھر آگئی جہاں گھر کے باہر ایک ہجوم جمع تھا لیکن ابا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ "اب بنی پلوشہ ہمیں اپنی پوری کہانی سناؤ کہ تم پر کیا بیتی اور تم ایس پی دلاور کے پاس کس طرح پہنچیں؟"

میں نے پوری داستان انہیں سنادی جسے بعد میں ابا نے ٹکڑے ٹکڑوں میں گاؤں والوں کو سنائی اور اس کے بعد گاؤں میں جیسے انقلاب آگیا۔ لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا شروع کردیا اور وہ قاتل کنواں بھی گاؤں والوں نے بند کروادیا۔

ابا بڑے فخر سے میری تعریفیں کرتے کہ دیکھا میری بچی نے کیسے ہم سب کی آنکھوں سے روایت کی پٹی ہٹائی پھر انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں ایم اے کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں نے اردو لٹریچر میں داخلہ لیا تھا کہ دلاور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رشتہ لے کر آگیا۔ عادل کا رشتہ تو اسی دن ابا نے ختم کردیا تھا جب خالہ نے عادل کا گدلا پانی دکھ کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کو اس ناپاک لڑکی سے بچایا۔"

دلاور کا رشتہ آیا تو ابا نے مجھ سے میری مرضی معلوم کی تو میں نے کہا۔ "ابا آپ جہاں کہیں گے شادی کرلوں گی لیکن اس بار میری شرط ہوگی کہ شادی ایم اے کرنے کے بعد ہی ہوگی۔"

ابا نے دلاور اور اس کی ماں کے سامنے یہ شرط رکھی تو وہ فوراً ہی تیار ہوگئے لیکن اصرار کیا کہ شادی بعد میں ہو لیکن منگنی کی رسم اسی ہفتہ ہونی چاہیے اس پر نہ ابا کو اعتراض تھا نہ مجھے۔

منگنی کے بعد ایک روز میں نے وسعت بھائی سے کہا اس روز آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن جھجک سے رک گئے تھے تو وہ ہنسنے لگے۔ "اب چھوڑو ان باتوں کو رات گئی بات گئی۔" لیکن میں نے جب اصرار کیا۔ تو بولے۔ "میں اس وقت تم سے تمہاری ہونے والی نند کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"تو کیوں نہیں کی۔" میں نے کہا اور وسعت بھائی ہنس دیے۔

"تب بھی تم سے مدد چاہنے والا تھا اب بھی مدد مانگ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا اور میں نے اگلے روز ایس پی صاحب کو جامعہ بلوایا۔ "والد کی تمام حرکات سے واقف ہونے کے باوجود وسعت یہ رشتہ چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ وہ میری بہن کو بھولے سے بھی اس کے باپ کا طعنہ نہ دے۔"

میں نے دلاور کا پیغام وسعت بھائی تک پہنچایا تو انہوں نے کہا۔ "تمہارا ہونے والا شوہر کیا مجھے اتنا گھٹیا سمجھتا ہے میں تو اس کا قائل ہوں کہ باپ کے گناہوں سے اولاد کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

اسی ہفتہ وسعت بھائی کی منگنی ہوگئی اور ہم دونوں کے ایم اے کرنے کے بعد ہمارے نکاح ہوگئے۔ دلاور کی بہن ہمارے یہاں آگئی اور میں حویلی منتقل ہوگئی جو خان صاحب کی پھانسی کے بعد دلاور اور اس کی والدہ کے نام منتقل ہوگئی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد میری لیکچرار کی نوکری ہوئی۔ اب میں صبح کالج جاتی ہوں۔ وہاں سے واپسی پر ساس کا ہاتھ بٹاتی ہوں اور اے ایس پی دلاور کے لیے ان کے من پسند کھانے بناتی ہوں۔ نماز کی پابند میں پہلے بھی تھی لیکن اللہ کی ان مہربانیوں کے بعد اور زیادہ پابندی سے نماز پڑھتی ہوں۔ اس کی رحمتوں کا کچھ تو حق ادا کرسکوں۔

آج ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں ایک میٹرک پاس لڑکی موجود ہے۔ ایک دیے سے نہ جانے کتنے دیے روشن ہوگئے ہیں۔

++

خلوصِ نیت

جنابِ من

سلام تہنیت!

ایک ایسی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جو بہت مشہور ہے کیونکہ اس واقعہ کی خبریں اخبار و ٹی وی پر بہت چلی تھیں۔ اس سچ بیانی پر غور ضرور کریں کہ ہم احکام دین میں بھی شوبازی دکھانے سے باز نہیں آتے ایسی حرکتوں پر روک لگانا ضروری ہے۔

محمد ظفر حسین

(کراچی)

بقرعید کے دن نزدیک تھے۔ محلے میں روزانہ ہی منڈی سے آیا ہوا ایک کے بعد ایک قربانی کا جانور اتر رہا تھا۔ یہ قدیم شہر کا ایک بہت پرانا محلہ تھا۔ بقرعید کے دن نزدیک آتے تو دس پندرہ دن پہلے ہی پوری گلی کی صفائی کی جاتی گھروں کے سامنے گاڑیاں و موٹر سائیکل کھڑی کرنے پر پابندی لگادی جاتی۔ قربانی کے جانوروں کے آرام کے لیے کوئی پلاسٹک ڈال دی جاتی۔ انہیں دھوپ سے بچانے کے لیے کوئی چادریں ڈال کر سائبان بنا دیا جاتا تو کہیں رنگ برنگ کے قمقمے سایہ فگن ہوجاتی۔ گھروں سے کرسیاں، چارپائیاں وغیرہ نکال کر باہر لگا لیے جاتے۔ بچوں کے ساتھ بڑے بھی فجر کی نماز کے بعد جو باہر کو نکلتے تو رات گئے تک گھر کی چوکھٹ نہ دیکھتے۔ ان دنوں صبح سے شام تک بحث چیت کا موضوع قربانی کے لائے گئے جانوروں کا حسب نسب، عمر، رنگ، وزن اور قیمتوں کے گرد ہی گھومتا رہتا۔ یہ شبہ

ایک ایسا مذہبی تہوار ہے۔ جس کا مزہ صرف اپنے ملک میں ہی ہے۔

محلے بھر کی گاڑیوں کے لیے ایک عارضی پارکنگ گلی سے متصل روڈ پر منتقل کر دی گئی تھی۔ یہ گلی ویسے ہی بہت تنگ تھی۔ محلے داروں کی اکثریت نے اپنے گھروں کو مزید آگے تک بڑھا کر گلی کو تنگ کر دیا تھا۔

ہمیں یہاں بسے ہوئے تقریباً تیس پینتیس سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ جن بچوں کو ہم نے گودوں میں کھلایا تھا۔ اب ہمارے سامنے ان کے چھوٹے چھوٹے شریر بچوں کی فوج اس گلی میں دوڑتی بھاگتی ہنستی چلاتی نظر آتی۔

آمنے سامنے کے گھر ملا کر کوئی سو دو سو گھروں کا محلہ تھا۔ ان تیس سالوں میں کھیلتے کودتے ایک ساتھ اسکولوں میں پڑھتے ان میں سے کئی بچے بچیوں کی آپس میں شادیاں بھی ہو گئیں۔ یہاں کئی خاندان ایسے آباد تھے جن گھرانوں کے اس محلے میں آنے کے بعد آپس میں رشتہ داریاں قائم ہو چکی تھیں۔ پڑوسی کا رشتہ قرابت داری میں بدل چکا تھا۔

شریف صاحب بھی اس محلے کے پرانے باسیوں میں سے ایک تھے۔ ہر سال ہی عید قربان پر قربانی کا خصوصی اہتمام کرتے۔ اس دفعہ بھی شریف صاحب کے گھرانے کی بقر عید بہت خاص ہونے والی تھی۔ اس سال عید پر شریف صاحب کا قربانی کا جو جانور تھا اس جیسی قربانی شاید اس پورے محلے بلکہ اس علاقے میں نہ کسی نے دیکھی نہ سنی تھی۔ شریف صاحب کاروباری شخصیت تھے۔ خاندانی طور پر سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ کئی سالوں سے محلہ کمیٹی کے صدر اور یونین کونسلر جیسے عہدوں پر بھی فائز رہنے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ ان جیسوں کے بارے میں ہی کہا جاتا ہے کہ جن کے درختوں پر نوٹ لگے ہوتے ہیں۔ جب ضرورت ہوئی توڑ لیے۔ خیر سے کاروباری اور اوپر سے ٹھیکیداری اور سیاست سے شغف الگ۔ اب گھر میں نوٹ نہیں برستے تو کیا آنگن میں لگے جامن کے درختوں کے خزاں رسیدہ پتے گرتے..... خیر بغیر دیکھے سنی سنائی باتوں پر یقین کرنا ٹھیک نہیں مگر اس دفعہ کی عید کا ماجرا سنی سنائی بات نہیں۔ آنکھوں دیکھا حال تھا۔

☆☆☆

اسی شہر کے ایک علاقے میں شریف صاحب کے ہم زلف رحمان صاحب بھی قیام پذیر تھے۔ رحمان صاحب کا ماشاءاللہ اچھا خاصہ کیٹرنگ کا کاروبار اور خوشحالی تھی۔ یہ صاحب بھی سیاست کے میدان میں اکثر زور آزمائی کرتے رہے تھے۔ کئی بار کونسلر شپ کے لیے دعوے دار رہے۔ ان کی شریف صاحب سے رشتہ داری کے باوجود سیاسی رسہ کشی چلتی آ رہی تھی۔ شریف صاحب شروع سے ایک خصوصی سیاسی پارٹی کی حمایت کرتے چلے آ رہے تھے اور رحمان صاحب ان کی مدمقابل دوسری پارٹی کے گرویدہ تھے۔ دونوں پارٹیاں تگڑی تھیں۔ رشتہ داری ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے۔ مقابلہ بازی اور دکھاوا ان دونوں صاحبان کے طرز زندگی کے ہر معاملات میں جھلکتا۔ ہر عید پر ان کے گھروں میں خاص نسل کے بکرے، بچھڑے یا بچھیا قربانی کے لیے لائی جاتی اس لیے شریف صاحب اور رحمان صاحب میں ہر سال قربانی کے جانوروں کو لے کر بھی اچھا خاصہ مقابلہ چل پڑا تھا۔

شریف صاحب گزشتہ کئی سالوں سے روایتی جانوروں سے ہٹ کر ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت، وزنی اور مہنگا جانور لاتے جس کے چرچے پوری گلی محلے میں ہوتے۔ اعلیٰ نسل کا یہ جانور خاص ہوتا۔ جس کی وجہ سے علاقے کے تمام لوگوں کو شریف صاحب کے گھر آنے والے قربانی کے جانور کا انتظار رہتا۔ ٹھیک اس طرح رحمان صاحب بھی اعلیٰ نسل کے بکروں سے لے کر مہنگا اور وزنی قربانی کا جانور لے کر آتے اور شریف صاحب کی طرح ہر سال ان کے گھر آنے والے جانوروں کی بھی شہرت خاندان بھر کے ساتھ پورے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کئی دن پہلے آنے والے ان جانوروں کے لیے خصوصی ٹینٹ لگا دیے جاتے۔ برقی قمقموں کا انتظام کیا جاتا۔ محلے کے بچوں کو رات گئے کھیلنے کودنے کا موقع ہاتھ آ جاتا۔ ایک جشن کا سماں ہوتا۔ پڑوسی۔ رشتہ داروں کی ایک فوج ہوتی جو روز شام کو ان خوبصورت جانوروں کا دیدار کرنے جوق در جوق چلے آتے اور اکثر چھٹی والے دن محلے سے بیاہی گئی بیٹیاں خاص طور پر اپنے مجازی خدا اور بچوں کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کرنے میکے کا رخ کرتیں۔ اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ قربانی کے جانوروں کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی وڈیو اور سیلفیاں بھی بنائی جاتیں۔

☆☆☆

چند سالوں سے شہر میں ایک عجیب رسم چل پڑی تھی۔ لوگ باگ نے قربانی کے جانوروں کو گھر کی چھتوں پر پالنا شروع کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس کا ایک بڑا سبب شہروں میں جگہ کی کمی کا ہونا تھا مگر بات چھوٹے جانوروں تک محدود ہو تو پھر بھی ٹھیک تھا۔ بکرے، مرغیاں، کبوتر کے ساتھ لوگوں نے

گھر کی چھت پر گائے بچھڑے پالنے شروع کر دیے۔ اب عید سے کچھ دن قبل جب یہ قربانی کے بھاری جانور کرین کے ذریعے اترتے تو پورے علاقے میں شور مچ جاتا۔ یہ بھی دیکھنے کی چیز ہوتا۔ کس طرح ایک بھاری بھرکم گائے بچھڑے کو بذریعہ کرین اتارا جاتا۔ ان کے اترنے کا ڈراما دیکھنے پورا محلہ ہاتھ میں موبائل لے کر امڈ آتا۔ سوشل میڈیا کے لوگ موجود ہوتے۔ ٹی وی چینل والے بھی کہاں پیچھے رہتے وہ بھی آ دھمکتے۔ ایک طرف صاحب جانور اور گھر کی بوڑھی نانی دادیوں سے لے کر دو ڈھائی سال کے بچوں کے تاثرات ریکارڈ کیے جا رہے ہوتے تو دوسری طرف محلے والوں کے بھی انٹرویو چلتے۔

قربانی کے جانوروں کے ساتھ محبت کا برتاؤ اور ان کی خدمت کرنا بہت احسن عمل ہے مگر اس میں ریاکاری کا عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کی نظر میں قربانی دکھاوے کا نام نہیں۔ یہ خالص نیت اور نیک ارادے کا کام ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت کی پیروی۔ اللہ کی رضا کے لیے خوشی سے اپنی حیثیت کے مطابق بہترین جانور کی قربانی ہی اصل پیغام ہے اس میں اگر دکھاوا شامل ہو جائے تو اللہ کو نہ تو قربانی کے جانور کا گوشت پہنچتا ہے نہ اس کا خون۔ اللہ اپنے بندے کی خالص نیت کو دیکھتا ہے۔

☆☆☆

پچھلے سال بقر عید کی بات تھی۔ رحمان صاحب بھی گزشتہ ایک سال سے ایک خوبصورت نسل کی بچھیا اپنے گھر کی چھت پر پال رہے تھے۔ بچھیا کی کھلائی پلائی اور خصوصی خوراک کی بدولت بچھیا نے خوب وزن بڑھا لیا تھا۔ شریف صاحب کے لائے ہوئے اعلیٰ نسل بچھڑے کی خوبصورتی۔ ڈیل ڈول اور وزن کے باوجود جب رحمان صاحب کی یہ بچھیا آسمان سے اتر کر زمین پر تشریف فرما ہوئی تو شریف صاحب کے ہیوی ویٹ بچھڑے پر بھاری پڑ گئی۔ علاقے بھر میں واہ واہ۔ اور تحسین کا شور مچ گیا۔ اس دفعہ رحمان صاحب کے گھر کی چھت سے ..... بچھیا کے ذرا اہتمام سے اترنے کا منظر بھی دیکھنے کی چیز تھا۔ کئی دن بعد تک سوشل میڈیا پر بچھیا کے آسمان سے زمین پر پاؤں پڑنے کے چرچے ختم نہیں ہوئے تھے۔ انٹرویو پر انٹرویو چل رہے تھے۔ بچھیا نے کتنا عرصہ زمین پر اور کتنا عرصہ چھت پر گزارا۔ کیا کھاتی تھی۔ کب سوتی تھی۔ بچھیا کے مزاج۔ عادات اور اٹھنے بیٹھنے لیٹنے پر یوں بات کی جا رہی تھی جیسے وہ کوئی مشہور شخصیت تھی یا شاہی خاندان سے اس کا تعلق ہو۔ ویسے ایک بات حقیقت بھی تھی۔ وہ گھر کا فرد بن گئی تھی۔ گزشتہ ایک سال میں گھر کے تمام افراد اس سے بے انتہا محبت کرنے کے ساتھ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ گھر کے بچے چھت پر اس کے ساتھ ساتھ کھیلتے۔ یہ بچھیا اپنے بھرپور وزن اور خوش خوراکی کی بدولت زیادہ تر چھت پر ٹکٹکی باندھ کر جیسے شاہی تخت پر جلوہ افروز رہتی۔ جگالی کرتی یا لیٹ جاتی۔ گھر کے چھوٹے بچے بھی ساتھ ساتھ اس پر لیٹ جاتے۔ بچھیا کو بھی ان بچوں سے بڑی انسیت تھی جن کے ہاتھوں صبح ناشتے میں دیسی گھی کے پراٹھے کھا کر بڑی ہوئی تھی۔ بچھیا کی خصوصی کھلائی پلائی۔ اٹھان اور وزنی ہونے میں بلاشبہ کوئی شک نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ جس دن عید کے موقع پر بچھیا ذبح ہوئی تو گوشت کے ساتھ من دو من سے زیادہ چربی نکلی۔

اپنے ہم زلف رحمان صاحب کی دیکھا دیکھی شریف صاحب نے اس دن ہی ارادہ کر لیا تھا کہ اگلے سال ان کے گھر کی چھت سے بھی اس طرح قربانی کا کوئی جانور نہیں اترا تو شاید برادری اور خاندان میں ان کی ناک کٹ جاتی۔

انہوں نے بقر عید کے فوراً بعد ہی ایک اعلیٰ نسل اور مناسب عمر کا بچھڑا لے کر اپنی چھت پر پالنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایک سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا تھا۔ شریف صاحب کی چھت پر بچھڑے نے کیا خوب رنگ و روپ نکالا تھا۔ یہ بچھڑا بھی اپنی خصوصی خوراک اور دیکھ بھال کی بدولت ماشاءاللہ دیکھنے کے لائق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جانوروں کو ایک مخصوص ڈھب اور قدرتی ماحول میں پیدا کیا ہے۔ انسان کی طرح جانوروں کو بھی رہنے کے لیے کھلی جگہ۔ چہل قدمی اور چلنے پھرنے کے لیے فطری ماحول چاہیے۔ اس بچھڑے کی کل کائنات ایک دو سو گز کی چھت تھی۔ سارا دن کھانا اور جگالی کرنا۔ ایسے نمائشی جانور دیکھنے میں تو بہت اچھے نظر آتے ہیں مگر ان کے گوشت میں وہ طاقت اور غذائیت پیدا نہیں ہوتی جو کھلی آب و ہوا۔ ہری بھری فضا اور آزاد ماحول میں رہنے والے جانوروں میں ہوتی ہے۔ یہ دیکھنے میں تو بچھڑا ہی تھا مگر اللہ میاں کی گائے کہنا زیادہ مناسب تھا۔ انتہائی شرمیلا۔ گھر والوں سے بے حد مانوس۔ مگر گھر میں کوئی پڑوسی یا مہمان وغیرہ آ جاتے تو یہ اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھوں پر پلکوں کی لمبی جھالر گرا کر منہ ایک طرف پھیر لیتا۔ پھر کوئی ہزار اس کو پچکارتا۔ بھلا تا یہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں

کردیا۔ گھر والوں نے اس کی بھولی بھالی عادتوں پر اس کا نام ہی بھولا رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

شریف صاحب کے صاحبزادے حماد کی نسبت اسی گلی میں ماسٹر رفیق کے گھرانے کی صاحبزادی فریحہ سے طے ہو چکی تھی۔ بقر عید کے فوراً بعد شادی کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا۔ ماسٹر رفیق ایک کالج میں لیکچرار تھے۔ پانچ بچیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے۔ مہنگائی اور مسائل کے باوجود ماسٹر رفیق جیسے تیسے اچھے دنوں میں دن رات ٹیوشن کرکے اپنی رزق حلال کی جمع پونجی سے اپنی دو بچیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ماسٹر صاحب نے گھر میں اوپر کے پورشن میں ایک چھوٹا سا ٹیوشن سینٹر کھول رکھا تھا۔ ٹیوشن سینٹر اچھا چل رہا تھا۔ فریحہ بھی گریجویشن کرکے ایک اچھے اسکول میں پڑھانے کے ساتھ باپ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ بقایا دو چھوٹی بہنیں ابھی بالترتیب آٹھویں اور نویں میں پڑھ رہی تھیں۔

فریحہ اور حماد ایک ہی اسکول میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک گلی میں کھیل کود کر جوان ہوئے۔ گلی کے بیشتر بچوں کی طرح حماد میٹرک کے بعد ماسٹر رفیق کے گھر دو سال ٹیوشن پڑھتا رہا۔ حماد نے اپنی پسند گھر والوں کے سامنے رکھی تو گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اپنے سامنے کی دیکھی بھالی پڑھی لکھی بچی تھی۔ سوائے ایک بات کے کہ ان لوگوں کا معیار زندگی اور رکھ رکھاؤ شریف صاحب کے گھرانے سے بہت مختلف تھا۔ شریف صاحب کے گھر پیسے کی ریل پیل۔ آئے دن دعوتیں۔ ہفتے میں دس پندرہ ہزار کا کھانا باہر کھالینا عام سی بات تھی۔ ادھر ماسٹر رفیق کا گھرانا سیدھا سادہ۔ گھر میں گوشت مرغی کے ساتھ دال سبزی بھی صبر شکر ادا کرکے کھالی جاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ ماسٹر رفیق نے اپنی بچیوں کو کسی چیز سے محروم رکھا ہوا تھا۔ والدین کی تربیت ایسی تھی کہ باہر سے مہنگے کھانوں کے بجائے گھر ہی میں سلیقہ شعاری کی بدولت ہر طرح کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو جایا کرتے۔

فریحہ نے اپنی سگھڑ والدہ سے بریانی۔ شامی کباب۔ قورمے سے لے کر پائے نہاری اور حلیم بنانا سیکھ لیے تھے اور جب کوکنگ کی کلاسز شروع کیں تو اب چائنیز کھانے۔ مشہور اٹالین ڈشز۔ مزیدار کیک پیسٹری سے لے کر پیزا برگر سب ہی چیزیں گھر میں آسانی سے بنالیتی۔ فریحہ نے آرڈر پر کیک بنانا شروع کیے تو دیکھتے ہی دیکھتے معقول تعداد میں اس کے کئی کسٹمرز بن چکے تھے۔ ماسٹر رفیق بھی بچیوں کے شوق کی راہ میں کبھی دیوار نہیں بنے۔ بیٹیاں عزت سے محنت کرکے باپ کا ہاتھ بٹا رہی ہوں تو ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے۔

حماد نے گریجویشن کے بعد ایم بی اے کرنے کے ساتھ ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری کرلی تھی۔ تنخواہ بھی اچھی بھلی تھی۔ گھر والوں نے بھی خاندان سمیت کئی کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں مگر حماد کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کرسکے۔ شریف صاحب کو بھی بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ ماسٹر رفیق کے خاندان کو برسوں سے جانتے تھے۔ فریحہ اور حماد بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو بھی حماد پسند تھا۔ سامنے کا بچہ اور ان کا شاگرد تھا۔ طبیعت اور عادات کا بھی اچھا تھا۔ اس رشتے میں کوئی ظالم سماج بیچ میں تو نہیں آیا ما سوائے اوّل الذکر مسئلہ یعنی دونوں خاندانوں کے رکھ رکھاؤ میں اچھا خاصہ فرق تھا مگر حماد کا رشتہ آیا تو ماسٹر رفیق کے لیے بھی سوچنے کے لیے کچھ خاص نہ تھا کہ اوپر تلے ابھی تین بچیاں باقی تھیں۔ دونوں گھرانوں میں بقر عید کی تیاریوں کے ساتھ شادی کی تیاریاں بھی زور شور سے جاری تھیں۔

☆☆☆

عید سے دس پندرہ دن پہلے کی بات تھی۔ حماد اور فریحہ کی شادی کے دن نزدیک تھے۔ دونوں کے گھر والے روزانہ ہی ایک دوسرے کے گھر کسی نہ کسی کام سے چکر لگالیا کرتے۔ آنا جانا لگا ہوا تھا۔ حماد اور فریحہ کا آزادانہ ملنا جلنا تو نہیں تھا مگر فون پر مستقل رابطہ رہتا۔ فریحہ کے گھر ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی بقرعید پر قربانی کے لیے ایک عدد بکرا لانے کی تیاری تھی کہ باتوں ہی باتوں میں حماد نے فریحہ سے ایک فرمائش کرکے ماسٹر صاحب کے گھرانے کے لیے آزمائش کھڑی کردی۔

حماد کے مطابق اس دفعہ شریف صاحب کے گھر والے چاہتے تھے کہ فریحہ کے گھر بکرے کی جگہ بڑے جانور جیسے بچھیا یا بچھڑے کی قربانی کا جانور لایا جائے۔ شادی کے سلسلے میں گو کہ ابھی تک حماد کے گھر سے نہ ہی جہیز یا کوئی بلا وجہ کی فرمائش کی گئی تھی مگر قربانی کے حوالے اس عجیب منطق نے فریحہ کی فیملی کو ایک مشکل میں ڈال دیا تھا۔ بقول حماد اس دفعہ پورے خاندان کی نظریں حماد کے ہونے والے سسرال اور ان کے رکھ رکھاؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ شریف صاحب کا خاندان بقرعید پر ہونے والی دکھاوے کی دوڑ میں اپنے بیٹے کے سسرال کو ہر قیمت پر اپنے ہم پلہ دکھانا چاہتے تھے۔

☆☆☆

ماسٹر رفیق نے بچی کی شادی کی تیاریوں میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک چیز منتخب کی تھی۔ بچیوں کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کے لیے ہی تو وہ اتنی محنت کرکے پیسے جمع کرتے آرہے تھے پھر چند سالوں سے فریحہ بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کمیٹیاں ڈال کر اچھی خاصی رقم جوڑلی تھی مگر اب یہ عجیب و غریب مطالبہ سن کر فریحہ کو سخت کوفت ہوئی تھی۔ اس نے واضح طور پر حماد سے اس مطالبے پر بیزاری کا اظہار کیا۔ حماد ایک کھلے ذہن کا پڑھا لکھا نوجوان تھا مگر کچھ چیزیں گھریلو ماحول کی بدولت فطرت میں آہی جاتی ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر والوں کے اس مطالبے کا ذکر کر بیٹھا تھا۔

ماسٹر رفیق بھی یہ مطالبہ سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ وہ دینی معاملات اور قربانی میں اسراف کے قائل بھی نہ تھے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کے عادی مگر یہاں بچی کے مستقبل کا معاملہ تھا۔ ہزار کوششوں اور راسخ عقیدے کے باوجود سماجی دباؤ میں آکر اب ایک بچی کے باپ بن کر سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ چند ایک سمجھدار دوستوں سے مشورہ کیا تو سمجھانے والوں کی اکثریت نے دنیا داری کا ہی مشورہ دیا تھا۔

یہ سب باتیں رشتہ جوڑنے سے پہلے سوچ لینی چاہیے۔ اب دریا کے مخالف چلنا درست نہیں۔ ایک دوست نے مشورہ دیا!

اگر ایک بات مان لوگے تو پھر ان کی ہر بات مان لینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہے گا۔ بہتر ہے کہ صاف انکار کردو۔ ایک مہربان نے رائے دی......!

مگر بچیوں کے مجبور ماں باپ کیا کریں؟ حالات سے مقابلہ کریں! مثالی خاندان اور میچنگ کے رشتے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنی بچیوں کو یونہی گھر بٹھا کر بوڑھا کردیں؟

دیکھا جائے تو بچیوں کی اچھی تعلیم و تربیت اور مثالی پرورش اس مجبوری کا حل ہے مگر جن گھروں میں چار پانچ بچیوں کی شادی ایک باپ کے کندھے پر ہو وہاں حالات سے مقابلے میں کبھی جیت تو کبھی ہار مقدر ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں رشتوں کا کال ہو۔ بچیوں کے اچھے رشتے ہی بڑی مشکل سے آتے ہوں وہاں مقدر سے لڑنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں۔

فریحہ نے حماد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

آپ نے پیرس اگر دیکھا نہیں تو اس شہر کی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی۔ آپ کو واضح طور پر دکھائی دے گا کہ پیرس میں یوں تو بہت اونچی اونچی عمارتیں ہیں لیکن وسطی پیرس میں ایسی اونچی اونچی عمارتیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پیرس کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ایسی پلاننگ کی گئی ہے...بلکہ اس کی وجہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تیرہویں صدی میں (جہاں اب پیرس آباد ہے) جپسم اور چونے کے بہت بڑے بڑے ذخائر تھے اور کان کنی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے لاتعداد سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ جو بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ وہاں ایک طرف تو سرنگوں سے کام لیا جارہا تھا۔ اور دوسری طرف پیرس شہر کی بنیادیں رکھی جارہی تھی۔ عمارتیں بنائی جارہی تھی لیکن کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان سرنگوں کے جال کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سرنگوں کے اوپر ہی عمارتیں بنی شروع ہوگئیں۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا تھا۔ جب شاخ نازک پر آشیانہ بنایا جائے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ پھر کنگ لوئس کو تشویش ہوئی۔ اس نے ماہرین کی ایک ٹیم مقرر کی کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ بادشاہ سلامت پورا پیرس ہی خطرے میں ہے۔ اب اس عظیم الشان غلطی کی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی اسی لیے یہ طے پایا کہ سینٹرل پیرس یعنی وسطی پیرس میں اونچی عمارتیں نہ بنائی جائیں۔

مرسلہ: ندیم مرزا، حیدرآباد

لیے گھر کے تمام افراد کو گھر گھر دیکھ رہا تھا اور جب اس کو بیلٹ سے گزار کر فضا میں بلند کیا گیا تو آخری بار اس نے اپنی غزالی آنکھوں سے گھر والوں پر نظر ڈال کر نیچے سڑک پر دیکھا۔ یہ چھڑا پورا سال چھت پر انسانوں کے ہجوم سے دور ایک چھوٹی سی دنیا میں رہنے کا عادی تھا۔ شرمیلا اور بھولا۔ محلے والوں اور بچوں کے لیے بیشک یہ ایک شاندار نظارہ تھا مگر بھولا شاید عجیب محسوس کر رہا تھا، اس کو بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بلندی کا ڈر ایک طرف اور دوسری طرف یہ ریشمی بیلٹ اس کی چکدار کھال سے گزر کر گوشت میں کھبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

جن لوگوں کو بلندی سے خوف آتا ہے اگر وہ کبھی غلطی سے جھولے پر بیٹھ بھی جائیں تو بلندی پر جانے کے بعد جب جھولا زمین کی طرف آتا ہے تو نیچے دیکھ کر ان کا دل ڈوب جاتا ہے۔ یہی خوف چوپایوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ شریف صاحب کے دو منزلہ مکان کی چھت کو ملا کر زمین سے اس کی اونچائی کوئی تیس پینتیس فٹ بنتی تھی۔ بھولے نے بھی کانپتے ہوئے دل کے ساتھ نیچے کھڑے ہوئے جم غفیر کو دیکھا اور ڈر کے مارے آنکھیں موند لینا چاہی مگر ٹھیک اس وقت محلے کے بچوں اور نوجوانوں کی پرہجوم خلقت نے غضب کا شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بے انتہا وزنی بچھڑے جس کی پوری کائنات ایک چھت پر ختم تھی۔ اپنی غلافی شرمیلی آنکھوں سے زمین پر موجود عجیب و غریب دنیا کو دیکھا اور شاید خوفزدہ ہو گیا۔ اپنی حیوانی جبلت کے مطابق کسمسا کر ہوا میں ٹانگیں چلانا شروع کر دیں۔ ہوا میں ٹانگیں چلانے سے کرین کا توازن بگڑ سکتا تھا۔ بھولے کے دیو ہیکل وزن سے کرین کا بوم بھی لمحہ بھر تھرتھرا کر رہ گیا۔ کرین نے بھی ایک زوردار جھٹکا لیا تھا۔

بھولے نے حیوانی جبلت کے عین مطابق ہوا میں ٹانگیں چلانا شروع کیں تو کمر سے گزاری ہوئی بیلٹوں کا توازن بھی بگڑنا شروع ہوا۔ پلاسٹک اسٹائل میں بیلٹ کے گزارنے کا یہ طریقہ کار کسی بے جان یا ساکن وزن کے لیے تو اچھی درست تھا مگر جیتے جاگتے وزنی جانور کے لیے قطعی طور پر درست نہ تھا۔ بھولے نے بدک کر دیوانہ وار ٹانگیں چلائیں تو کرین کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔ کرین آپریٹر کا سارا دھیان کرین کو پلٹنے سے بچانے پر لگ گیا اور ادھر بھولے کی اگلی ٹانگیں بیلٹ سے آزاد ہو گئیں۔ بھولا اب فضا میں اپنی پچھلی ٹانگوں کے ساتھ بیلٹ کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ بھولے کا سر زمین کی جانب ہوا۔ جسم کا سارا بوجھ گلے نیچے پر پڑا تو اگلے ہی چند لمحوں میں بھولا بیلٹوں کی قید سے آزاد ہو کر تقریباً بیس فٹ اونچائی سے سر کے بل زمین پر آ پڑا۔

یہ ایک دلخراش لمحہ تھا۔ پوری گلی میں سناٹا سا چھا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب شریف صاحب نے بھولے کو خود میں پرسکون انداز میں بلند ہوتے دیکھ لیا تھا اور وہ مطمئن ہو کر چھت کی اندرونی سیڑھیوں سے اتر کر نچلی منزل کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے نیچے آنے تک ذرا سی دیر میں ہی حالات زیر و زبر ہو چکے تھے۔ شریف صاحب گھر کے داخلی دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ دھپ کی زوردار آواز کے ساتھ شریف صاحب کی عین آنکھوں کے سامنے ایک بھاری بھرکم وجود آسمان سے زمین پر آ گرا تھا۔ یہ قربانی کے جانور نہیں، شریف صاحب کی ریاکاری، دکھاوے، فخر اور غرور کا احساس تھا جو پل بھر میں مٹی میں مل چکا تھا۔ بچھڑا زمین پر گرا تو شریف صاحب کا سانس بھی جیسے ساتھ ساتھ ہی رک گیا تھا۔

تالیاں بجاتے۔ شور مچاتے بچے بڑے بھی دم بخود رہ گئے تھے۔ شریف صاحب کی چیخیں بلند ہوئیں تو سب کو ہوش آیا۔

جتنی دیر میں دوڑ کر سب پہنچے۔ وہاں بھولا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ یہ تحریر قلمبند کرتے ہوئے بھی دل دکھ رہا ہے کہ گردن کے بل گرتے ہی بھولے کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ ایک قربانی کا جانور جھوٹی شان اور ریاکاری کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ کچھ سمجھدار لوگوں نے اجازت لے کر فوراً ہی بھولے کی گردن پر چھری پھیر دی۔ ورنہ شریف صاحب اور ان کے گھر والے تو ہوش و حواس میں ہی نہیں تھے۔ بھولے نے آخری وقت تک اپنی شرم قائم رکھی تھی۔ گرنے کے بعد چلایا، نہ کوئی آواز نکالی۔ پہلے جان بوجھ کر گردن مڑوا لیتا تھا۔ اب گردن موڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، گردن ہی ٹوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

چار پانچ مکان کے بعد ماسٹر رفیق کا مکان تھا۔ کچھ ایسا ہی حال ان کا بھی تھا کیونکہ وہ بھی شادی کے لیے رکھے پیسوں سے ڈھائی لاکھ کا جانور لے آئے تھے جس کی وجہ سے انہیں بھی اپنی گردن ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں سورہ بقرہ کی آیت 264 یاد آ رہی تھی۔ ''اے ایمان والو...... اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرے۔''

++

آج مہندی کی تقریب تھی۔ کل اس کی بیوی بن کر ثانیہ نے اپنے گھر سے رخصت ہو کر اس کے گھر آنا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں خوشی کی بجائے غم نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ویران و اداس آنکھیں جنہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دولہا کی آنکھیں ہیں۔ آنکھوں میں دردی درد تھا۔

آخر میں ہی کیوں؟ ایک سوال اس کے سامنے ناگن کی طرح پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ یہ قلقاریاں یہ مسکراتے چہرے یہ ہنستے بجتے قہقہے اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ اس کی میت پر آ کر اسے مبارکباد دے رہے ہوں۔ہاں اس کی موت ہوئی تھی جیتے جی مار دیا گیا تھا اسے۔ اس کے جذبات کو بے دردی سے قتل کیا گیا تھا اس کا مان ٹوٹ گیا تھا اس کی خود اعتمادی کو روند دیا گیا تھا۔ اس کے خوابوں کی کرچیوں نے اس کی آنکھوں کو زخمی کیا تو ایک لہو رنگ آنسو اس کے پلکوں کی قید سے آزاد ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ آخر میں ہی کیوں؟

کھوٹ

محترم مدیر

سلام شوق!

زیر نظر سچ بیانی ایک ایسی دوشیزہ کی ہے جو عیاری و مکاری میں عمرو عیار کو بھی مات دے دے۔ اس نے کس خوبصورتی سے دو مردوں کو بے وقوف بنا رکھا تھا۔ عورت کے صبر کی مثال ہے یہ سچ بیانی۔

عابدہ صبا

(کرک، کے پی کے)

اب تک اس نے لڑکیوں کو اپنے باپ کی پگڑی پران کی عزت کی لاج رکھتے ہوئے قربان ہوتے ہوئے دیکھا تھا مگر وہ ایک مرد تھا۔ ساڑھے چھ فٹ کا ایک بھرپور جوان جسے قربانی کے تختے پر لٹا دیا گیا تھا اور ہاتھ پیر مارنے کا حق بھی چھین لیا گیا تھا۔

کیوں؟ کس لیے؟ کس کے لیے؟ سوالوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جو سانپوں کی طرح اسے ڈس رہا تھا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ آخر اس نے کب اپنے والدین کو تکلیف دی تھی؟ کب نافرمانی کی تھی؟ کیا اس کا فرماں بردار ہونا اس کی غلطی تھی جس کی سزا اس کے والدین نے اس کی خوشیوں کو روند کر اسے دی۔ اس نے درد سے پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑا اور رو پڑا تھا۔

☆☆☆

دو پیار کرنے والے دل پاس بیٹھے تھے مگر پھر بھی ماحول پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی اتنی گہری ہو چلی تھی کہ ان کے دھڑکتے دلوں کی آواز ان کے اپنے کانوں کے پردوں پر ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اور ارتعاش بھی گویا یوں جیسے بہت ساری ہوائیں مل کر بین کر رہی ہوں۔ ماتم منا رہی ہوں۔ حق نواز کے کشادہ کندھے جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں جو پہلے ہر وقت ساجدہ کے چہرے کا والہانہ طواف کرتی نظر آتی تھیں آج زمین پر ٹکی ہوئی تھیں یوں جیسے کسی غیر مرئی نقطے کو ڈھونڈنے کی کوشش میں لگی ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ساجدہ ہی کچھ کہہ کر اس خاموشی کو توڑے۔ مگر ساجدہ تو جیسے آج گونگی ہوگئی تھی۔ بس ایک ٹک اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھے جا رہی تھی۔ بالآخر حق نواز نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"ساجدہ کچھ تو بولو۔"

"نکاح مبارک ہو......" اسے ساجدہ کی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

"ساجدہ خدا کے لیے مزید شرمندہ مت کرو۔"

"کیوں کیا غلط کہا میں نے مبارک باد ہی تو دی ہے۔"

"میں مجبور تھا۔" وہ کرلایا تھا۔

"مرد کبھی مجبور نہیں ہوتے حق نواز صاحب۔" ساجدہ نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔ حق نواز گنگ رہ گیا تھا ساجدہ کے لہجے میں جو کچھ تھا وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا اماں مجھے اس طرح مجبور کر دے گی۔ میں کیا کرتا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تو اب یہاں مجھے کیا بتانے آئے ہیں آپ؟"

"ساجدہ مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرو۔"

"کیا سمجھانا رہتا ہے اب؟"

"ساجدہ۔" حق نواز نے بے چارگی سے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ سمجھائیں مجھے۔ بتائیں کیا۔ یہ نکاح جھوٹا ہے یا آپ کے کیے گئے تمام وعدے اور آپ؟" ساجدہ پھٹ پڑی۔

"ساجدہ میں نے تم سے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا کی قسم میری محبت سچی ہے۔" وہ تڑپ اٹھا تھا۔

"بس کر دیں، اب بس کر دیں، بہت ہوا۔" ساجدہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی۔ "اور کتنے جھوٹ بولیں گے آپ۔"

"ساجدہ میری بات تو سنو۔ اماں میرے پیر پکڑنے کو جھکی تھیں اور میں اس گناہ کا موجب نہیں بننا چاہتا تھا۔" حق نواز نے اسے کاندھوں سے تھامنا چاہا مگر وہ یوں بدک کر قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو اور بولی:

"مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ جائیں کوئی زندگی کی دہلیز پر اپنی آنکھوں میں خوابوں کی چادر بچھائے آپ کی منتظر ہوگی۔ من مندر کی اس مورتی کو سجانے کے خواب ہمیں کبھی راس نہ آئے اس لیے اب ان سے توبہ کرنا ہی بہتر ہے۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔ حق نواز نے اس کے پیچھے قدم بڑھائے تو مڑے بغیر بولی۔ "میرے پیچھے مت آیئے گا ہمارے راستے الگ ہیں۔ مجھے عزت بننا تھا کھلونا نہیں۔"

وہ چلی گئی اور جیسے زندگی کے سارے ہی رنگ اپنے ساتھ لے گئی۔ سب کچھ اچانک ہی بدرنگ اور پھیکا ہو چکا تھا۔

حق نواز کو اس لمحے شازیہ اپنی خوشیوں کی قاتل لگی اور اس نے شازیہ سے اپنا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اس کے دل میں شازیہ کے لیے نفرت کا ایک الاؤ دہک اٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا نہ شازیہ ہوتی اور نہ ہی اماں ساجدہ کو بہو بنانے سے انکار کرتی۔ شازیہ اس کے چچا کی بیٹی، اس کے بچپن کی منگیتر تھی۔ جب تک وہ ساجدہ سے نہیں ملا تھا شازیہ میں اسے کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا لیکن ساجدہ سے ملنے کے بعد تو جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ ساجدہ سے والہانہ محبت کرنے لگا تھا۔ ایسے میں وہ کسی بھی صورت شازیہ کو اپنی بیوی کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جتنی بار بھی اس نے اماں سے ساجدہ کے بارے میں بات کی انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور اب تو آناً فاناً شادی بھی کروا دی تھی۔ جس کا خمیازہ اب شازیہ کو بھگتنا تھا۔ عمر بھر......

☆☆☆

دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا تو اس نے اپنا گھونگٹ ٹھیک کیا اور سر جھکا لیا، اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے کی دیوار توڑ کر باہر آجائے گا اور اپنے دیوتا کے قدموں میں بچھ جائے گا جسے وہ اب تک پوجتی آرہی تھی۔ جس دن سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی پیدائش پر اس کو چھ سالہ حق نواز کی گود میں دے کر کہا گیا تھا کہ "یہ تو میرے ناجو کی دلہن بنے گی۔" تب سے اس نے اپنی خاموش محبت کے پودے کو دن بدن پروان چڑھتے دیکھا تھا اور اب وہ پودا تناور درخت بن چکا تھا آج اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔ وہ لمحہ آگیا تھا جس کے سپنے بنتے بنتے اس کی آنکھوں میں جوت جل اٹھتے تھے اور نیند اپنی بے وقعتی دیکھ کر روٹھ جایا کرتی تھی۔ آج وہ ان لوگوں کو بھی دعا دینا چاہتی تھی کہ جن کی وجہ سے یہ ممکن ہوا۔ ورنہ معلوم نہیں کب تک یہ خاموش محبت اس کی نیندیں حرام کرے رکھتی۔

ارے یہ صوفے پر کیوں بیٹھ گیا۔ اوہ اچھا تھک گیا ہوگا یا پھر شاید سوچ رہا ہوگا کہ کیا بولوں۔ آپ بے شک نہ بولیں لیکن میں تو بولوں گی اپنی محبت کا ایک ایک رنگ دکھاؤں گی آپ کو۔ لیکن آپ مذاق تو نہیں اڑائیں گے نا۔ اگر آپ نے میرا مذاق اڑایا تو میں ناراض ہو جاؤں گی آپ پھر مناتے رہنا۔ وہ آنے والے طوفان سے بے خبر دل ہی دل میں خوبصورت خواب بن رہی تھی۔ اسی وقت حق نواز ایک دم سے صوفے سے اٹھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ پہلی بار اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ حق نواز نے اس کا بھاری کام دار دوپٹا کھینچا اور دور پھینک دیا وہ حق دق رہ گئی تھی۔ حق نواز کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔

"کیا سمجھتی ہو تم...... میرے دل کی دنیا اجاڑ کر میں تمہیں خوشی منانے دوں گا...... بھول ہے یہ تمہاری۔ حساب دینا ہوگا...... تمہیں، ہر لمحے کا حساب دینا ہوگا۔ جینا حرام کر دوں گا میں تمہارا۔ حق نواز کی نہ صرف آنکھیں بلکہ اس کی زبان بھی اس کی روح پر تازیانے برسا رہی تھی۔

"کیا لگا تھا تمہیں کہ تم میرے خوابوں کو مار دوگی... اور انہیں اپنی خوشیوں کے محل کی بنیادوں میں پرو کر خوشی کے شادیانے بجاؤں گی اور پھر بھی میں تمہیں خوشیاں منانے دوں گا...... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں جیتے جی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔ اور مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔"

وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھے جا رہی تھی مگر حق نواز نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بیڈ سے نیچے کھینچا۔ وہ گرتے گرتے بچی، وہ پھر سے پھنکارا۔ "میں نے کہا نا دفع ہو جاؤ اور مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور پھر واش روم کی طرف بڑھی مگر وہ پھر سے چیخ پڑا۔ "کہاں جا رہی ہو...... نکلو باہر ابھی اسی وقت۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟" وہ منمنائی۔

"مجھے کوئی پروا نہیں کسی کی بھی۔ نکلو ابھی اسی وقت۔" اس نے کمرے سے باہر اسے دھکیل دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن کمرے سے نکلتے وقت وہ ایک وجود سے ٹکرا گئی تھی سر اٹھا کر دیکھا تو وہ تائی اماں تھی۔ اس کی ساس۔

"کیا ہوا شازیہ بیٹا؟ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ کیوں غصے میں تھا؟"

"تائی اماں کیا آپ کو یاد ہے جب بابا زندہ تھے اور رات کو کہیں جاتے تھے تو دادی کتنا غصہ کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ رات کے اندھیرے میں کہیں نکل جائے تو رات کی سیاہی تقدیر میں اتر آتی ہے۔ تائی اماں شاید میرے بخت میں بھی سیاہی اتر آئی ہے۔ اماں میں سیاہ بخت ٹھہری۔" وہ خود پر ضبط نہ رکھ سکی اور رو پڑی۔

"نہ میرا بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ رب سوہنا تیرا بخت بلند کرے۔ میاں بیوی میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے تم دل چھوٹا نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تھکا ہوا ہو۔" تائی اماں نے کمزور سے لہجے میں جانے کے تسلی دی تھی۔

"تائی اماں خدا کا واسطہ ہے آنکھوں پر پٹی تو نہ باندھیں۔"

"بیٹا اب تو پٹی ہی باندھنی پڑے گی۔ اب واپس پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں تم جانتی ہو نا۔"

"ہاں تائی اماں جانتی ہوں اچھے سے جانتی ہوں۔" آنسوؤں کا گولا شازیہ کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

"بیٹا صبر کرو اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"تائی اماں جب ناکردہ پر بھی صبر کرنا پڑے تو؟"

"بیٹا ناکردہ پر ہی تو صبر کرنا پڑتا ہے، اسی کا تو پھل ملتا

ہے ورنہ کردہ پر تو سزا ملتی ہے۔'' تائی اماں نے اسے سمجھایا۔

''تائی اماں......'' اس کے الفاظ گم ہونے لگے تھے۔

''چل بیٹا۔ تھوڑی دیر میرے کمرے میں کمر سیدھی کر لے۔ کل سے تمہیں نہ صرف ایک اچھی بہو بننا ہے بلکہ شوہر کا دل بھی جیتنا ہے۔ بیک وقت دو محاذوں پر جدوجہد کرنے کے لیے تازہ دم ہونا ضروری ہے چل بیٹا۔ صبح تیرے گھر والے بھی آئیں گے۔ اور بیٹی کی اجڑی حالت ماؤں کو جیتے جی مار دیتی ہیں۔ چل میرا بیٹا۔'' تائی اماں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ورنہ شاید آج اس کا بکھر جانا یقینی تھا۔

☆☆☆

کمرے میں گہری تاریکی تھی، ان کے نصیبوں کی مانند۔ کمرے کے بیچوں بیچ پڑے پلنگ پر دو نفوس خاموشی سے لیٹے ماضی اور حال کے تعلق کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ دونوں کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ آخر غلطی کہاں ہوئی؟ جن میں سے سوال کا جواب شاید صرف ایک کے پاس تھا، تائی اماں کے پاس، لیکن دونوں ہی تاویلیں اور توضیحات دے کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ایک طرف تائی اماں تھی یہ سوچ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف جا کر کہیں اس نے شازیہ کا مستقبل تباہ تو نہیں کر دیا اور کہیں اپنے بیٹے کی خوشیوں کا خون تو نہیں کر دیا۔ وہ شازیہ کے آنسوؤں کے لیے اپنے آپ کو گناہ گار سمجھ رہی تھی۔ جب کہ دوسری طرف شازیہ تھی جو اپنے ناکردہ گناہ کو ڈھونڈنے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس کی سزا اسے اس کے دیوتا نے دی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں اتنی غرق تھیں کہ کمرے میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی گھڑی کی ٹک ٹک اور وہ بھی انہیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہاں تو شازیہ پگلی کیا یہی تھی تمہاری وہ راجدھانی جس پر راج کرنے کے تم نے خواب دیکھے تھے۔ پیا من کے قلعے میں رانی بننے چلی تھی، لو جی بن گئی رانی۔ تمہیں تو پہلے ہی دن قلعے کی فصیل پر مصلوب کر دیا گیا، نہ کوئی مقدمہ چلا نہ کوئی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ بس دعویٰ دائر ہوا، اور سزا سنا دی گئی اور انصاف تو دیکھو دعویٰ کرنے والا، اس کے خلاف گواہی دینے والا، فیصلہ کرنے والا اور مصلوب کرنے والا سب ایک ہی شخص ٹھہرا۔ وہی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کی زندگی میں رب کی جانب سے ملنے والا بڑا انعام ہے۔ وہ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس کا محافظ ہے وہی اسے زمانے کی تھپیڑوں کے حوالے کر رہا تھا۔ وہ جس کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ اس کے سارے دکھ، ساری محرومیاں سمیٹ لے گا، وہی اس کی جھولی میں عمر بھر کی محرومی ڈال رہا تھا۔ وہ جس کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ اسے زمانے بھر میں معتبر ٹھہرائے گا وہی اسے دھتکار گیا۔ شازیہ من ہی من اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ اپنی بے قدری پر خون کے آنسو رو رہی تھی۔

لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اسے مجھ سے نفرت تھی؟ نہیں وہ تو نفرت کرنا نہیں جانتا۔ دھیما مزاج رکھنے والا بہت میٹھا بولنے والا۔ بہت سلجھی شخصیت رکھتا ہے مگر آج اتنا کیسے بدل گیا۔ وہ کون سی گانٹھ ہے جس نے اس کی شخصیت کے سارے رنگوں کو باندھ لیا ہے؟ ہاں اس کی آنکھوں میں دکھ تھا کچھ کھو دینے کا دکھ۔ غصے کا اظہار تو اس کی زبان کر رہی تھی مگر اس کی آنکھیں تو ویران کھنڈرات کا سا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کی غماز تھی۔ آخر کیا بات ہے؟

شازیہ اپنے دکھ بھول چکی تھی۔ بس اب اسے کوئی چیز پریشان کر رہی تھی تو وہ اس کے محبوب کی آنکھوں کی ویرانی تھی۔ اگر کچھ کھوجنے کی جستجو باقی تھی تو اس کے محبوب کے اندر کا دکھ تھا۔

محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے جس سے ہوتی ہے بس ہر سو وہی دکھائی دیتا ہے جاگتے بھی، سوتے بھی، اندر بھی باہر بھی۔ خود اپنا آپ چاہے نیزوں پر پرو یا رہے مگر محبوب کی آنکھوں میں اترتی اداسی کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ اگر خوشی ہوتی ہے تو وہ بھی محبوب کے چہرے پر کھلنے والی مسکراہٹ کو دیکھ کر، دکھ ہو تو وہ بھی اسی کا۔ خود اپنی ذات تو کہیں دور اس سفر کے آغاز میں ہی گم ہو جاتی ہے اسی وقت سے ہی جب اس راہ پر پہلا قدم رکھا ہوتا ہے۔ یہی خود فراموشی ہی تو محبت کی پہلی سیڑھی ہے جب 'میں' ختم ہو جائے جب صرف 'تو' ہی 'تو' باقی رہ جائے اور جب انا ختم ہو جائے صرف عجز باقی رہ جائے۔ تب محبت محبت کہلاتی ہے، تب داستانیں جنم لیتی ہیں، تب ان کے ماہیے گائے جاتے ہیں، محبت کرنے والے چاہے باقی نہ رہے ان کی محبت باقی رہ جاتی ہے، مثال بن کر داستان بن کر۔

اب اس نے بھی ایک داستان بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور پھر وقت نے اس کا صبر دیکھا اس کی محبت دیکھی۔ دن بدلتے گئے شامیں ویران ہوتی گئیں مگر اس کے لبوں سے آہ

تک نہ تھی۔ بس اپنے دیوتا کے چرنوں میں پڑی اس کی ویران آنکھوں میں خوشی کے دیپ جلانے کی کوشش کرتی رہی۔ ایک سال گزر گیا وہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوگی سہہ رہی تھی۔

☆☆☆

حق نواز اپنے دوست کی شادی کی سالگرہ کے لیے ایک اچھا سا تحفہ خریدنے شاپنگ مال میں داخل ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ دوست کے لیے کیا لے۔ جتنی بار جتنی بھی چیزیں منتخب کیں اسے خود ہی مسترد کر دیا۔ ناصر نے اسے اپنی شادی کی سالگرہ میں بلایا تھا۔ وہ ناصر کی شادی میں بھی نہ جا سکا تھا۔ کیونکہ انہی دنوں اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی اجڑی زندگی کا ماتم منا رہا تھا۔ ناصر نے پسند کی شادی کی تھی اس کا اور اس کی بیوی کا دو سالہ افیئر چلا تھا۔ ناصر کو اپنے گھر والوں کو منانے کے لیے زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑی اور اس کی محبت اس کی شریکِ حیات بن گئی۔ جن دنوں ناصر کی شادی تھی حق نواز کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو... کیونکہ اسے لگ رہا تھا جیسے ناصر کے چہرے پر موجود چمک ناصر کی خوشی کی نہیں بلکہ حق نواز کی تضحیک کی بھی ہے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ناصر اس کا در پردہ مذاق اڑا رہا ہو کہ وہ بزدل اپنی محبت کو جیت نہ سکا اسی لیے اتنے قہقہے لگا رہا ہو۔ ان دنوں ناصر کی خوشی اس کے روم روم سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ بھی تب اپنے دوست کی خوشی میں شریک ہونا چاہتا تھا مگر ان دنوں اس کے اندر کا ناکام انسان اپنی محبت کی ناکامی کو دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا اسی لیے وہ عین ان دنوں ناصر کی شادی میں شرکت کرنے کی بجائے کراچی بلاوجہ چلا گیا، دفتر کے کام کا بہانہ بنا کر۔ ناصر نے تب بھی اسے بہت کچھ سنایا مگر پھر اپنے لنگوٹیے یار سے زیادہ دیر ناراض نہ رہ سکا اور چند دن بعد ہی مان گیا، اور اب وہ لوگ اپنی شادی کی سالگرہ منا رہے تھے...... ناصر نے اس بار اسے بہت اصرار سے بلایا تھا اس لیے وہ رد بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اب حق نواز کوئی اچھا سا گفٹ خرید کر ناصر کے پچھلے گلوں کو بھی ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اتنے بڑے مال میں اپنے مطلوبہ معیار پر اترتا گفٹ ڈھونڈتے ہوئے ایک گھنٹا پورا ہونے والا تھا مگر ابھی تک اسے کچھ پسند نہیں آیا تھا۔ تبھی اچانک اس کے کندھے پر پیچھے سے کسی نے ہاتھ رکھا۔

''ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ناصر خوشدلی سے اس سے پوچھ رہا تھا وہ مسکرایا۔

''کچھ نہیں یار۔ تمہارے اور بھابی کے لیے تحفہ خرید رہا تھا۔ کچھ پسند ہی نہیں آ رہا لیکن اب تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا، اب تم خود ہی پسند کرو گے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''میں...... ارے نہیں یار۔ میں کیسے پسند کروں گا، اس کام کے لیے تیری بھابی ہے نا۔ میرے ساتھ ہی ہے۔ ویڈنگ انیورسری پر اس کی پسند کا گفٹ دلوانے کے لیے لایا تھا۔ ٹھہرو میں ملواتا ہوں۔ اور پھر ناصر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب کھینچا تو اس کے ساتھ چلتا گیا۔ یہ دونوں ایک کاؤنٹر پر ایک خاتون کی پشت پر جا کر رکے۔

''ساجدہ...... ان سے ملو یہ ہے میرا دوست میرا لنگوٹیا یار...... حق نواز اور یار یہ ہے تیری بھابی۔ مائی وائف مائی لائف ساجدہ۔ ساجدہ ناصر۔'' ناصر نے اس کا تعارف کرایا۔ حق نواز ساجدہ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ مزید نکھر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کہیں بھی شناسائی کی رمق نظر نہیں آ رہی تھی۔ تبھی ساجدہ نے اسے سلام کیا اور اس کا حال چال پوچھا۔ وہ کہیں سے بھی زخم خوردہ نہیں لگ رہی تھی۔ اسی وقت ناصر اور ساجدہ دونوں کسی بات پر زور سے ہنسے تھے۔ حق نواز کی آنکھوں میں گویا مرچی چبھ گئی تھی۔ وہ وہاں سے نکل آیا۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ چند لمحے بھی مزید وہاں رکتا تو گھٹن سے مر جاتا۔ وہ دیر تک فٹ پاتھ پر تیز تیز چل کر اپنے اندر تازہ ہوا بھرتا رہا اور پھر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

ساجدہ تو کیا یہ تھی تیری محبت۔ تم نے مجھے بیوقوف بنایا تھا۔ تم نے ایک ساتھ ہم دونوں دوستوں کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھائیں کیونکہ تمہارا خیال تھا کہ دونوں میں سے کسی کو تو پھانس لوں گی۔ ایک سال پہلے ہی تو ہم جدا ہوئے تھے اور ایک سال تیری شادی کو ہو گیا اور شادی بھی وہ جو دو سالہ عشق کے بعد انجام پائی۔ واہ ساجدہ واہ۔ کتنی سچی تھی تو۔ کاش مجھے پہلے معلوم ہو جاتا میں اپنی پاکباز اور صابر بیوی کو تیرے لیے زندہ درگور نہ کرتا۔ جو محض میری محبت میں سب فراموش کر بیٹھی ہے لیکن...... ''میں نے یہ کیا کیا......'' وہ دکھ اور افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ تبھی اچانک وہ ایک عزم سے اٹھا۔

ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں اسے منا لوں گا اور میں جانتا ہوں وہ مان جائے گی کیونکہ اس کی محبت سچی ہے۔ خالص ہے۔ تیری طرح کھوٹ زدہ نہیں۔

شازیہ کی ریاضت رنگ لائی تھی۔ وہ بامراد ٹھہری۔

++

میرے شوہر ریاض ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔ جب ان کا تبادلہ جھنگ ہوا تو میں میکے میں تھی۔ ریاض نے کہا کہ ابھی تم بچوں سمیت میکے میں رہو جیسے ہی مجھے کوئی کوارٹر ملا تو میں تمہیں لے جاؤں گا۔ میں مان گئی۔ وہ چار مہینے ایک دوست کے پاس رہے۔ ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آ جاتے تھے۔ جب ان کے دوست کا تبادلہ ہوا تو اس کا کوارٹر ریاض کو مل گیا۔ چند روز بعد آ کر وہ مجھے اور بچوں کو اپنے ساتھ جھنگ لے گئے۔ میں بہت خوش تھی کیونکہ ہم میاں بیوی میں بہت محبت تھی۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔

وہ کوارٹر دو کمروں، چھوٹے سے صحن اور باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ چھت کے گرد چھوٹی سی چار دیواری بنائی گئی تھی جس سے برابر والوں کی چھت پر بہ آسانی جایا جا سکتا تھا۔ ایک ہی لائن میں چھ کوارٹر بنے ہوئے تھے اور ہمارا کوارٹر تیسرے نمبر پر تھا۔

ہمارا کنبہ مختصر تھا اس لیے وہ کوارٹر ہمارے لیے بہترین تھا۔ ریاض چھت پر سوتے تھے اور میں بچوں کے ساتھ صحن میں سوتی تھی۔ اس کی وجہ چھت کی چار دیواری تھی۔ ریاض نہیں چاہتے تھے کہ کسی غیر مرد کی نظر مجھ پر پڑے اسی لیے مجھے چھت پر سونے کی اجازت نہیں تھی۔

جناب، ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

آنکھیں جو دیکھتی ہیں کبھی کبھی وہ سچ نہیں ہوتا۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا۔ اس نے اپنے شوہر کو رات کے اندھیرے میں اپنی چھت پر ایک لڑکی کے ساتھ پکڑا تھا۔

ایم ایس خالد

(ملتان)

ریاض نے چھت پر اپنے لیے ایک چارپائی ڈال لی تھی۔ وہ رات نو بجتے ہی چھت پر چلے جاتے جبکہ میں اس وقت تک جاگتی رہتی جب تک بچے سو نہ جاتے۔ ایک رات میں سو رہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے تکیے کے نیچے رکھے موبائل کو اٹھا کر اس پر وقت دیکھا تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے چھت پر ریاض کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ میں بے اختیار ٹھٹکی۔ ساتھ ہی مجھے تجسس ہوا اور حیرت بھی ہوئی کہ رات کے اس پہر ریاض کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ عورت کا پہلا خیال ہمیشہ غیر عورت کی طرف ہی جاتا ہے۔ میرا بھی پہلا خیال کسی عورت کی طرف ہی گیا تھا کہ کہیں ریاض کسی عورت سے تو بات نہیں کر رہے؟ شاید ان کی ساتھ والے کوارٹرز میں رہنے والی کسی عورت سے آشنائی ہوگئی ہو۔ میرے دل میں شک کے بیج سر ابھارنے لگے۔ میں چند لمحے گومگو کی کیفیت میں رہی پھر میں نے موبائل تکیے کے نیچے رکھا اور چارپائی سے اتر کر دبے پاؤں چلتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی۔

سامنے کا منظر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ میں اگر منہ پر ہاتھ نہ رکھ لیتی تو شاید میرے منہ سے چیخ نکل جاتی۔ ریاض اور وہ لڑکی آمنے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی اور وہ بھی رات کے اس پہر ہماری چھت پر میرے شوہر کے سامنے کھڑی تھی۔ چاندنی رات میں وہ دونوں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور حوصلہ دیا۔ سیڑھی کی چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔

ریاض اس لڑکی سے کہہ رہے تھے۔ "پلیز، جاؤ یہاں سے۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔"

لڑکی نے سسکتے ہوئے جواباً کہا۔ "ریاض، پلیز آپ کچھ کریں، میں ماں بننے والی ہوں۔ اگر میرے گھر والوں کو پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے۔"

میرے شوہر نے اسے تسلی دی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی تم جاؤ میں کچھ کرتا ہوں۔"

لڑکی سسکتی ہوئی دیوار پھلانگ کر چلی گئی اور ریاض چارپائی پر جا کر لیٹ گئے۔ وہ تو سو گئے تھے لیکن یہ سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ وہ لڑکی میرے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی، یہ سن کر مجھ پر گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اس لمحے مجھے بہت رونا آیا لیکن میں منہ دبا کر دبے قدموں نیچے آگئی اور چارپائی پر لیٹ کر خوب روئی۔ اب مجھے سمجھ آگئی تھی کہ ریاض نے آخر مجھے اور بچوں کو چھت پر سونے کی کیوں اجازت نہیں دی تھی۔ ان کا کسی لڑکی سے چکر تھا اور وہ آدھی رات کو ان سے ملنے آتی تھی اور اب وہ ان کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ انہوں نے تین مہینے اسی کوارٹر میں گزارے تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کا اس لڑکی سے کافی روز سے چکر چل رہا تھا۔

باقی کی رات میں نے جاگتے سوتے اور روتے ہوئے گزار دی۔ صبح اذانوں کے وقت ریاض آئے تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور یوں ظاہر کیا کہ میں سو رہی ہوں البتہ میں نے نیچی نیچی آنکھوں سے دیکھا تو وہ میری چارپائی کے پاس آئے اور کچھ دیر مجھے دیکھتے رہنے کے بعد واش روم چلے گئے۔ وضو کرکے نماز پڑھنے مسجد چلے گئے تو میں نے بھی اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ جب ریاض مسجد سے آئے تو میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ انہوں نے سلام کیا تو میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ میری روتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ "فرح، خیر تو ہے، تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ کیوں رو رہی ہو؟"

میں اس وقت آملیٹ بنانے کے لیے پیاز چھیل رہی تھی اس لیے میں نے یہی جواب دیا۔ "پیاز چھیلنے کی وجہ سے آنسو آرہے ہیں۔"

وہ ہنس دیے اور تیار ہونے کمرے میں چلے گئے جبکہ میں افسوس بھری نظروں سے انہیں جاتا دیکھتی رہ گئی۔ وہ ایسے مطمئن تھے جیسے مجھے ان کی حرکت کا پتا ہی نہیں تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ اتنے مطمئن کیسے تھے۔ کیا انہیں اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا؟

رات کو کھانا کھانے اور تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد وہ سونے کے لیے بستر لے کر چھت پر چلے گئے تو میں بھی بستر پر لیٹ کر رات کے ایک بجنے کا انتظار کرنے لگی… کیونکہ گزشتہ رات ایک بجے ہی وہ لڑکی ان سے ملنے آئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ لڑکی رات کو دوبارہ ان کے پاس آتی ہے یا نہیں۔ شاید رات کے بارہ بجے کا وقت تھا جب میں پانی پینے کی غرض سے صحن میں آئی تھی۔ مجھے چھت پر قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی تو میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ دل میں فوراً یہی خیال آیا کہ یقیناً وہ لڑکی ریاض سے ملنے آئی تھی۔ میں جلدی سے صحن سے نکل کر دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی اور چوکھٹ کے پاس کھڑی ہو کر چھت پر جھانکا۔ اگلے ہی پل میرا دل دھک سے رہ گیا۔ واقعی وہ لڑکی آئی ہوئی تھی اور وہ دونوں ایک ہی چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں ابھی کے ابھی جا کر ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لوں

اور پوچھوں کہ آخر مجھ میں کیا کمی ہے جو آپ دوسری لڑکی کے چکروں میں ہیں لیکن چاہنے کے باوجود ایسا نہ کرسکی۔ مجھے یوں لگا جیسے غیر مرئی طاقت نے میرے قدم جکڑ لیے ہوں اور مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا ہو۔

مجھے ریاض کے مزاج کا پتا تھا۔ وہ اگرچہ اچھے تھے تو غصے کے بھی بہت تیز تھے لیکن جو چہرہ میں ان کا اب دیکھ رہی تھی وہ میرے لیے بالکل نیا اور غیر متوقع تھا۔ میں کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ لڑکی ریاض سے کہہ رہی تھی۔ "آپ نے اگر کچھ نہ کیا تو میں برباد ہو جاؤں گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز آپ مجھ سے شادی کرلیں، میری عزت بچالیں، میرا بھرم رکھ لیں۔"

اس کے الفاظ… میرے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں جا کر اس لڑکی کا منہ نوچ لوں جس نے میرے شوہر کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا تھا۔

قصور صرف لڑکیوں کا نہیں ہوتا ان میں مرد بھی برابر کے قصوروار ہوتے ہیں۔ میرا شوہر شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسری لڑکی کے ساتھ منہ کالا کرے گا میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے گھن آنے لگی تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں میں نہ سن سکی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔ نیند تو میری آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی اور باقی کی رات میں نے کانٹوں پر جاگتے ہوئے گزاری تھی۔

صبح جب میں نے شوہر کو دیکھا تو وہ بے حد پریشان تھے۔ میں ان کی پریشانی جانتی تھی۔ انہیں اس وقت خیال کیوں نہیں آیا تھا جب انہوں نے لڑکی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔ "ریاض! خیریت تو ہے آپ پریشان پریشان سے لگ رہے ہیں؟ کیا کچھ ہوا ہے؟"

وہ میری بات سن کر یوں چونکے جیسے کسی گہرے خیال میں تھے۔ "نہیں تو میں ٹھیک ہوں۔"

پھر وہ اکرم کو لے کر چلے گئے۔ میرا بیٹا اکرم ماشاءاللہ پانچ سال کا تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا جبکہ ہادیہ ابھی دو سال کی تھی۔ میں گھر کے کام کاج میں جت گئی لیکن میرا دل کام کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے رہ رہ کر ریاض اور اس لڑکی کا خیال آرہا تھا۔ سنا تھا کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں لیکن اب دیکھ بھی لیا تھا میرے شوہر نے ہی میرے ساتھ بے وفائی کی تھی۔

ہمیں اس علاقے میں رہتے ہوئے ایک مہینا ہوگیا تھا لیکن میں ابھی تک کسی پڑوسی کے گھر نہیں گئی تھی اور نہ ہی کوئی پڑوسن ہمارے گھر آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسی لڑکی کے گھر جاؤں اور اس لڑکی کو دیکھوں کہ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے یا اسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جس پر میرا نیک صفت شوہر فریفتہ ہوگیا تھا۔

میں نے اس روز دہی بڑے بنائے تھے اور وہی بڑے دینے کے بہانے ہی میں اس لڑکی کے گھر چلی گئی۔ اس کا کوارٹر چوتھے نمبر پر تھا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے والد ریلوے میں ملازم تھے اور وہ بوڑھی عورت ان لڑکیوں کی دادی تھی۔ سلام دعا کے بعد میں نے دہی بڑے لڑکیوں کی دادی کو دیے تو انہوں نے کہا۔ "بیٹا۔ اس کی کیا ضرورت تھی، تم نے خوامخواہ تکلف کیا ہے۔"

باتوں کے دوران میں نے دونوں لڑکیوں کو دیکھا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان میں سے وہ کون سی لڑکی ہے جو میرے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ دونوں لڑکیوں کی شکلیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں لیکن دونوں میں تین چار سال کا فرق تھا۔ دونوں ہی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں گھر آگئی۔ آتے ساتھ ہی میں نے اپنا اور ان لڑکیوں کا موازنہ کیا۔ شادی کے بعد عورت کا جسم پھیل جاتا ہے۔ میرا جسم بھی پھیل رہا تھا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ میرا شوہر جوان لڑکی کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ فربہ عورتوں کو ویسے بھی مرد پسند نہیں کرتے۔ ہر مرد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اسمارٹ، سلم اور خوبصورت ہو، چاہے مرد خود کتنا ہی بدھا کیوں نہ ہو۔

میں بھی خوبصورت اور گوری چٹی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر عورت ڈھل جاتی ہے اور میں بھی ڈھل رہی تھی۔

شام کو ریاض گھر آئے تو میں نے ان سے کہا۔ "ریاض! آپ ہماری بھی چارپائیاں چھت پر ڈال دیں۔ ہم بھی چھت پر سونا چاہتے ہیں۔"

میری بات سن کر ریاض ٹھٹکے اور پوچھا۔ "کیوں، تم چھت پر کیوں سونا چاہتی ہو، جانتی تو ہو کہ چار دیواری چھوٹی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گرمی بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ رات کو مچھر بھی بہت ہوتے ہیں اس لیے نیند نہیں آتی۔ بچے بھی گرمی سے بے حال ہوتے رہتے ہیں۔"

وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ریاض نے صاف انکار کردیا تھا۔ "نہیں، تم لوگ چھت پر نہیں سو سکتے میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں کل ایک نیا ائرکولر خرید لاؤں گا پھر تم لوگوں کو

پریشانی نہیں ہوگی۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگئے تھے اور میں اندر ہی اندر کڑھتی ہوئی برتن سمیٹنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ انہوں نے ہمیں چھت پر سونے کی اجازت کیوں نہیں دی تھی کیونکہ پھر وہ اپنی محبوبہ سے نہیں مل سکتے تھے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب میں ریاض اور اس لڑکی کو رنگے ہاتھوں پکڑوں گی پھر میرے ساتھ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور میری برداشت ہر حد پار کر چکی تھی۔ یہ میں جانتی تھی کہ میں کس دل سے رہ رہی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید پہلے روز ہی واویلا مچا دیتی اور گھر چھوڑ کر چلی جاتی لیکن میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ اللہ نے مجھے صبر کی دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ اس لیے صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس رات بھی میں دو بجے تک جاگتی رہی تھی لیکن اس رات وہ لڑکی ریاض سے ملنے نہیں آئی تھی۔ میں نے تین چار بار چھت پر جا کر دیکھا تھا ریاض گہری نیند سو رہے تھے۔

اگلے روز ریاض ہمارے لیے ائرکولر لے آئے۔ ائرکولر پا کر بچے بہت خوش تھے لیکن مجھے کوئی خوشی نہیں تھی۔ اسی طرح تین چار روز گزر گئے اور وہ لڑکی دوبارہ ریاض سے ملنے نہیں آئی تو مجھے حیرت ہوئی۔ ریاض بھی پریشان اور الجھے الجھے سے تھے لیکن وہ اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

ایک دن رات کا کھانا کھانے کے بعد ریاض مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "فرح! میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

یکبارگی میرا دل اچانک سے دھڑکا۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید وہ مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔

"جی کہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "فرح! ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا نام انیلا ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہوگئے جیسے بولنے کے لیے الفاظ کو ترتیب دے رہے ہوں۔ میں دل گرفتگی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے اندر جیسے ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہوں گے۔ یقیناً وہ اس لڑکی سے شادی کے حوالے سے مجھے اعتماد میں لینا چاہتے ہوں گے اور دوسری شادی کی اجازت لینا چاہتے ہوں گے۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولے۔ "فرح! ایک بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔"

ان کے خاموش ہونے پر میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا مسئلہ ہوگیا ہے؟ آپ کھل کر بات کریں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر بولے۔ "فرح! دراصل مسئلہ یہ ہوگیا ہے کہ..."

وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ان کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ فون سننے کے لیے اٹھ کر باہر چلے گئے اور بات ادھوری رہ گئی۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ مجھ سے دوسری شادی کی اجازت مانگیں گے تو میں نہیں دوں گی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ میرے اجازت نہ دینے پر ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے اور بولے۔ "مجھے آفس کے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم سو جانا۔"

اتنا کہہ کر وہ عجلت بھرے انداز میں چلے گئے اور میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ رات کو وہ نہ جانے کب آئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں نے اس رات جاگنے کی کوشش تو بہت کی لیکن چونکہ سارا دن کی تھکی ہوئی تھی اس لیے مجھے جلدی ہی نیند آ گئی تھی۔

اگلی صبح بھی وہ جلدی چلے گئے اور رات کو نو بجے واپس آئے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چھت پر سونے چلے گئے۔ جس مسئلے پر بات کرنا چاہتے تھے انہوں نے دوبارہ نہیں کی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹی سوچتی رہی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج وہ لڑکی ریاض سے ملنے ضرور آئے گی۔ میرے دل کی بات سچ ہی ثابت ہوئی تھی۔ رات کے پورے ایک بجے میں بستر سے اتر کر دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ریاض اور وہ لڑکی چارپائی پر کافی قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں پستول تھا اور بہت ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان کی باتیں تو سنائی نہ دیں لیکن وہ منظر دیکھ کر میرا صبر جواب دے گیا اور میں غصے سے چھت پر پہنچ گئی۔

مجھے دیکھ کر ریاض اور وہ لڑکی دونوں ہی جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ لڑکی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں پھٹ پڑتی، ریاض پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔ "فرح! تم..."

غصے سے میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں نے غصے سے کہا۔ "ریاض! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ اسی لیے آپ مجھے چھت پر سونے کی اجازت نہیں دیتے تھے تاکہ

آپ اس لڑکی سے رنگ رلیاں منا سکیں۔ آپ نے میرا اعتبار توڑ دیا ہے۔"

ریاض کو میری باتیں بری لگیں۔ وہ بھی غصے سے بولے۔ "فرح! کیا بکواس کر رہی ہو تم۔ ہوش میں تو ہو۔"

میں نے بھی دوبدو جواب دیا۔ "ہاں، میں ہوش میں ہوں۔ آپ دونوں کا چکر چل رہا ہے میں اس بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ لڑکی آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ آپ کو شرم نہیں آئی۔ بیوی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی کے ساتھ منہ کالا کر کے آپ کو کیا ملا؟ جب لوگوں کو آپ کے کرتوتوں کا پتا چلے گا تو وہ کیا سوچیں گے؟ کبھی آپ نے یہ سوچا ہے۔ میں انتظار میں تھی کہ جب یہ لڑکی دوبارہ آپ سے ملنے آئے گی تو میں آپ دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑوں گی اور آج پکڑ لیا۔"

میں مسلسل بولتی جا رہی تھی اور ریاض دنگ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں خاموش ہوئی تو وہ شکستہ لہجے میں بولے۔ "فرح! اور بھی کچھ کہنا ہے تو کہہ لو تاکہ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہے، لیکن یہ یاد رکھنا کہ جو تم سوچ رہی ہو یا گمان کر رہی ہو ویسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میں آج بھی صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے علاوہ میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی۔"

اس وقت میرے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بھی گھبرائی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر پیر پٹخ کر سیڑھیاں اتر کر صحن میں چلی آئی۔ نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں مزید کوئی بات نہیں کر پائی تھی۔

کچھ دیر کے بعد ریاض اور وہ لڑکی انیلا بھی نیچے آگئے۔ ریاض صحن میں پڑی چارپائی اٹھا لائے اور اسے بچھانے کے بعد وہ اور لڑکی دونوں ہی بیٹھ گئے۔ مجھے وہ لڑکی زہر لگ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ ابھی کے ابھی اس کا منہ نوچ لوں۔ اسی کی وجہ سے ہم میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑی تھی۔ ریاض میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "فرح، میں تو تمہیں بے حد سمجھدار سمجھتا تھا کہ تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو، مجھے سمجھتی ہو لیکن افسوس کہ تم نے میری بات سننا ہی گوارا نہیں کی اور مجھ پر شک کر کے آگئی۔ شکر ہے کہ تمہارے واویلا مچانے سے کوئی جاگ نہیں گیا ورنہ اس بے چاری لڑکی کے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاتا۔"

ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔ اس بار وہ لڑکی سے بولے۔ "ہاں بھئی، میری بیوی کو بتاؤ کہ تم آدھی رات کو مجھ سے کیوں ملنے آئی تھی تاکہ اس کا شک ختم ہو جائے۔"

انیلا... تذبذب میں پڑی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ "فرح بھابی! میں بے حد مشکل میں ہوں۔ آپ کے شوہر میرے بھائی ہیں۔ آپ لوگوں سے پہلے اس کوارٹر میں صابر رہتا تھا۔ میں اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا تھا اور ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہم چھپ چھپ کر چھت پر آدھی رات کو مل رہے تھے۔ اس بارے میں میری دادی بھی جانتی ہیں انہوں نے مجھے بہت منع کیا کہ میں صابر سے نہ ملوں وہ اچھا لڑکا نہیں ہے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بن بیاہی ماں بننے والی ہوں۔ میرا اٹھا ہوا غلط قدم میرے لیے وبال جان بن رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ صابر کا تبادلہ ہوگیا ہے اور وہ یہ کوارٹر چھوڑ کر چلا گیا ہے جب میں چھت پر صابر سے ملنے آئی تو وہاں ریاض بھائی سو رہے تھے۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی اور ان سے روزانہ رات کو صابر کے بارے میں ہی ملنے کی غرض سے آتی تھی۔ صابر نے اپنا موبائل فون بند کر دیا ہے شاید اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔ ریاض بھائی نے کہا تھا کہ وہ میری مدد کریں گے اور صابر کو تلاش کر کے لے آئیں گے لیکن صابر کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ اس کا جس شہر میں تبادلہ ہوا ہے وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ شاید اس نے ریاض بھائی سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کا تبادلہ ساہیوال ہوا ہے۔ اس نے مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا ہے۔ میرا کیا بنے گا میں بہت پریشان ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ریاض بھائی صابر کو ڈھونڈ کر لائیں اور ہماری شادی کرا دیں تاکہ میں اس مشکل سے نکل سکوں۔ آج میں فیصلہ کر کے آئی تھی کہ اگر ریاض بھائی صابر کو تلاش کر کے نہ آئے تو میں خودکشی کر لوں گی اسی لیے میں پستول ساتھ لائی تھی۔"

ساری کہانی سنانے کے بعد انیلا تو خاموش ہوگئی لیکن میرے دل و دماغ میں جھکڑ سے چلتے رہے۔ میں انجانے میں اپنے نیک فطرت شوہر کو بدفطرت سمجھتی رہی اور وہ بے چاری انیلا کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ مجھے اس وقت خود سے بھی بہت شرمندگی ہوئی۔ میری زبان اس لیے گنگ ہو چکی تھی میں بولتی بھی تو کیا میں تو اپنے شوہر سے نظریں تک نہیں ملا رہی تھی۔ ریاض نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نے بنا سوچے سمجھے ان پر بہتان لگا دیا تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ہم سب ہی پریشان ہوئے کہ رات کے اس پہر کون آیا ہوگا ریاض نے جا کر دروازہ کھولا تو باہر انیلا کی دادی آئی ہوئی تھیں۔ ریاض انہیں اندر لے آئے۔ وہ بوڑھی عورت ڈری سہمی ہوئی تھی ان کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ سوچا کہ بے سمجھ اور ناخلف اولاد کیسے کیسے اپنے گھر

والوں کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہے۔
بوڑھی عورت نے انیلا کے ہاتھ میں پستول دیکھا تو وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''انیلا، یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''
انیلا تو چپ رہی لیکن ریاض نے کہا۔ ''اماں جی، یہ خودکشی کر رہی تھی، اگر میں بروقت نہ روکتا تو اس نے خود کو گولی مار لینی تھی۔''
انیلا کی دادی خوفزدہ ہو گئی۔ تب ہی اس نے انیلا سے کہا۔ ''چلو گھر، کیا یہ وقت ہے کسی کو تنگ کرنے کا، کیوں ان کو پریشان کر رہی ہو؟''
انیلا نے کہا۔ ''دادی، میں نے ان کو سب بتا دیا ہے۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں، ریاض بھائی نے میرا بہت ساتھ دیا ہے میں واقعی جذبات میں آ کر خودکشی کر رہی تھی لیکن انہوں نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔''
تبھی ریاض نے مداخلت کی اور کہا۔ ''اماں جی، میں جانتا ہوں کہ انیلا کی وجہ سے آپ بھی مشکل میں ہیں۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ صابر شادی شدہ ہے اور اس کے تین بچے ہیں۔ اس نے انیلا کو دھوکا دیا ہے۔ آپ اس کی جلد از جلد شادی کر دیں تاکہ یہ کسی مشکل میں نہ پھنسے۔ وہ کمینہ فطرت انسان اس کو مشکل میں ڈال کر بے یار و مددگار چھوڑ گیا ہے۔''
انیلا کی دادی نے افسردہ سی سانس خارج کی اور بولی۔ ''بیٹا! میں نے اس کا رشتہ اپنے دور کے جاننے والے کے بیٹے زاہد سے کر دیا ہے لیکن یہ راضی نہیں ہو رہی۔ تم اسے راضی کرو نا، یہ زاہد کے ساتھ خوش رہے گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہماری عزت خاک میں ملنے سے بچ جائے گی۔''
انیلا واقعی زاہد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی وہ صابر سے شادی کرنے پر بضد تھی۔ مجھے اس لڑکی پر بے حد غصہ آ رہا تھا جس نے والدین کی آبرو مٹی میں ملا دی تھی اور ان کی عزت کو مزید نیلام کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ریاض نے اسے بہت سمجھایا اور بالآخر وہ روتی دھوتی سمجھ گئی اور دادی کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی صابر کو یاد نہیں کرے گی۔ اگلے دن میں انیلا اور اس کی دادی کو اپنے شوہر کے ساتھ ایک بڑی ڈاکٹر کے پاس لے کر پہنچی۔ ابھی وقت گزرا نہیں تھا اس لیے اس ڈاکٹر نے مشکل آسان کر دی۔
میں ریاض سے شرمندہ تھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان سے کیسے بات کروں، مجھ سے انجانے میں واقعی بھول ہو گئی تھی۔ میں نے بھی دوسری عورتوں کی طرح جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے ندامت اٹھانی پڑی تھی، لیکن ریاض کھلے دل کے مالک تھے۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا اور کہا۔
''فرح! آپ کا [illegible] تعلق سے اپنی [illegible] کرنا۔ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی غلط ہوتا ہے۔''
میں نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ اس روز سے میں اپنے شوہر کی مزید عقیدت مند ہو گئی۔ دو روز بعد وہ بھائی جو دبئی گئے ہوئے تھے آ گیا۔ وہ انیلا [illegible] کے آتے ہی انیلا کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور ایک ہفتے بعد روتی بلکتی انیلا کی شادی زاہد سے ہو گئی۔ ہم نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کی دادی بھی پرسکون ہو گئی۔
جب ایک روز ریاض کی ملاقات صابر سے ہوئی تو انہوں نے اسے تمام حال احوال کہہ سنایا اور اس کی خوب کلاس لی لیکن اس بدفطرت انسان نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ اس نے ریاض سے کہا۔ ''یار، میں نے کب اسے پھنسایا تھا، وہ تو خود میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اچھا ہوا اس کی شادی ہو گئی ورنہ تو وہ میرے گلے پڑ جاتی۔ میں نے تو اس کے ساتھ ٹائم پاس کیا تھا اور وہ سنجیدہ ہو گئی۔ میں ایسی لڑکیوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ شکر ہے کہ میرا تبادلہ ہو گیا تھا ورنہ مجھے اس سے زبردستی شادی کرنی پڑتی اور میری بیوی اور بچے مجھے چھوڑ کر چلے جاتے۔''
ریاض نے اسے خوب لعنت ملامت کی۔ ''اگر وہ لڑکی نادان اور ناسمجھ تھی تو تو کون سا ناسمجھ تھا۔ تو بھی تو اسے سمجھا سکتا تھا لیکن افسوس کہ تم نے اس کی بے لوث محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور اسے اندھیرے میں رکھا کہ تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ کسی کی بیٹی کی عزت خاک میں ملانے سے پہلے سو بار سوچو کہ اگر تم کسی کی عزت برباد کر رہے ہو تو کل کلاں کو تمہاری بیٹی، بہن سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ سوچو اس وقت تمہارا کیا ردعمل ہوگا؟ یاد رکھنا اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ کسی مظلوم کی آہ جب عرش پر جاتی ہے تو ضرور ظالم پر تباہی لاتی ہے۔ ڈرو اس وقت سے جب تم پر ایسا وقت آیا تو..... تو تم کیا کرو گے؟''
صابر کے دل و دماغ پر ریاض کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ اس نے ریاض کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیا۔ وہ عزت کا لٹیرا ثابت ہوا تھا۔ اس دن کے بعد ریاض نے صابر سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ ایسے انسان کے ساتھ دوستی ہی نہیں رکھنا چاہتے تھے جسے کسی کی بہن، بیٹی کی عزت کا پاس نہ تھا۔
کبھی کبھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرا دل دہل جاتا ہے۔ میں اپنے رب سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ہر لڑکی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور صابر جیسے شیطان صفت اور ہوس پرست لوگوں سے دور رکھے۔

++

اُلجھی ڈور

محترم مدیر
السلام علیکم!
ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہاں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ بعض باتوں، نکتوں کی توجیح ممکن ہے لیکن کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جن کی توجیح دینا ممکن نہیں، یہ واقعات بھی ایسے ہی ہیں۔ بہت کوشش کے بعد بھی سمجھ نہیں پائی ہوں کہ الجھی ڈور کا سرا کیسے ہاتھ آیا۔

فرح ناز

بہت پُررونق علاقہ تھا نیچے مارکیٹ بھی تھی۔ فلیٹس بہت نئے نہیں تو بہت پرانے بھی نہیں تھے، وہ تمام سہولت موجود تھی جو ہر کوئی چاہتا ہے۔ دو بچے اور میاں بیوی چار نفوس کے لیے یہ دو بیڈ روم کا گھر بڑے لاؤنج اور ڈرائنگ کے ساتھ کافی تھا۔ سامعہ کی دلچسپی سب سے زیادہ بالکونی میں تھی جہاں ہوادار ماحول میں بیٹھ کر اس کا قلم اور دماغ خوب چلنے والا تھا۔ بالکونی اور کمرے کے درمیان سلائیڈنگ شیشے کا بڑا سا دروازہ تھا۔ پانچویں منزل پہ ہونے کی وجہ سے لوہے کی خوب صورت جالیاں ہر کھڑکی اور بالکونی میں تھیں یعنی پردوں کی کافی ضرورت تھی۔ سامعہ کو چونکہ صاف شفاف شیشے کے دروازے پسند تھے اس لیے گلاس پیپر بھی لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
''سامعہ ہم یہاں پودے بھی رکھ سکتے ہیں۔'' کاشان کو اس کی دلچسپی کا علم تھا اور سامعہ نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔
''سامان تو سب سیٹ ہو گیا مگر پردوں کی ضرورت ہے

ابھی۔" سامعہ نے ڈسٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اب یہ کام تم کو خود کرنا پڑے گا، میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔" کاشان نے صوفے پہ ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ہمم... مگر آرڈر تو دے سکتے ہیں وہ خود آ کر لگا بھی دیں گے۔" اس کے جواب سے کاشان مطمئن نظر آنے لگا۔

ندا اور ارحم سونے جا چکے تھے۔ بچوں کا کمرا کافی حد تک سیٹ ہو چکا تھا۔ کاشان نے بہت دیکھ بھال کر یہ فلیٹ خریدا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں سامعہ اور بچوں کو کوئی مسئلہ نہ ہو اسی سلسلے میں ایک ماہ ایسے گزرا کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ دو دن بعد اس کی اسلام آباد کی فلائٹ تھی۔ اسلام آباد سے آنے کے بعد اسے دبئی جانا تھا اس کا کام ہی کچھ اس نوعیت کا تھا۔

تھکن سے چور کاشان سو چکا تھا جبکہ وہ عادت سے مجبور جاگ رہی تھی۔ زیادہ تھکن اسے سونے نہیں دیتی تھی پھر کتاب پڑھے بغیر تو سونا ناممکن تھا سو وہ کروٹیں بدلنے پہ مجبور تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو یکایک چونک گئی، شیشہ گویا کوئی اسکرین بن گیا تھا۔ ایک خاتون جس کا چہرہ واضح نہیں تھا ایک کرسی پہ بیٹھی سوئٹر بننے میں مصروف تھی پاس ہی ایک بچہ کچھ کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ پورے ایک کمرے کا سین تھا۔ دیوار پہ جیسے ایک پینٹنگ بھی تھی اچانک بچہ کھڑا ہو کر چلنے کی کوشش کرنے لگا اور گر گیا ماں نے لپک کے اس کو اٹھایا اور اسی لمحے اس کی آنکھیں سامعہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں اب اس کی شکل نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی اس نے بچے کو اٹھایا اور ایک طرف چلی گئی۔

سامعہ دم بخود یہ سب دیکھ رہی تھی ڈرتے ڈرتے اس نے سائڈ لیمپ جلا دیا کاشان کسمسا کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے سامعہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ!" سامعہ نے شیشے کی طرف اشارہ کیا جہاں بالکونی میں جلنے والی لائٹ نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہے وہاں؟ کوئی تھا؟" کاشان اٹھ بیٹھا۔

وہ اٹھ کر شیشے کے پاس گیا ڈور کھول کر اِدھر اُدھر جھانکا اور دوبارہ بند کر کے آ کر لیٹ گیا۔

"اصل میں نئی جگہ ہے نا اس لیے تمہیں نیند نہیں آ رہی سو جاؤ یہاں روشنی بھی جلدی ہو جائے گی پردے نہیں ہیں ناں اس لیے یہاں کوئی چادر باندھ دینی چاہیے تھی۔" کاشان دوبارہ بستر پہ دراز ہو گیا۔

صبح سارا گھر سورج کی تپش اور روشنی سے بھر گیا تھا لہٰذا آج کا پہلا کام پردوں کی فوری شاپنگ تھا۔ پورا دن لگا کر پردوں کی شاپنگ بھی ہو گئی اسی دن وہ تیار کروائے گئے اور پھر لگا بھی دیے گئے دیدہ زیب پردوں کی وجہ سے کمرے میں بھی رونق آ گئی تھی۔

"کچھ دنوں کے لیے صائمہ کو بلا لو پھر پندرہ دن بعد تو میں آ ہی جاؤں گا۔"

مشورہ برا نہیں تھا صائمہ اس کی چھوٹی بہن تھی لیکن آج کل امی کی طبیعت بھی کافی خراب تھی اور ابو بھی اکثر بیمار رہتے تھے اس لیے صائمہ کا آنا ذرا مشکل ہی تھا اور بچوں کے اسکول کی وجہ سے اس کا وہاں جا کر رہنا بھی ممکن نہیں تھا البتہ ویک اینڈ پہ جانے کا پروگرام تھا۔

"یہ لیں جناب ہو گیا آپ کا سامان پیک آپ کی شیونگ کٹ بھی رکھ دی ہے۔" سامعہ نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

"پریشان نہ ہونا جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" کاشان نے اس کے لہجے کی اداسی محسوس کر لی تھی سو اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

شام ہونے لگی تھی ارحم اور ندا کو ہوم ورک کروا کے اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ بچے کارٹون فلم دیکھنے لگے۔ وہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ کچن سے متصل چھوٹا سا واشنگ ایریا تھا۔ کھانا تقریباً تیار تھا کہ اسے واشنگ ایریا سے کسی بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

"پتا نہیں کس کا بچہ رو رہا ہے، یہاں فلیٹوں میں تو پتا ہی نہیں لگتا کون کون رہتا ہے کل جاؤں گی پڑوس میں فارغ ہو کر۔" اس نے برتنوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے سوچا اور کچن سے باہر آ گئی۔

بچے پسندیدہ نوڈلز کھا کر اب سونے کی تیاری کر رہے تھے اور آج لڑائی یہ تھی کہ مما کے پاس کون سوئے گا بہرحال دونوں بچوں کو آس پاس لٹا کر وہ انہیں کہانی سنانے لگی جسے سنتے سنتے دونوں ہی سو گئے۔ دھیرے سے ان کے نیچے سے ہاتھ نکال کر اس نے دونوں کو چادر اڑھائی اور کمرے میں پڑی راکنگ چیئر پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں بچے کے رونے کی آواز دوبارہ آنے لگی ساتھ ہی کسی عورت کے بولنے کی بھی جو اس بچے کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا فلیٹوں کی دیواریں اتنی پتلی ہو سکتی ہیں کہ پڑوسیوں کی آوازیں ایک دوسرے کے گھر تک جائیں۔ اس نے سوچتے ہوئے آوازوں

پر توجہ دی اچانک پردوں میں ہل چل ہونے لگی لگتا تھا کہ کوئی لڑائی، کشتی یا بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ آوازیں بھی اب تین چار مختلف لوگوں کی تھیں لیکن کوئی آواز واضح نہ تھی۔ وہ تو گویا کرسی پہ جم سی گئی کتاب گود میں پڑی تھی اور اس کی خود کی آواز جانے کہاں پھنس گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں مختلف آیات پڑھنی شروع کر دیں لیکن خوف نے تو گویا یادداشت پر بھی اثر ڈالا تھا۔ ہر سورت ادھوری چھوڑ کر وہ کچھ اور پڑھنے لگتی اچانک ارحم نے آواز دی۔

"مما۔ پانی....." ارحم کی آواز نے جمود توڑ دیا سب کچھ نارمل ہو گیا اس نے جلدی سے اٹھ کر جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور ارحم کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا سر گود میں رکھ لیا اس کے بال سہلانے لگی۔ گویا اپنے خوف سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگی۔

بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد اس نے آج پڑوسیوں سے ملنے کا پروگرام بنایا مگر کس کے گھر جائے اس کے فلور پر آٹھ فلیٹ تھے جن میں سے دو تو خالی تھے انہیں آئے ہفتہ ہو چکا تھا لیکن کسی پڑوسی نے جھانکا تک نہیں تھا۔ اسے اس بات پر اعتراض ضرور تھا مگر اب یہ ان کا ذاتی گھر تھا اس لیے یہاں انہیں سب سے مل کر رہنا تھا کرائے کے گھروں میں اس نے راہ و رسم کبھی نہ بڑھائی تھی۔

"بیٹا امی ہیں۔" اس نے لنچ کے لیے پاؤ کباب بنایا تھا اور اسی بہانے وہ اپنے فلیٹ سے دو فلیٹ چھوڑ کر ان کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اچھے طریقے سے خوش آمدید کہا گیا تو کم سن بچی اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر برتن کچن میں رکھنے چل دی۔ گھر مکینوں کی خوش ذوقی کا پتا دے رہا تھا۔

"آپ 506 سے آئی ہیں۔" آنے والی خاتون جن کا نام یاسمین تھا نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں ابھی گھر سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھی اسی لیے کسی سے ملاقات نہیں ہو پائی۔" سامعہ نے وضاحت کی۔

"جی ہاں ٹائم تو لگتا ہے سیٹ ہونے میں۔" خاتون کافی خوش شکل تھیں جانے اسے کیوں ایک انسیت سی محسوس ہو رہی تھی جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔

"آپ کے گھر کام والی آتی ہے؟ کیا آپ اسے میرے پاس بھیج دیں گی؟" سامعہ نے لگے ہاتھوں ایک کام بھی بتا دیا۔

"جی ضرور بھیج دوں گی اگر اس کے پاس ٹائم ہوا تو۔"

اس کے بعد جب وہ وہاں سے اٹھی تو کافی خوش تھی کیونکہ وہ خاتون اس سے بہت بڑی نہیں تھیں۔ اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر وہ کافی پُرسکون اور مطمئن تھی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو گیا تھا دروازے پہ لگا لاک کھول کر اس نے قدم اندر رکھا تو اندر کا منظر ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ لاؤنج کی کوئی شے اپنی جگہ پر نہیں تھی لگتا تھا یہاں کسی نے اچھی خاصی دھما چوکڑی مچائی تھی۔ کشن فرش پر پڑے تھے سینٹر ٹیبل پر کرسٹل کا گلدان گر کر ٹوٹا پڑا تھا یہاں تک کہ صوفے کرسیاں سب اپنی جگہ سے سرکی ہوئی تھیں۔ سامعہ نے گھبرا کر دروازہ بند کیا دوبارہ یاسمین کے فلیٹ کی طرف چل دی۔ بیل بجا کر اس دفعہ اسے کافی انتظار کرنا پڑا اسی بچی نے دروازہ کھولا لیکن اس دفعہ لہجے میں اجنبیت محسوس ہوئی۔

"بیٹا امی ہیں انہیں بلا دو جلدی سے پلیز۔"

سامعہ کے پاس تمہید باندھنے کا وقت نہیں تھا لیکن خلاف توقع اس بچی نے "امی نہیں ہیں۔" کہہ کر دروازہ بند کر دیا اور وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی چند سیکنڈوں کے بعد وہ لفٹ میں تھی۔ بچوں کی وین آنے کا وقت ہو گیا تھا جیسے ہی وہ گیٹ پہ پہنچی اتفاق سے اسی وقت وین آ گئی اب وہ بچوں کو لے کر اپنی امی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

امی اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

بچے ویسے ہی لاعلم تھے اور اپنی مما کے عجیب و غریب رویے پر حیران تھے۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے۔" امی نے اسے پانی پلا کر پُرسکون کیا اور اپنے پاس بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ صائمہ بچوں کو کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں لے جا چکی تھی ابا جان کرسی پہ بیٹھے اس کے جواب کے منتظر تھے۔ سامعہ نے پورے ہفتے کی روداد ایک ہی سانس میں پیش کر دی۔

"ویسے تم نے کاشان کو بتایا؟" امی پریشان نظر آ رہی تھیں۔

"نہیں! میرا موبائل تو گھر پر ہی تھا میں تو جلدی جلدی نکل آئی۔" اس نے بتایا۔

"اچھا ہی ہوا خوامخواہ وہ پریشان ہوتا۔" امی کو کاشان کا بھی خیال تھا۔

"اب تم کاشان کے آنے تک یہیں رک جاؤ۔" مشورہ معقول تھا، بس گھر جا کر بچوں کے کپڑے لے آئے۔

وہ صائمہ کو لے کر فوراً گھر آ گئی چابی اس نے صائمہ کے حوالے کر کے خود دعائیں پڑھنے لگی۔

"ماشاء اللہ۔" صائمہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا اور بسم اللہ کر کے قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے پورا گھر شیشے کی طرح جگمگا رہا تھا ہر چیز اپنی جگہ پر تھی اور سامعہ کرسٹل کے اس گلدان کو گھور رہی تھی جو ٹیپ کرچیوں کی شکل میں پورے کمرے میں بکھرا ہوا تھا۔ اب اپنی جگہ بڑی شان سے جگمگا رہا تھا۔

صائمہ بھی پورے گھر میں گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگی وہ کافی متاثر نظر آ رہی تھی۔ اچانک صائمہ کی نظر کچن کے اوپر دو چھتی پر پڑی جس کا کھڑکی نما دروازہ بند تھا۔

"آپا اس میں کیا رکھا ہے آ...... ؟" اس نے پوچھا۔

"اس میں؟ اس کو تو کھولا بھی نہیں کاشان نے کہا کہ کیا ضرورت ہے۔" سامعہ نے جواب دیا اور چائے بنانے لگی یکایک اسے یاد آیا کہ وہ پلاؤ پکا کر گئی تھی لیکن کچن میں ایسے کوئی آثار نہیں تھے یہاں تک کہ وہ برتن بھی صاف ستھرا اپنی جگہ پر موجود تھا جس میں پلاؤ بنایا تھا۔

"صائمہ میرا موبائل نہیں مل رہا اپنا موبائل دو ذرا میں کاشان کی خیریت تو پوچھ لوں دو دن ہو گئے نہ انہوں نے فون کیا اور نہ ہی میں نے۔" سامعہ نے صائمہ کے فون سے کاشان کو فون ملاتے ہوئے کہا لیکن ہر بار کاشان کا موبائل آف آ رہا تھا۔

کاشان کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ آج کاشان کو آنا تھا رابطہ کوئی ہو نہیں پا رہا تھا لہٰذا گھر جانا ضروری تھا اس کے اس قدر خوفزدہ ہونے کے سبب امی نے ایک دن کے لیے صائمہ کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی ان کا خیال تھا کہ تنہائی اور نئی جگہ کی وجہ سے سامعہ پریشان تھی۔

رات کے کسی پہر اسے پردہ سرکنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے اس کے پیروں کی انگلیوں کو ہلایا۔ کسی برف کے ٹکڑے کا لمس ایسی ٹھنڈک اس کے باوجود اس ٹھنڈک سے وہ یکدم اٹھ بیٹھی سامنے پوری اسکرین کھلی ہوئی تھی۔ پردہ پوری طرح ایک طرف تھا اور اس اسکرین پر جیسے کوئی فلم چل رہی تھی۔ اس کے کچن کے جیسے کچن میں ایک عورت کھانا پکا رہی تھی۔ اس کی خوب صورت بالوں کی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اس نے پلٹ کے سامعہ کو دیکھا اور مسکرائی۔ سامعہ کے ذہن سے یاسمین باجی کی تصویر ٹکرائی۔ اس عورت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جیسے اپنے پاس بلایا اتنے میں ایک تقریباً آٹھ نو ماہ کا بچہ جو پاس ہی بیٹھا کھیل رہا تھا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا اور اس عورت کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اس نے اسے پیار کیا اور غالباً اسے پلیٹ کے کھانا نکال کر دینے لگی۔

"آپا! سوئی نہیں؟" صائمہ نے کروٹ لی اور سب کچھ غائب۔

"آپا! ایسے کیوں بیٹھی ہیں طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔" صائمہ اٹھ کر اس کی طرف آ گئی۔

"صائمہ پردہ تم نے ہٹایا تھا ڈور سے؟" اس نے سہمے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں آپا مگر اس میں ایسی کیا بات ہو گئی۔" صائمہ اب بھی نہیں سمجھی تھی۔

"یہ خود کیسے سرک گیا۔" سامعہ اب تک خوف زدہ تھی۔

"یہ لیں ٹھیک کر دیا آپ میری جگہ سو جائیں شاید نیند آ جائے ویسے تو اذان ہونے والی ہے۔" صائمہ نے پردہ درست کر کے اسے تسلی دی۔

"چلو پھر نماز پڑھ لیتی ہوں۔" سونے کا ارادہ ترک کر کے اس نے نماز کا ارادہ کر لیا۔ نماز کے بعد بستر پر لیٹ کر جانے کب وہ سو گئی۔ آنکھ کھلی تو صائمہ بچوں کو ناشتے سے فارغ کروا کر اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی جبکہ لنچ کی تیاری کر چکی تھی۔ اسے اس لیے اپنی بہن پہ بے حد پیار آیا۔ آج بچوں کی بھی اسکول سے چھٹی ہوئی تھی اور بچے بہت خوش تھے۔

"آپا چلیں کسی پڑوسی کے گھر چلتے ہیں۔" صائمہ گھر میں ٹک کے بیٹھنے والی کہاں تھی، سامعہ لاکھ بہانے بنانے کے باوجود یاسمین باجی کے دروازے تک پہنچ گئی۔

"بیٹا! امی ہیں۔" دروازہ اسی بچی نے کھولا خلاف توقع اس بچی نے اثبات میں گردن ہلائی اور اندر آنے کی جگہ دیتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

"السلام علیکم! میں مسز علی ہوں۔" ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والی خاتون نے آتے ہی اپنا تعارف کروایا، صائمہ نے اپنا اور سامعہ کا تعارف کروایا۔

"میں دو تین دن پہلے بھی آئی تھی آپ کے گھر یاسمین باجی سے ملاقات ہوئی تھی، نظر نہیں آ رہیں کہاں ہیں وہ۔" سامعہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یاسمین! یہ کون ہیں؟" مسز علی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں آئی تھی کچھ دن پہلے اسی بچی نے دروازہ کھولا تھا ہے ناں بیٹا؟" سامعہ بے اختیار بولتی چلی گئی۔

"لیکن ہم تو کل ہی آئے ہیں۔ میرے بہنوئی کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ہم سب پندرہ دن سے حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔" مسز علی نے تفصیلاً بتایا تو سامعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے

ساتھ ہی صائمہ بھی اٹھ گئی اور اس کے پیچھے باہر آ گئی۔

"کیا آپا تم بھی ناں! بعض دفعہ بہت عجیب حرکتیں کرتی ہو۔" صائمہ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے کاشان کو صائمہ کے فون سے کال کی لیکن اب بھی کال نہیں مل سکی۔ صائمہ گھر جانے کی تیاری کرنے لگی اور وہ دعا کر رہی تھی کہ کاشان ابھی آ جائے لیکن ہر دعا اپنے وقت پر پوری ہوتی ہے۔ صائمہ چلی گئی کہ امی ابو کو بھی اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ شام بھی گذر گئی اس نے بچوں کو کھانا کھلا کر کارٹون لگا دیے۔ رات کے دس بج چکے تھے خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے الماریاں درست کیں، گھر کی صفائی کی، کچن سمیٹا اور شاور لے کر بچوں کے پاس ہی میگزین لے کر بیٹھ گئی اور ورق گردانی کرنے لگی کہ اچانک ڈور بیل کی آواز پر چونک گئی۔ بچے بھی سوالیہ نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگے۔

"کون ہے؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا کاشان کی آواز سن کر اس میں جانے کہاں سے اتنی پھرتی آ گئی کہ تیزی سے دروازہ کھول کر وہ کاشان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کاشان اچانک اس کا یہ ردعمل دیکھ کر گھبرا گیا گھر میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد سامعہ نے تمام واقعات و حالات اس کے سامنے رکھے۔ وہ بظاہر اس کے سامنے مطمئن اور پُرسکون رہنے کا تاثر دیتا رہا لیکن بات پریشان کن تھی اس لیے وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ انتہائی تھکن کے باوجود آج اس نے جاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سامعہ کو کاشان کی موجودگی کا احساس ہی پُرسکون کرنے کے لیے کافی تھا اور آج تو بغیر مطالعہ کیے ہی وہ جلد سو گئی۔ کاشان نے لیپ ٹاپ نکالا اور اپنے آفس کا کام کرنے لگا کام کرتے کرتے اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ رات کے تین بج رہے تھے اور گردن جھکائے جھکائے اکڑ سی گئی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر دائیں بائیں کر کے ورزش کی اسے محسوس ہوا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

"کیا یہ سامعہ کی باتوں کا اثر ہے؟" اس نے سوچا لیکن نہیں اس کے کمرے کے دروازے پہ ایک بلی تھی جو خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کاشان نے جلدی سے سوئی ہوئی سامعہ کی طرف دیکھا اور پھر بلی کی طرف بڑھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی البتہ ہلکی ہلکی میاؤں میاؤں کی آواز اسے کچن کی طرف لے آئی تھی جہاں صرف آواز تھی بلی کہیں نہیں تھی۔ اس نے بہت تلاش کی کوئی ایسا راستہ جس سے بلی آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

[illegible] اپنے بیڈ کی طرف آیا۔ نیند جو اب آنکھوں میں [illegible] سامعہ [illegible] میں کچھ وقت لگ گئی۔

☆☆☆

"ارے رے کاشان بھائی آپ؟ کیسے ہیں آپ؟" [illegible] کاشان [illegible] بیٹھے کاشان [illegible] ہو۔

"[illegible] بھائی [illegible] آپ [illegible] ہے؟" [illegible] کاشان [illegible]

"[illegible] بھائی خیر تو ہے۔"

"آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے۔" کاشان نے سنجیدگی سے کہا۔

"شاید چھ مہینے سے۔" [illegible] سوچتے ہوئے کہا۔

"رحمان صاحب کا گھر کہاں ہے [illegible]"

کاشان نے پچھلے [illegible] میں پوچھا۔

"وہ تو [illegible] سے [illegible] ہوتے ہیں۔" [illegible] جواب سے مایوس ہوئی۔ "بس گھر بیچنے کے سلسلے میں [illegible] آتے تھے۔"

کاشان نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور واپسی کا راستہ اختیار کیا گاڑی پارک کر کے وہ لفٹ کی طرف بڑھا تو اس کی نظر کاؤنٹر پر بیٹھے طاہر پہ پڑی وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کی جانب آ گیا۔

"ارے! کاشان بھائی کیسے ہیں؟ خیریت ہو گیا کوئی مسئلہ تو نہیں؟" طاہر کا تعلق فلیٹس کی انتظامیہ سے تھا اس نے [illegible] پوچھا۔

"مسئلہ تو ہے طاہر صاحب کیا اس فلیٹ کے بارے میں آپ نے کوئی غیر معمولی بات کبھی سنی ہے؟" طاہر [illegible] لگا تھا کہ اچانک اس کی کرسی کی [illegible] نے اٹھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ اس پر کوئی بوجھ ہے جو اسے اٹھنے نہیں دے رہا۔ کاشان نے اس کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو لگا کسی اور نے ہاتھ کھینچ لیا۔ [illegible] طاہر بے بسی سے اسے دیکھنے لگا اور جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ کاشان وہاں سے ہٹ گیا اور لفٹ میں داخل ہو گیا۔

"کیا بات ہے کاشان آج آپ کہاں بزی رہے اور اب بھی آپ کا دماغ کہیں اور ہی ہے۔" سامعہ نے کھانا کھاتے ہوئے بھی اسے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ طاہر والا واقعہ سنا کر اسے مزید پریشان

نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

آج صبح سے موسم ابر آلود تھا۔ کاشان آفس کے لیے تیار ہو کر گاڑی تک آیا تو ہلکی سی پھوار شروع ہو چکی تھی اور آفس تک پہنچتے پہنچتے بارش باقاعدہ شروع ہو گئی۔ وقفے وقفے سے بارش نے پہلے شہر بھر میں جل تھل کر دیا تھا، شام تک پورا شہر بری طرح متاثر ہو چکا تو ایسے میں سب سے پہلے بجلی متاثر ہوتی ہے۔ ایمرجنسی لائٹس کی روشنی میں وہ اپنے بچوں سمیت کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"کہاں ہیں کاشان؟ بچے بہت ڈر رہے ہیں، لائٹ بھی چلی گئی ہے۔" اس نے اپنے خوف کو چہرے سے دور رکھتے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ تو شکر تھا کہ کاشان نے آتے ہی اسے نیا موبائل دلوا دیا تھا۔

"یار بہت ٹریفک جام ہے گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔ تم ایمرجنسی کی چارجنگ ختم ہونے سے پہلے ہی موم بتیاں نکال کے رکھ لو۔" کاشان نے مشورہ دیا جس پر عمل وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ موسم قدرے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بچے ہلکی پھلکی باتیں کرتے کرتے وہیں سو گئے تھے ایمرجنسی لائٹ کی روشنی مدھم ہونے لگی تھی اس نے دو موم بتیاں جلائیں اور کچن کے شیلف میں رکھ دیں۔ کاشان ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ صوفے سے ٹیک لگائے اسے بھی ہلکی سی جھپکی آ گئی کہ کسی نے دھیرے سے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی کہ شاید کاشان آ گیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا وہ بری طرح ڈر گئی۔

کچھ ہی دیر کے بعد بجلی بھی آ گئی اور کاشان بھی۔

"کاشان گھر چینج کر لیں؟" سامعہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا وہ جانتی تھی یہ ممکن نہیں۔ ابھی آئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا۔

"اتنا آسان ہے کیا؟" کاشان نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

موسم آج صبح سے ہی بہت خوبصورت تھا۔ بچے اسکول جا چکے تھے، کاشان آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک موبائل کی رنگ ٹون کی آواز کچن میں گونجی، وہ کافی بناتے بناتے چونک گئی کیونکہ اس کا موبائل تو لاؤنج میں ٹیبل پر تھا اور کاشان کا کاشان کے پاس پھر؟ وہ تیزی سے کچن سے نکل کر کاشان کی طرف دوڑی۔

"کاشان!" خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کاشان آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی سیٹ کر رہا تھا آئینے میں سامعہ کا خوفزدہ چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ پلٹ کر سامعہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور وجہ پوچھنے لگا جس پر اس نے کچن کی طرف اشارہ کیا وہ بھی تیزی سے کچن کی طرف آیا جہاں موبائل کی آواز گونج رہی تھی اور یہ آواز واضح طور پر اس دو چھتی سے آ رہی تھی، جس پر تالا پڑا ہوا تھا دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا سامعہ کو یہ اس کے گمشدہ موبائل کی آواز لگ رہی تھی۔ موبائل کی آواز مسلسل اور تیز تھی کاشان نے کچھ دیر سوچا اور کسی کو کال ملانے لگا۔ سامعہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ آواز بھی اچانک بند ہو گئی تھی۔ کاشان ایک کے بعد دوسری کال کیے جا رہا تھا اور آدھے گھنٹے کے بعد ہی سامعہ کے والد ایک بزرگ کو لے کر ان کے گھر چلے آئے ساتھ ہی ایک تالا کھولنے والا بھی ان کے ہم راہ تھا۔

"میاں گھر لینے سے پہلے کسی سے مشورہ کیا تھا؟" بزرگ نے بغور کاشان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں! دراصل سب بہت جلدی جلدی ہو گیا بیچنے والے کو بھی جلدی تھی اور مجھے بھی فوری ضرورت تھی۔" کاشان نے چور نظروں سے شرمندہ ہوتے ہوئے سسر کی طرف دیکھ کر کہا جب کہ وہ بزرگ اب تیزی سے زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے اور اب سب مرد کچن میں تھے۔ تالا توڑنے والے نے تالا توڑ دیا تھا۔ وہ کنڈی کھولنے لگا تھا کہ اسے یکدم کرنٹ کا جھٹکا محسوس ہوا وہ جس اسٹول پر کھڑا تھا زور زور سے ہلنے لگا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اونچائی زیادہ نہیں تھی اس لیے اسے زیادہ چوٹ تو نہ لگی لیکن وہ کافی خوف زدہ ہو گیا تھا اس نے تیزی سے اپنا سامان سمیٹا اور جانے لگا اسے اجرت کی بھی پروا نہیں تھی۔ کاشان نے جتنے پیسے اس کے ہاتھ میں رکھے وہ بغیر کسی بحث کے لے کر تیزی سے فلیٹ سے نکل گیا۔ اس کا وہ ہاتھ اب تک اس کرنٹ سے سن ہو رہا تھا جو اسے کنڈی کھولتے وقت لگا تھا۔

سب ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہ گئے اور کنڈی کھولنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔

"مجھے تو کچن میں جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا ہے۔" سامعہ کا خوف بجا تھا لیکن کام شروع ہی کچن سے کرنا ہوتا ہے، سو جانا تو تھا۔ کاشان اس کے ساتھ کچن میں آیا تو گویا کسی نے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو دو چھتی کی کنڈی نہ صرف کھلی ہوئی تھی بلکہ دروازہ بھی پوری طرح کھلا دعوت دے رہا تھا۔ سامعہ الٹے قدموں واپس ہو گئی اور کاشان کو بھی باہر کھینچنے لگی لیکن کاشان آج اس راز کو افشا کرنا چاہتا

تھا چنانچہ دعائیں پڑھتے ہوئے اس نے اسٹول رکھ کر اندر جھانکا ایک عجیب سی بو اچانک کچن میں پھیل گئی۔ سامعہ کا موبائل بالکل آگے رکھا تھا، کچھ بیکار ٹوٹی پھوٹی چیزیں لکڑیاں اور گتے کے چھوٹے بڑے ڈبے۔ اچانک اس کی نظر ایک اسکول بیگ پر پڑی جو کبھی نیلے رنگ کا رہا ہوگا مگر وقت کی دھول نے اسے خیالی رنگ میں بدل دیا تھا۔ کاشان نے اسے بھی اپنی طرف کھینچ لیا اور سامعہ کا موبائل اٹھا کر دو چھتی کا دروازہ بند کر کے نیچے اتر آیا۔

"کاشان! بیگ نہ کھولیے گا۔" سامعہ نے اسے بیگ جھاڑتے دیکھا تو خوفزدہ ہو کر بولی۔

"کیوں بھئی؟ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات پتا چل جائے۔" کاشان نے بیگ جھاڑتے ہوئے کہا۔ بیگ کی آگے کی جیب سے ایک پنسل تراش، ایک ڈرائنگ بک، دو تین رنگین پنسلیں، ڈرائنگ بک کو کھولا تو ششدر رہ گیا اس کے کاغذ بالکل نئے لگ رہے تھے اور پہلے ہی صفحے پر انگلش میں "HELP" لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہمیں پولیس سے مدد لینی چاہیے۔" کاشان نے آج اپنے دوست جعفر سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جعفر کا تعلق بھی پولیس سے ہی تھا لیکن وہ سادہ کپڑوں میں رہا کرتا تھا کہ اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ بات بہت سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی اسے ڈر تھا کہ سامعہ ڈپریشن کا شکار نہ ہو جائے بچوں کی پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔

"شاید پولیس کی مدد بھی لینی پڑے لیکن پُر اسرار واقعات کا پولیس سے کیا تعلق پہلے اس راز سے پردہ اٹھنا چاہیے۔" جعفر بھی تفصیلات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

"پچھلے مالک مکان کی ہسٹری نکلوانی پڑے گی۔" جعفر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں کرتا ہوں کچھ، تم بھابی کو جب تک ان کی والدہ کے گھر ہی شفٹ کر دو تاکہ تمہیں ان کی طرف سے بھی بے فکری ہو اور انہیں بھی۔" جعفر نے مشورہ دیا اور اگلی ملاقات تک کے لیے الوداع کر کے باہر نکل گیا۔

"سامعہ تم صبح ساتھ لے جانے کا سامان رکھ لینا بچوں کے ضروری کپڑے وغیرہ، میں آنٹی سے ان کے گھر کے اوپر والے خالی پورشن کی بات کرتا ہوں کچھ دن یہاں سے الگ رہنا پڑے گا۔" سامعہ پہلے ہی بہت خوفزدہ تھی فوراً راضی ہو گئی اور صبح کی تیاری کرنے لگی۔

چیزیں سمیٹتے بچوں کو سلاتے سلاتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے گیلری ڈور کا پردہ برابر کیا اور بستر پر لیٹ کر دن بھر کی باتیں سوچنے لگی۔ کاشان سو چکا تھا اس نے سائڈ لیمپ بند کیا اور سونے کے ارادے سے کروٹ لی ہی تھی کہ پردہ سرکنے کی واضح آواز سنائی دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس طرف دیکھا جہاں آج انگلش میں HOPE لکھا ہوا تھا اس نے جلدی جلدی دعائیں پڑھنی شروع کر دیں اور چادر میں منہ چھپا لیا۔

☆☆☆

آفس میں لنچ ٹائم تھا کہ جعفر کی کال آ گئی اور اب دونوں آفس کے قریبی ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔

"آدھا کام تو سمجھو ہو گیا۔" جعفر نے کھانا کھاتے کھاتے اطلاع دی تو کاشان کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

"مطلب۔"

"مطلب یہ کہ جناب آپ نے جس شخص سے یہ فلیٹ خریدا ہے اس کی تفصیلات مل گئی ہیں بلکہ اس کا فون نمبر بھی حاصل کر لیا ہے میں نے۔" جعفر نے اپنے موبائل سے ایک نمبر اس کو سینڈ کیا اور کچھ دیر بعد وہ اس سے فون پر بات کر رہے تھے۔

"میں نے یہ فلیٹ کبھی کبھی پاکستان آنے پر استعمال کے لیے لیا تھا تاکہ ہوٹل کا خرچا بچے، میں سال میں ایک دفعہ فیملی کے ساتھ پاکستان آتا ہوں لیکن جب بھی اسے سیٹ کرنے کا سوچا کچھ نہ کچھ رکاوٹ آ گئی۔" رحمان صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم دوبارہ کینیڈا آ گئے سوچا جب رہ نہیں سکتے تو بیچ ہی دیتے ہیں سو بیچ دیا۔"

"آپ نے جن سے خریدا تھا ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں اگر زحمت نہ ہو تو۔"

"میں نے تو خود اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے ہی لیا تھا۔ تیمور نام تھا اس اسٹیٹ ایجنٹ کا اسی نام سے ایجنسی بھی تھی لیکن جب بیچنے کے لیے رابطہ کیا تو نہیں ہو سکا اور نہ ہی اب وہ ایجنسی وہاں ہے پھر تو آپ کو پتا ہی ہے، وقار کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔" رحمان صاحب نے بہت خلوص سے ان کو مطلوبہ سوالات کے جواب دیے۔

"انور ملک نام تھا مالک مکان کا یہ مجھے یاد ہے۔" ساری گفتگو میں صرف یہ بات کام کی نکلی۔

معاملہ جوں کا توں کھڑا تھا کاشان نے مایوس ہو کر گردن جھکا لی۔

"شاید مجھے بھی اپارٹمنٹ بیچ دینا چاہیے۔" اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"ارے نہیں یار، ابھی تو ایک کوشش اور کرتے ہیں۔ یہ سب اسٹیٹ ایجنٹ ایک دوسرے کو جانتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ جائے تو شاید کچھ بات واضح ہو جائے۔" جعفر نے اُمید کا ایک دیا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆☆☆

"مما! مما! میری میتھ کی بک اور کلرز نہیں مل رہے شاید گھر رہ گئے۔" ارحم نے اسکول سے آتے ہی ماں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ نانی کے گھر آنے کے بعد ارحم بیمار ہو گیا تھا۔ تین چار دن کی چھٹی کے بعد آج اسکول گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ کل چیزیں فلیٹ میں رہ گئی ہیں۔

"اچھا... اچھا! پاپا آجائیں تو ان سے کہتی ہوں وہ دیں گے بک شاپ سے۔"

"نہیں مما مجھے وہی بک چاہیے اس میں ٹیچر نے ایکسرسائز بھی کروائی ہوئی ہیں۔" ارحم تیسری کلاس میں تھا اس کی کتب کچھ اس طرح کی تھیں۔

"اچھا! چلو دیکھتے ہیں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے ارحم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

شام کو کاشان کو آتے آتے دیر ہو گئی تھی۔ ارحم کی ضد تھی کہ کتاب آج ہی چاہیے سو کھانا کھاتے کھاتے لوگ گئے تھے مگر ان کو جانا ضروری تھا... چونکہ سامعہ ہی جانتی تھی کہ بچوں کی چیزیں کہاں رکھی ہیں سو سامعہ ساتھ تھی۔ ماں نے ڈھیر ساری دعائیں اس پر پڑھ کر پھونک دیں اور وہ خود بھی دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے کاشان کے ساتھ ہولی۔

کاشان نے دروازہ کھولا اور اللہ کا نام لے کر اندر قدم رکھ دیا۔ لائٹ جلا کر پورے فلیٹ کا جائزہ لیا کوئی غیر متوقع بات نظر نہیں آئی پھر بھی سامعہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے بچوں کے کمرے سے مطلوبہ اشیاء کے علاوہ بھی کچھ ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈالیں۔ بچوں کے کپڑے بھی جلدی جلدی بیگ میں رکھے۔ موقع غنیمت جان کر اس نے اپنے بھی کچھ کپڑے رکھنے کا سوچا اور اپنے کمرے کی الماری کھولی الماری کے پٹ کے اندرونی حصے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس پر بڑے واضح انداز میں کوئی ایڈریس تحریر تھا بے ساختہ اس نے کاشان کو آواز لگائی جو کچن کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرایا ہوا آواز پر لپکا جہاں لرزتی کانپتی سامعہ سفید چہرے کے ساتھ الماری کھولے کھڑی تھی۔ اس نے بھی الماری میں چسپاں کاغذ دیکھا تو حیران رہ گیا کاغذ اتار اجو

بڑا سالی اتر گیا۔ سامعہ کی کیفیت کے باعث اس نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور الماری بند کر کے بیگ اٹھائے سامعہ کو وہاں سے لے آیا۔ سامعہ کا سانس پھولا ہوا تھا۔

کاشان کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی پتا تھا جس کی تلاش اس کو دوسرے طریقے سے تھی۔ اب یہ جعفر سے کچھ پوچھنا تھا جو کوئی بات نہیں چل رہا تھا۔ کاشان اب جعفر سے ملنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے پراسرار کہانی سے کسی طاقت کو پہنچ رہی تھی۔ "شاید کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ہماری مدد ہی کی کوئی بات ہو جائے۔" جعفر کا بھی خیال تھا اس نے کاشان کو تسلی سے بات کرنے کی ہدایت دی اور خود اس پتے کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

جعفر نے لاہور جاتے ہوئے اپنے ساتھ سادہ لباس میں دو کانسٹیبل بھی لے لیے تھے تاکہ کسی بھی غیر متوقع حالات سے نمٹا جا سکے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے ہی ایک رکشہ والا لیا جو لاہور کی گلی گلی سے واقف تھا اس نے سیدھا اس مطلوبہ گھر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ دروازہ بجانے پر ایک... بزرگ باہر برآمد ہوئے۔

"یہ انور ملک صاحب کا گھر ہے؟" جعفر نے ہوا میں تیر چلایا۔ بزرگ کی آنکھوں میں اس نام سے شناسائی کی چمک ابھری تھی اس نے فوراً محسوس کر لی آخر اس کا رات دن کا کام تھا چہرے پڑھنا وہ خوب جانتا تھا۔

"نہیں یہ تو میرا گھر ہے نور الٰہی نام ہے میرا۔" بزرگ نے جواب دیا۔

"کیا آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"آپ کو کیا کام ہے ان سے؟" سوال کے بدلے سوال پر جعفر مسکرا دیا۔

"بزرگو! اندر بیٹھ کر بات ہو سکتی ہے، میں دراصل کراچی سے آیا ہوں۔" وہ واقعی تھکا ہوا تھا۔

"اوہ! ہاں ہاں آؤ بیٹا۔" انہوں نے بڑی شرمندگی سے جواب دیا اور ایک طرف ہو کر اندر آنے کی جگہ دی۔ ایک بزرگ اماں جی بھی اندر موجود تھیں وہ دونوں چھوٹے سے صحن میں پڑے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اماں جی صراحی سے اسٹیل کے گلاس میں پانی لے آئیں۔

"اب بتائیں بابا جی انور ملک کو آپ جانتے ہیں؟" اس نے گلاس اماں جی کو دیتے ہوئے پوچھا تو اماں جی بھی ٹھٹک گئیں۔

"کیوں بیٹا؟ خیر ہے؟" اماں جی نے پوچھا اب تو جعفر کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اسے جانتے ہیں۔

"انور میرا داماد تھا بیٹا۔" آخر کار بابا جی نے انکشاف کر دیا۔

"تھا سے کیا مطلب؟" جعفر نے ان کے چہرے پر چھائی اداسی محسوس کر لی تھی۔

"دراصل میری بچی کی شادی تو منور ملک سے ہوئی تھی اچھا آدمی تھا وہ، بچی بھی خوش تھی لیکن خوشی اسے راس نہ آئی، ایک سال بعد ہی ایکسیڈنٹ میں وہ فوت ہو گیا۔ ابھی اس کا بچہ ایک مہینے کا ہی تھا سنا ہے اس نے کراچی میں ایک فلیٹ میری بچی کے نام کر رکھا تھا۔ میں خود غریب آدمی تھا جب اس کے دیور نے اپنا رشتہ ڈالا تو ہم کو لگا اچھا ہی ہوگا سو ہم نے ہاں کر دی۔" بابا جی نے گلے میں پڑے رومال سے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے چھپی آنکھوں سے نمی صاف کی اور ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"پھر! پھر کیا ہوا؟" جعفر نے ان کے زانوں پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

"چند دن تو بیٹا وہ خوش لگ رہی تھی پھر اس نے ہم سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ دوری ایک ہی تو اولاد تھی انور سے کہا کہ ہفتہ میں ایک دن تو ملنے بھیج دیا کرو تو وہ چیخ پکار کرنے لگا کہ میں اسے طلاق دے دیتا ہوں اپنے ہی گھر رکھو۔" بابا جی کی آواز رندھ گئی اور وہ چپ ہو گئے دونوں میاں بیوی آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ جعفر نے بھی خاموشی سادھ لی لیکن وہ جلد از جلد سب جاننا چاہتا تھا۔

"معاف کرنا بیٹا پرانی باتیں یاد دلا دیں تم نے تو دل بھر آیا۔" بابا جی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں، ہم کل بات کر لیں گے میں ابھی دو چار دن ہوں لاہور میں۔" جعفر نے ان کو شرمندگی سے بچاتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا اب بتانے کو کچھ رہا ہی نہیں بس ایک دن پتا چلا میری بچی اپنا بیٹا لے کر کہیں چلی گئی۔ اس نے بہت برے برے الزام لگائے ہماری بچی پر لیکن بیٹا وہ ایسی نہیں تھی، وہ تو چودہ جماعت پاس سمجھدار لڑکی تھی۔ جانے کہاں چلی گئی شاید کبھی پلٹ آئے۔" ان کے لہجے میں ایک دم توڑتی اُمید تھی ماں جی غالباً روتے روتے کمرے میں چلی گئی تھی کہ وہ مزید اس درد کو نہیں سننا چاہتی تھیں۔

"آپ نے تلاش نہیں کیا۔" انہوں نے جس بے بسی سے جعفر کی طرف دیکھا وہ اسے شرمندہ کر گیا۔

"ویسے بیٹا ہمارے گھر کا پتا آپ کو کس نے بتایا۔" بابا

کیپٹن جارج کسٹر نے امریکی قبائل پر چڑھائی کا ارادہ کر دیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "بہادرو! یقین کرو، تم ان چند سو لوگوں کو برباد کر کے رکھ دو۔ اور امریکا کی تاریخ میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔" جارج کسٹر وہ آدمی تھا جسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا نام تاریخ میں مشہور ہو جائے۔ وہ جدھر سے گزرے لوگ اشارہ کریں کہ وہ دیکھو امریکا کا بہادر انسان جا رہا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ "کیپٹن کیا ہمیں قبائلیوں کی تعداد کا علم ہے۔"

"ہاں۔ وہ تین چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔" کیپٹن نے جواب دیا۔ لہٰذا تین چار سو کے چکر میں وہ لوگ قبائلیوں سے جا ٹکرائے۔

اور جب اِدھر اُدھر کی جھاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں قبائلی نکل نکل کر سامنے آنے لگے تو کیپٹن اور اس کے آدمیوں کے ہوش اڑ گئے۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قبائلیوں نے انہیں چن چن کر مار دیا۔ یہ واقعہ 1876 میں پیش آیا تھا۔

مرسلہ: نعیم الدین، لسبیلہ بلوچستان

سیزر سینیٹ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ کہانی ہے روم کے مشہور کردار جولیس سیزر کی۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اس کی بیوی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں سیزر۔ آج تم سینیٹ میں نہیں جاؤ گے۔"

"وہ کیوں؟" سیزر نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے لیے ایک برا خواب دیکھا ہے۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"خواب؟" سیزر مسکرا دیا۔ "کیوں ایسے واہموں کو ذہن میں آنے دیتی ہو۔"

"نہیں سیزر۔ بہت ہی بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔" لیکن سیزر نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کا مذاق اڑاتا ہوا سینیٹ کے اجلاس میں چلا گیا اور وہاں اسے اپنی اس غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑ گئی۔ اس پر حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر کر مار دیا۔

مرسلہ: انعام حفیظ، کوئٹہ

جی کا ذہن یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ دو سال بعد اس موضوع کو چھیڑنے والا کون ہے کہاں سے آیا۔

"یہ بھی پتا چل جائے گا فی الحال یہ بتائیں کہ آپ مجھے انور کے گھر کا پتا دے سکتے ہیں۔" یہاں جعفر کا کام ختم ہو چکا تھا اسے لگتا تھا کہ معاملہ اب اس کی گرفت میں آتا جا رہا ہے۔

بابا جی کے گھر سے نکل کر اس نے کاشان کو رپورٹ دی چند ضروری باتیں پوچھیں اور کچھ دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ انور کے دروازے پر تھا۔ گھنٹی نے پر ایک سرخ آنکھوں اور موٹی مونچھوں والا شخص نمودار ہوا۔

"ہاں جی کس سے ملنا ہے؟" بڑے اکڑ کر پوچھا گیا۔

"اگر آپ ہی انور ملک ہیں تو آپ ہی سے ملنا ہے ملک صاحب۔" جعفر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیوں بھئی کیا کام ہے؟"

"آپ کی سابقہ بیوی، بچے کی گمشدگی کی رپورٹ کروائی ہے کسی نے۔" جعفر گھاگ آدمی تھا بات اگلوانے کا ہنر جانتا تھا، انور کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو تبدیل ہوا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"پر اس کو غائب ہوئے تو دو سال ہو گئے اور یہ رپورٹ کس نے کرائی چاچا نورالٰہی نے؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو بعد میں بتائیں گے ہمیں آپ کے گھر کی تلاشی لینی ہے۔" جعفر نے بڑے دبنگ انداز میں کہا لیکن اس کے سامنے بھی ایک شاطر آدمی تھا۔

"وارنٹ ہے آپ کے پاس۔" وہ اب بھی دروازے کو گھیرے کھڑا تھا۔

"ہاں جی ہے۔" ایک بار پھر اس نے جھوٹ کا سہارا لیا انور کی ہوا نکل چکی تھی۔ اس کی غلیت بس یہیں تک تھی اس نے وارنٹ دیکھنے پر اصرار تک نہ کیا اور اندر اطلاع کروا کے گھر میں رسائی دی۔ تلاشی کا مقصد صرف اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا تھا ورنہ دو سال بعد شواہد کہاں باقی رہتے ہیں۔

"آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" وہ قریبی تھانے کے ایس ایچ او سے پہلے ہی بات کر چکا تھا۔

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟" اس کی ہٹ دھرمی اب بھی برقرار تھی۔

جعفر کے تیور دیکھ کر وہ چلنے کو تیار ہو گیا۔

والدین کی مدعیت میں مقدمہ درج ہوا تفتیش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی پر تشدد کرتا تھا جس سے گھبرا کر وہ کہیں چلی گئی۔ اس کے شوہر نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی اور اس کی گمشدگی کے چھ ماہ بعد ہی دوسری شادی بھی کر لی اسی تفتیش میں اس کی سابقہ بیوی یاسمین کی جائیداد کا بھی ذکر ہوا جو بیوی کی گمشدگی کے فوراً بعد بیچ دی گئی تھی۔ اب پولیس دوسرے رخ سے تفتیش کر رہی تھی۔ جعفر اپنا کام کر کے کراچی آ چکا تھا جب کہ کاشان بھی دبئی سے آ چکا تھا۔ چھ ماہ گزر چکے تھے اس دوران کاشان کئی دفعہ کسی نہ کسی کام سے فلیٹ جاتا آتا رہا۔ صورتِ حال پرسکون رہی کہ اچانک جعفر کی کال آئی کہ لاہور جانا ہے کیس کے سلسلے میں۔ دونوں دوست دوسرے دن کی فلائٹ سے ہی لاہور پہنچ گئے جہاں کیس اپنے منطقی انجام تک پہنچ چکا تھا۔ جائیداد کی لالچ میں یاسمین سے شادی اور زبردستی فلیٹ اپنے نام کروا کے یاسمین اور اس کے بچے کا قتل یہ سب انور اگل چکا تھا۔ اس کی نشاندہی پر گھر کے پیچھے صحن کے نیچے سے مقتولین کی ہڈیاں بھی دریافت کر لی گئی تھیں باعزت ان کی تدفین کے بعد جیسے اس کے والدین کو قرار آ گیا تھا۔ رات دن انتظار کی سولی پر لٹکنے کے بجائے اب وہ اپنی بیٹی کے لیے دعائے مغفرت کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کھوئے ہوئے انسان کے ساتھ آدمی جیتا مرتا رہتا ہے لیکن مرے ہوئے پیاروں پر صبر آ جاتا ہے۔ ظالم کو انجام تک پہنچتا دیکھ کر انہیں بھی صبر آ گیا تھا لیکن یہ ایک راز ہی رہ گیا کہ ایک آدمی کراچی سے ان کی مظلوم بیٹی کو انصاف دلانے کیسے پہنچ گیا۔

☆☆☆

آج سامعہ پھر سے اپنی جنت میں تھی۔ دن بھر صفائی ستھرائی کے بعد وہ خود بھی فریش ہو کر اپنے بال سنوار رہی تھی۔ بچے اپنے کمرے میں اپنے حساب سے چیزیں سیٹ کر رہے تھے، کاشان بستر پر دراز ہو چکا تھا کہ اچانک اسے ایک بہت پُرسکون سی خوشبو محسوس ہوئی اس نے آئینے میں نئی پردے کو سرکتے دیکھا شیشے پر نمایاں طور پر "HAPPY" اور "GOOD BYE" لکھا ہوا تھا۔ جتنی دیر میں اس نے پلٹ کر دیکھا وہ تحریر غائب ہو چکی تھی کاشان کو غالباً اونگھ آ گئی تھی پردہ برابر ہو چکا تھا۔ ایک سکون کا احساس اس کے رگ و پے میں پھیل گیا ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی لیکن اس سارے دورانیے میں وہ اپنے رب سے بہت قریب ہو گئی تھی ابھی اسے سجدۂ شکر بھی ادا کرنا تھا۔

++

یہ سرگزشت کسی اور کی نہیں میری سرگزشت ہے۔ اور جب آپ سرگزشت پڑھیں گے تو مجھے بہت ہی برا سمجھیں گے اس لیے التماس ہے دل میں عہد کیجیے کہ نہ تو آپ کسی سے حسد کریں گے اور نہ ہی کسی کو نیچے گرانے کی کوشش کریں گے۔

جو دوسروں کو نیچے گرانے کی کوشش کرتا ہے وہ خود منہ کے بل گرتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ اگر کوئی اٹھانا بھی چاہے تو بوجھ ثابت ہوتا ہے کیونکہ گرے ہوئے لوگ دوسروں پر بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتے۔

میں بھی ایک ٹک ٹاک ایپ کی وجہ سے انسانیت کے درجے سے نیچے گرا ہوں۔ اس ایپ کے نشے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میرے اندر کے حسد نے میری زندگی برباد کر دی۔ اس ایپ کے نشے کی وجہ سے میں نے جو کچھ اپنے دوست کے ساتھ کیا۔ اسے بتاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے

مشہوری

قابلِ احترام عذرا رسول

سلام تہنیت!

زیرِ نظر سچ بیانی میں جن نکتوں پر توجہ دلائی ہے اس پر ضرور غور کریں۔ یہ سوشل میڈیا چھوٹے چھوٹے بچوں کو کس طرح جرائم کی جانب دھکیل رہا ہے۔

تسلیم شیخ

(ساہیوال)

لیکن میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں اس کے گھر والوں کے پاس جا کر معافی مانگ سکوں۔ میں دوستی کے نام پر دھبا ہوں۔ ایسا دھبا کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کا دوستی پر سے اعتبار اٹھ جائے۔ میں نے جس کے ساتھ بچپن گزارا، جس کے ساتھ جوانی گزاری اس کے ساتھ ایسا کیا؟ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا زیب ہی نہیں دیتا لیکن میں نے ایسا کیا ہے۔ میں آج جب یہ سب سوچتا ہوں۔ تو خود کو لعن طعن کرتا ہوں کہ میرے حسد نے مجھے کہاں پر لا کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

"چلو یار کدھر ہو؟ کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" تابش نے زور سے دروازہ بجایا۔ تابش وقت کا بے حد پابند تھا۔ اس لیے کالج جانے کے پندرہ منٹ پہلے ہی وہ اپنی بائیک پر مجھے لینے آ جاتا تھا۔

"آ رہا ہوں۔" میں نے گھر کے اندر سے ہانک لگائی۔ اور بیگ پکڑے تیزی سے باہر آیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ میں دھپ سے بائیک کے پیچھے بیٹھ گیا۔ تابش نے بائیک اسٹارٹ کی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آج ہم نے کالج واپسی پر لائبریری جانا ہے اس لیے اِدھر اُدھر فضول نہ گھومنے لگ جانا۔" اس نے مجھے وارن کیا۔ وہ جانتا تھا۔ میں کلاسز سے فارغ ہو کر لڑکیوں کے ساتھ گپیں لڑانے بیٹھ جاتا ہوں، مگر وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔

وہ کہتے ہیں ناں میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں اور گاڑی کو چل کر چلاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی ہم دونوں دوست تھے۔ ایک دوسرے سے مختلف مزاج ہو کر بھی ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہماری دوستی اب تک چل رہی تھی اور کافی گہری بھی تھی۔

مجھے تابش نے لائبریری جانے کا کہا تھا اس لیے میں کلاس سے نکل کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کسی کام سے پرنسپل کے کمرے میں گیا تھا۔ اس نے مجھے موبائل پر بتایا کہ بس پانچ منٹ رکو، میں آتا ہوں۔ اور پانچ منٹ کی بجائے تیس منٹ ہو گئے تھے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وقت کی پابندی کرنے والا انسان کدھر کھو گیا ہے۔ خیر اتنا پتا تھا کہ وہ جدھر بھی بیٹھا ہوگا۔ فضول نہیں بیٹھا ہوگا۔ کوئی ضروری کام میں مصروف ہوگا۔ میں نے سوچا چلو کچھ کھا لیتا ہوں۔ کینٹین کی طرف گیا۔ سموسہ اور بوتل لی اور کھانے کے لیے وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں کھا رہا تو اچانک میرے کانوں میں تابش کی آواز آئی۔ وہ کسی اور سے مخاطب تھا۔

اس کی آواز سن کر میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے پاس ایک لڑکی جو ہم دونوں کی کلاس فیلو تھی سر پر ہاتھ رکھے جوس پی رہی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔ میرا [illegible] دوست اس حسینہ کے ساتھ۔ میں نے زور سے اپنی مٹھی بھینچی تھی کیونکہ وہ لڑکی مجھے گھاس نہیں ڈالتی تھی جبکہ تابش کے ساتھ ہنس ہنس کر گپیں لڑا رہی تھی۔ میں اسے پسند کرتا تھا۔ بارہا کوشش کرتا رہا تھا کہ اسے پرپوز کر سکوں۔ ایک بار دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا مگر میرے ہاتھ کو جھٹک کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جا کر اس لڑکی کی بے عزتی کر دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تابش کے ناراض ہونے کا ڈر تھا۔ میں نے تابش کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت ہی دلفریفتہ انداز لیے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ تابش ہینڈسم تھا اور وہ لڑکی خوبصورت، دونوں کی جوڑی چاند اور سورج کی جوڑی لگ رہی تھی مگر میں دونوں کی طرف کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اٹھے اور کینٹین سے باہر نکل گئے۔ اردگرد سے بیگانہ وہ دونوں اپنے ہی دھیان میں تھے۔ یعنی مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میرا پارا ہائی لیول پر چلا گیا تھا۔

"یار حمزہ، میں گھر جا رہا ہوں۔ تم بس لے کر چلے جانا۔ آج لائبریری جانے کا ارادہ کینسل کر دیتے ہیں۔" میں غصے میں بھرا ہوا تھا کہ تابش کا میسج آ گیا۔ ہمارے شہر کی وہ بڑی لائبریری تھی جہاں ہم دونوں اکثر جاتے تھے اور اپنی من پسند کتابیں لاتے تھے۔ کالج کی لائبریری میں وہ کتابیں میسر نہیں تھیں اسی لیے ہم وہاں جاتے تھے۔ تابش کو تو وہاں جانا بے حد پسند تھا۔ میں کم ہی جاتا تھا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور کینٹین سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی کالج کا گیٹ تھا۔ میں نے دیکھا کہ صدف اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ رہی ہے۔ وہ بائیک پر بیٹھی ہی تھی کہ تابش نے بائیک اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

"اوہ تو اس لیے آج مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا۔" میں بڑبڑایا اور بسوں کے دھکے کھانے کے لیے خود کو تیار کرنے

لگا۔

میں ابھی اپنے محلے میں داخل ہوا تھا کہ سامنے سے تابش کی والدہ آتی دکھائی دیں، میں نے انہیں سلام کیا۔

"اکیلے ہو آج؟ تابش کدھر ہے؟" آنٹی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"میں نہیں جانتا آنٹی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں بس سے گھر چلا جاؤں۔" میں اپنا غصہ دباتے ہوئے بولا۔

"اچھا حیرت ہے۔" آنٹی نے تعجب سے کہا۔

"آپ کدھر جا رہی ہیں؟" آنٹی گھر سے باہر کم ہی نکلتی تھیں اس لیے میں نے پوچھا۔

"بس بازار جا رہی تھی۔ کچھ کام تھا۔ تابش کا انتظار کرتی رہی۔ وہ آیا نہیں تو میں نے سوچا تم لوگ لائبریری نہ چلے گئے ہو اس لیے خود ہی بازار کے لیے نکل پڑی۔" آنٹی نے وجہ بتائی اور آگے بڑھ گئیں۔

میرے پاس کون سی کوئی سواری تھی۔ جو میں انہیں کہتا کہ چلیں آئیں۔ آپ کو لے جاتا ہوں۔

☆☆☆

میں اور تابش ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ میرا گھر گلی کے اندر تھا اور اس کا گلی کی نکڑ پر۔ اس کے گھر کے نیچے دکانیں بھی تھیں جو انہوں نے کرائے پر دی ہوئی تھیں۔ میں ان کے گھر اکثر جاتا تھا۔ آنٹی میری بہت خاطر مدارات کرتی تھیں۔ بازار میں ان کی ایک پان شاپ بھی تھی جو بہت زیادہ چلتی تھی۔ ان کی کمائی بہت تھی۔۔ اور وہ صرف تین افراد تھے۔ انکل، آنٹی اور تابش۔ تابش ان کی اکلوتی اولاد تھی مگر بگڑی ہوئی بالکل نہیں تھی۔ وہ بہت ہی سلجھا ہوا انسان تھا۔ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا تھا۔ اس کے برعکس میں اتنا امیر نہ تھا مگر پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میرے گھر میں ماں باپ اور دو بہنیں، دو بھائی تھے۔ ہم سب بھائی بہن ابھی پڑھ رہے تھے اور کمانے والا صرف ایک انسان اور وہ بھی میرا باپ۔ ہمارا گھر اچھا بنا ہوا تھا لیکن کوئی دکان نہیں تھی۔ بازار میں ایک تھوک ریٹ کی دکان تھی۔ جس سے ہمارا گزر بسر ہوتا تھا۔ سب اچھا چل رہا تھا۔ میں جب تابش کے ساتھ خود کو ملاتا تو مجھے اس سے حسد محسوس ہوتی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ ہر چیز اس کے پاس ایکسٹرا تھی۔ ہمارے گھر اگر کچھ پیسے ایکسٹرا آتے تو امی بہنوں کا جہیز بنانے لگ جاتیں کہ انہیں بیاہنا بھی تو ہے۔ امی کی خواہش تھی کہ تابش کے ساتھ میری ایک بہن کی شادی ہو جائے۔ میری بھی خواہش تھی کہ بہن سکھی رہے گی لیکن تابش نے تو میری ہی پسند پر اپنی پسند بنا لی تھی اور اب نہ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ میں جلتا کڑھتا کالج سے آ کر سو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن موسم اچھا تھا۔ یعنی گرمیوں کی پہلی بارش کے آثار نمایاں تھے۔ سرمئی بادلوں کا گھیرا آسمان پر پھیلا ہوا تھا۔ خوشگوار موسم دیکھ کر میرا موڈ اچھا ہو جاتا تھا۔ میں نے بہن سے کہا۔ "جب کالج سے آؤں تو سموسے بنا کر رکھنا۔"

میں اسے کہہ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ تبھی دیکھا کہ تابش گھر سے نکل رہا ہے اور میری ہی طرف آنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی بدلے میں ہوا میں اپنا ہاتھ لہرایا تو وہ مسکرانے لگا لیکن مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔ دل کیا کہ اس کی مسکراہٹ کو چہرے پر سے نوچ لوں۔ میں ایسا صرف سوچ سکتا تھا۔ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ خیر میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔

"یار میں سوچ رہا ہوں۔ ہم بھی ٹک ٹاک بنائیں۔" میں اس کے پاس کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس نے کہا۔

"میں پہلے سے ہی ٹک ٹاک پر ویڈیوز بناتا ہوں۔ تمہیں پتا تو ہے۔" میں نے اسے سرد مہری سے جواب دیا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم مل کر بنائیں گے۔ جیسے دوست گروپ کی صورت مل کر بناتے ہیں۔"

"تمہیں تو یہ ناپسند تھا۔ اب کیسے پسند آ گیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"بس کسی نے کہا ہے کہ میں ٹک ٹاک بناؤں۔ میں کیونکہ ہینڈسم ہوں۔" اس نے لڑکیوں کی ادا سے کہا اور میں سمجھ گیا کہ کس نے کہا ہوگا۔ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں صدف کے معاملے میں سنجیدہ ہوں۔

اس دن ہم کالج پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے صدف آتی ہوئی دکھائی دی۔ تابش اور صدف نے جب ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو دونوں کے چہروں پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر پایا۔ بہت کوشش کی کہ دونوں کو نہ دیکھوں۔ مگر میں خود کو انگارے پر دہکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

ان دونوں کی محبت میرے سامنے پروان چڑھ رہی تھی۔

جس دن دونوں باہر کہیں ملنے کا پروگرام بناتے اس دن وہ مجھے بس سے چلے جانے کا کہہ دیتا۔

میں نے بہت کوشش کی ان دونوں کو دور کردوں لیکن میں جتنا ان میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا وہ لوگ اتنے ہی ایک دوسرے کے قریب ہوجاتے۔

کالج سے چھٹیاں ہوئیں تو میں اور تابش نے ٹک ٹاک ساتھ میں بنانا شروع کردیا۔ تابش کے ٹک ٹاک فولورز دن بدن بڑھتے جارہے تھے مگر میرے رکے ہوئے تھے۔ دن تیزی سے آگے سرکتے گئے۔ ہماری تعلیم مکمل ہوئی تو تابش اور صدف کی شادی ہوگئی۔

صدف اس کے ساتھ بے حد خوش تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتا، میری رگ رگ میں غصے کی لہر دوڑ جاتی۔

ہم پھر بھی ساتھ ٹک ٹاک بناتے تھے، صدف کو بھول جانے کے لیے میں روز ہی ٹک ٹاک بناتا اور اپنی زندگی کو مصروف کر لینے کی کوشش کرتا مگر افسوس یہاں بھی بازی تابش لے گیا۔

میرے فالورز اس کے فالورز سے کافی کم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں جو حسد کی آگ کو اپنے اندر دبا کر بیٹھا تھا وہ ایک بار پھر انگڑائی لے کر باہر کو آگئی۔

☆☆☆

''کدھر ہو؟'' میں ناشتا کر رہا تھا، جب مجھے تابش کی کال آئی۔

''گھر پر ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور خاموش ہوگیا۔

''میں اور صدف شو میں جارہے ہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں بھی انوائٹ کیا ہے۔ شام کو تیار رہنا۔'' اس نے مجھے شو پر چلنے کا کہا۔

''ان لوگوں نے مجھے کارڈ کیوں نہیں بھیجا؟'' مجھے برا لگا کہ اگر مجھے بلایا ہے تو ڈائریکٹ وہ لوگ مجھ سے کہتے، میرے دوست کو کہہ دیا بس۔ مجھے کہنا بھی تو فرض تھا۔

''تمہارا کارڈ انہوں نے مجھے دیا ہے۔ میں تمہیں دینا بھول گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔'' تابش نے شرمندہ لہجے میں جواب دیا۔ جس کا اثر مجھ پر بالکل بھی نہیں ہوا۔ مجھے تابش کی ہر بات خنجر کی طرح چبھتی تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے سب کی نظروں میں گرادوں۔

''میں نے نہیں جانا۔'' میں نے جواب دیا۔ میرا موڈ خراب ہوگیا تھا۔

''یار معافی مانگی تو ہے۔ اگر تم نہیں جاؤ گے تو عجیب لگے گا۔ ہم ہر شو میں ساتھ جاتے ہیں۔ ہر جگہ ساتھ ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے خاص کر تمہیں بلانے کو کہا ہے۔ میری غلطی، معاف کردو۔'' اس نے تھکے لہجے میں درخواست کی۔ میرا دل تھا کہ اسے کہوں کہ اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرتے تو کیا کرتے۔ کوئی تمہیں دوسرے نمبر پر رکھتا تو کیا کرتے۔

تابش نے معافی مانگی تو میں خاموش ہوگیا۔ اب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ تابش کے بعد فون پر صدف نے مجھ سے بات کی اور مجھے منایا کہ میں چلا جاؤں۔ صدف کی بات کو میں کیسے ٹال سکتا تھا۔ میرے دل میں صدف کے لیے ابھی بھی نرم گوشہ تھا۔

ہم لوگ شو میں گئے تو وہاں اور بھی ٹک ٹاکر آئے ہوئے تھے مگر ہم دونوں کو خاص پروٹوکول ملا۔ ہماری واہ واہ ہونے لگی۔ میرے اندر جو حسد کا لاوا دہک رہا تھا وہ کچھ پل کے لیے کم ہوگیا۔ ویسے تو لوگ اس کے ساتھ زیادہ تصاویر بنا رہے تھے۔ میرے ساتھ بھی کچھ لوگوں نے تصویریں بنائیں۔

ہم لوگ شو سے واپسی پر ایک رستوران میں کھانا کھانے گئے۔ صدف اور تابش دونوں بے حد خوش تھے۔

''خیر ہے آج آپ دونوں معمول سے ہٹ کر خوش ہو؟'' ان کا خوشی سے چہکنا مجھے چبھ رہا تھا۔

''تم چاچو بننے والے ہوناں، اس لیے۔'' تابش نے بتایا۔

میں نے صدف کے چہرے کی جانب دیکھا جو چقندر کی طرح لال ہوگیا تھا۔

میں کولڈ ڈرنک پی رہا تھا کہ مجھے اچھو لگ گیا اور میں زور زور سے کھانسنے لگا۔ تابش جلدی سے اٹھا اور میری کمر سہلانے لگا۔ اس کے کمر سہلانے سے مجھے کچھ سکون ہوا تو میں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''مبارک ہو آپ دونوں کو بہت بہت۔'' میں بہت ضبط سے مسکرا رہا تھا۔

میری آنکھیں ضبط کے مارے لال انگارا ہوگئی تھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو۔'' صدف نے پریشانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تابش کے ساتھ ریلیشن سے پہلے ہم دوست تھے لیکن اس نے مجھے دوستی سے کبھی آگے بڑھنے نہیں دیا اور تابش جس کے ساتھ اس کی دوستی ہی نہیں تھی بس سلام دعا تھی اس کے

ساتھ شادی کرلی۔ اور اب اس کے بچے کی ماں بھی بنے گی۔ میں نے نخوت سے سوچا۔

کیا ہوا بیٹا؟ ''کچھ نہیں۔ حلق کو لگ گیا تھا ناں اس لیے آنکھوں سے پانی بہنے لگ گیا ہے۔'' میں نے نارمل انداز اپناتے ہوئے جواب دیا۔

صدف نے میری طرف ٹشو بڑھایا۔

''شکریہ۔'' میں نے ٹشو کو تھامتے ہوئے جواب دیا اور اپنی آنکھوں کو ٹشو سے زور سے رگڑا۔

ہم تینوں نے کھانا کھایا اور وہاں سے نکل آئے۔

☆☆☆

تابش مجھے بتائے بتائے ملک سے باہر چلا گیا۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ مجھے بتائے بغیر، اور ملے بغیر چلا گیا۔

میں ان کے گھر گیا اور صدف سے دریافت کیا۔

''مجھے ملے بغیر چلا گیا۔'' میں نے پوچھا۔ جبکہ مجھے اس کے جانے پر خوشی ہوئی تھی۔ غم نہیں ہوا تھا۔

''اس کے ماموں کے بزنس میں کافی نقصان ہو رہا تھا اور ان کا کوئی بیٹا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تابش کو بھیج دیں تو میں انکار نہ کرسکی اور بھیج دیا۔'' تابش کی ماں نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

''اوہ، صدف کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا نامناسب نہیں؟'' میں نے دکھ کا اظہار کرکے صدف پر چوٹ کی۔

صدف کی آنکھیں رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''مجبوری تھی بیٹا، میرا کوئی اور بیٹا ہوتا تو میں اسے بھیج دیتی۔ اب کیا کرسکتی تھی چھ سات مہینوں کی ہی تو بات ہے۔'' آنٹی نے بہو سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''چلیں کوئی مسئلہ نہیں، میں بھی تو آپ کا بیٹا ہوں۔ جب بھی کوئی کام ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔'' میں نے آگے بڑھ کر آنٹی کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''جیتے رہو۔'' آنٹی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

میں آنٹی اور صدف سے ملنے روز ہی جاتا تھا اور کبھی کبھی تابش سے بھی فون پر بات ہوجاتی۔ وہ بے حد مصروف رہتا تھا اور ٹک ٹاک کا استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران میں کافی مقبول ہوگیا۔ لوگ تابش کے بارے میں مجھ سے کمنٹس اور انباکس میں پوچھتے کہ وہ آج کل کہاں غائب ہے۔

میں نے جواب میں ایک ویڈیو بنا کر اپلوڈ کی کہ وہ آج

غلطیاں جنگ کے میدان کی۔

ہٹلر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی تھا۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جو جتنا بڑا انسان ہوتا ہے اس کی حماقتیں بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔ ہٹلر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے روس کو فتح کرنے کی پلاننگ کی اور فوجوں کو روس کی طرف روانہ کردیا۔ بہت زبردست فوج تھی.. اور یہ جذبہ بھی تھا کہ ہر حال میں فتح حاصل کرنی ہے لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوچکی تھی۔ ایک تو سردی کا موسم اور وہ بھی روس کی سردی۔ ان بے چاروں کو موسم گرما کی وردیاں پہنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ پوری فوج سردی سے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہلاک ہوگئے۔ اور بچ جانے والوں کا دشمنوں نے صفایا کردیا کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: نیاز کھوسو، لسبیلہ

★★★★

یورپ میں ایک جنگ بہت مشہور ہوئی۔ یہ جنگ Agin court کی جنگ کہلاتی ہے۔ یہ جنگ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ فرانس والوں کو عددی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہار گئے۔ اس ہار کی وجہ بھی بہت دل چسپ تھی۔ فرانس کی فوجوں کے لیے اسلحہ ڈیزائن کرنے والا ایک شخص تھا۔ جس نے اس زمانے کے لیے (نئی) کمان اور تیر بنا کر دیے۔ ان کمانوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کمانیں انسانی قد سے بڑی تھیں۔ اس ماہر اسلحہ ساز کا کہنا تھا کہ ان کمانوں سے چلائے ہوئے تیروں میں بہت فورس ہوتا ہے لیکن ہوا یہ کہ عین جنگ کے وقت ان کمانوں کو کھینچنا ہی مشکل ہوگیا۔ بے چارے فرانسی فوجی کمانوں سے تیر چلانے کی کوشش ہی کرتے رہے اور برطانوی فوجوں نے انہیں تباہ کردیا۔

مرسلہ: واجد الحسن، کراچی

کل بھی کام کے لیے ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ جلد ہی لوٹ آئے گا۔

دن گزرتے گئے۔ میں آنٹی اور صدف سے کلوز ہوتا گیا۔ اسی دوران تابش واپس آ گیا۔ اس کے ماموں کا انتقال ہو گیا تھا اور تابش کی پہنچ مغربی منڈیوں تک نہ تھی اس لیے اس نے بزنس بند کیا۔ تمام رقم ممانی کو دے کر پاکستان گیا۔ میں جو صدف کو پانے کی جستجو کرنے لگا تھا، دوبارہ سے پیچھے ہو گیا۔

صدف نے ایک بچے کو جنم دیا۔ بیٹا بے حد خوبصورت تھا۔ بالکل اپنے ماں باپ کی کاپی۔ روشن آنکھیں اور خوبصورت نقوش کا حامل بچہ تھا۔

تابش کی مصروفیت بڑھ گئی۔ اس نے تجربے کی بنیاد پر یہاں بھی بزنس شروع کر دیا تھا اور گھر والوں کو وقت بھی دیتا ساتھ میں ٹک ٹاک پر ویڈیوز بھی بناتا۔

میں روز دیکھتا۔ اس کے فالورز پھر سے بڑھتے ہی جا رہے تھے اور میرے بس گزارے لائق تھے۔

مجھے ایک ترکیب سوجھی، ٹک ٹاک پر مشہور ہونے کی۔

اب مجھے اس پر عملی کام کرنا تھا۔ اس کے لیے مجھے تابش کے ساتھ ویڈیوز بنانا دوبارہ سے شروع کرنی تھی کیونکہ اب وہ صرف بیوی، ماں اور بیٹی کے ساتھ بناتا تھا۔

''تابش ہم ایک ساتھ ویڈیو بنائیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' میرا مشورہ اسے پسند آیا اور یوں ہم دونوں پھر سے ایک ساتھ ویڈیو بنانے لگے۔

تین ماہ یونہی گزر گئے تو ایک دن میں نے تابش سے کہا۔ ''چلو ایک ایڈونچر والی ویڈیو بناتے ہیں۔ لوگوں کو حیران کرنے والی۔ ایسے ہمارے فالورز بھی بڑھیں گے۔''

میں نے ایک منفرد ویڈیو بنانے کا آئیڈیا دیا۔

''نہیں یہ کام کافی خطرناک ہے اور لوگ کیا سوچیں گے کہ ہم اپنی موت کا مصنوعی ڈراما کریں۔ نہیں میں ایسا کام نہیں کروں گا۔'' تابش نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔

''ہم ایسی ویڈیو بنانے کے تین گھنٹے بعد ہی سب کو بتا دیں گے کہ یہ صرف ایک ویڈیو ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا اور منانے کی کوشش کی۔

''ہم لوگوں کے جذبات کے ساتھ نہیں کھیل سکتے اور لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کے بعد ناپسند کرنے لگ گئے تو بہت ہی برا ہوگا۔'' تابش کا جواب اب بھی نفی میں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ایسی بنا لیتا ہوں، تم نے نہیں بنانی تو۔'' میں نے غصے سے کہا اور روٹھ کر اس کے پاس سے آ گیا۔

میں یہ بات جانتا تھا، وہ مجھ سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکے گا۔ مجھے منانے ضرور آئے گا۔

اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد یہی ہوا... وہ مجھے منانے آ گیا۔

اور پھر ہم ایک ویران جگہ پر گئے جہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ صرف ہم دونوں ہی تھے۔

وجہ صرف یہ تھی کہ سردی بہت تھی اور سردی کی وجہ سے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

ایک پستول پکڑ کر پہلے میں نے ویڈیو بنائی اور پھر تابش نے بنائی۔

میں ویڈیو بنا رہا تھا جب تابش نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھی تو میرے ہونٹوں پر کمینی سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے میری طرف دیکھا پھر اپ لوڈ کا بٹن دبا کر کہا۔ ''ڈن؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں ڈن۔''

اور یوں ڈن کرتے ہی ایک گولی چلی اور تابش کی دائیں کنپٹی سے ہوتے ہوئے بائیں کنپٹی سے نکل گئی اور وہ نیچے زمین پر ڈھے گیا۔

''لو سفر تمام ہوا۔'' میں نے ویڈیو بند کی۔ خود سے ہمکلامی کرتے ہوئے شیطانی قہقہہ لگایا۔

تبھی میرے فون پر میری بہن کی کال آئی تو میں وہاں سے فوراً نکل آیا۔

میں اپنی بہن کو کہہ کر آیا تھا کہ مجھے اس وقت کال کر دینا۔

میں گھر آیا اور آتے ہی سو گیا۔

ابھی سوئے ہوئے تین گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ آنٹی آئیں کہ ان کا بیٹا نہیں آیا اور اس کے ٹک ٹاک پر خودکشی کی ویڈیو ہے۔

میں نے حیرت سے آنٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی ویڈیو بنائی تھی۔ مجھے گھر والوں نے ایمرجنسی گھر بلا لیا اس لیے میں گھر آ گیا۔ تابش نے ہی کہا تھا کہ تم جاؤ، میں آتا ہوں۔''

آنٹی نے کہا کہ نہیں دیکھو، خون کی پھوار اس کی کنپٹی سے نکلی ہے۔

''آنٹی ویسے ہی اس نے ایڈیٹ کی ہوگی یہ ویڈیو۔ آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں۔'' میں نے آنٹی کو تسلی دی۔

''میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے حمزہ اور تم کہہ رہے ہو میں یوں ہی پریشان ہوں۔'' آنٹی نے تاسف سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے لگا کہ میں زیادہ ہی سکون میں ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کیا۔

''چلیں وہیں چلتے ہیں جہاں تابش کو آخری وقت میں چھوڑ آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''آخری وقت۔'' آنٹی نے چونک کر پوچھا۔

''آخری وقت۔ یعنی لاسٹ ٹائم جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور جہاں کی یہ ویڈیو ہے۔'' میں نے حواس باختہ ہو کر کہا۔

آنٹی کا دیور پولیس میں تھا۔ انہوں نے اسے پہلے ہی فون کر کے بلا لیا تھا۔ مجھ سے تو مشورے کی زحمت ہی نہیں کی۔ میں آنٹی کو اپنے پیچھے بائیک پر بٹھا کر وہاں لے گیا۔ وہاں تابش کی کار کھڑی تھی۔

آنٹی دوڑ کر وہاں پہنچیں تو سامنے ہی تابش گرا پڑا تھا۔ آنٹی اس کی طرف دیکھ کر چیخنے لگیں۔ آنٹی کی چیخوں سے میرا دل بھی دہل گیا۔

پھر میں نے اپنے فالورز دیکھے تو وہ بڑھ رہے تھے۔

میں نے ویڈیو اپلوڈ کی اور کیپشن لکھا۔

''ہائے میرا جگری یار اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میں کیسے رہوں گا اس کے بنا؟ بچپن ساتھ گزارا، جوانی ساتھ گزاری اور اب بڑھاپا ساتھ گزارنا تھا۔ میں کیا کروں گا۔''

پولیس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں آنٹی کو تھامے وہاں سے نکل آیا۔ سب لوگ رو رہے تھے۔

پولیس نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میں معصوم بنا رہا۔ اپنے آپ کو معصوم ہی ثابت کرتا رہا تھا۔

پولیس نے مجھ سے کہا کہ گھر جاؤ۔ کچھ اور پوچھنا ہوا تو بلا لیں گے۔

میں خود اعتمادی سے گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے کمرے میں جا کر لمبے لمبے سانس لیے۔ میں نے ٹک ٹاک کے فالورز بڑھانے کے لیے موت کی جنگ تو لڑ لی لیکن اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟

ہر بات دماغ کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ سردی میں بھی گھٹن اور حبس محسوس ہو رہی تھی۔ تابش کو ہر جگہ اپنے سے آگے بڑھتا دیکھا تھا۔ اب مزید ہمت و حوصلہ نہیں تھا کہ اسے اپنے سے مزید آگے بڑھتا ہوا دیکھتا۔ نہ جانے اس میں ایسی کیا کشش تھی کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔

اور ایک میں تھا۔ محنت کرنے کے باوجود وہیں کا وہیں

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں... اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم مبتلا ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553 کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹن نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قید کی سزا ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چرا کر فرار ہو گیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آ لگا۔ فورٹن نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کر لیا ہے۔ اپنی اسی ''دریافت'' پر فورٹن کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کر لیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آ گیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی گئی... بلکہ اس کی نگرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشے بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دو سو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہرحال اس غلطی کی اصلاح 1776 میں اس وقت ہوئی جب جوان ڈی انزا نے جا کر اصل صورت حال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشے واپس لیے گئے جو دو سو برسوں تک رائج رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دو سو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار وسیم، کراچی

تھا۔

تابش کی موت کے بارے میں ویڈیو لگانے کے بعد میرے فالورز میں اضافہ ہونے لگا۔ ٹک ٹاک پر مشہور ہونے کا نشہ میرے سر پر چڑھ رہا تھا۔ مجھے مدہوش کررہا تھا۔ میں خود کو بادشاہ سمجھ رہا تھا۔

تابش کی تدفین کے بعد بھی میں آنٹی، انکل اور صدف سے ملنے جاتا رہتا تھا۔

پولیس کو مجھ پر شک تھا مگر میں ہر بات گھما دیتا تھا۔

تابش کی موت کو ایک ماہ ہوا تھا..... اور میرے فالورز اتنے ہوگئے کہ میری کمائی بڑھ گئی۔

مجھے شوز میں بلایا جانے لگا۔ لوگ تابش کی دوستی اور موت تک کے سفر کے بارے میں پوچھتے تو میں معصومیت کا اشتہار بن جاتا اور پھر بے بسی اور لاچاری ظاہر کرتا۔ خود کو کوستا کہ مجھے اسے وہاں تنہا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ لوگ مجھے حوصلہ دیتے اور میں مگرمچھ کے آنسو بہاتا۔

میں مشہور ہوتا جارہا تھا۔ شہرت کسے بری لگتی ہے؟ یقیناً سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ مجھے بھی اچھی لگ رہی تھی۔

پیسا آنے کے بعد میں نے گاڑی لینے کا سوچا اور پھر میں نے بنا دیر کیے مہران خریدی۔ جب گاڑی ڈرائیو کررہا تھا اور ساتھ میں ویڈیو بنا رہا تھا کہ دیکھیں دوستو میری نئی کار۔ دوست کے بنا کار خرید لی۔ آج وہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔

میں یہی باتیں کررہا تھا کہ سامنے سے ایک ٹرالہ میرے گاڑی سے ٹکرایا اور میری گاڑی مجھ سمیت اڑ کر دور جا گری۔

میں جب بے ہوش ہونے لگا تو میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آیا جس میں، میں نے تابش کی گولی لگنے کی ویڈیو بنائی تھی۔ اور آج میری موت کی ویڈیو لائیو بن گئی تھی۔

تین دن بعد مجھے ہوش آیا اور ڈاکٹرز نے مجھے جو نیوز دی وہ مجھے میری سزا لگی۔

”آپ اب کبھی چل نہیں سکتے۔ دونوں ٹانگوں سے محتاج ہوگئے ہیں۔ کمر کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ کبھی بیٹھ بھی نہیں سکیں گے۔“

زندگی نے مجھے ایسی سزا دی کہ میں نہ گھر کا رہا اور نہ گھاٹ کا۔ قانون مجھ تک پہنچ نہ سکا مگر قدرت کا انصاف پہنچ گیا۔

تابش کی ماں کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ میں جب تابش کی موت کے بعد ان کے گھر جاتا تھا تو وہ تب بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتیں۔ میں یہی سوچتا کہ بیٹے کی موت کا اثر دماغ پر ہوگیا ہے۔ اور کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔

خیر صدف کی عدت ختم ہوئی تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔

حال چال پوچھنے کے بعد وہ حقارت سے میرے وجود پر نظریں گاڑ کر بولی۔ ”میرے چھ ماہ کے بچے کو تم نے یتیم کردیا حمزہ۔“

میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ صدف کو کیسے پتا چلا جو اس نے یہ جملہ بولا۔

”حیرت ہورہی ہے ناں تمہیں کہ مجھے کیسے پتا چلا۔“ صدف نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر سر کو جنبش دی تو وہ ہنسی۔

”تابش جہاں بھی جاتا تھا ہمیں بتا کر جاتا تھا۔ اور اس نے یہ بتایا تھا کہ ایسی ویڈیو بنانے کا تمہارا پلان ہے۔ میں نے اسے منع کیا تھا کیونکہ مجھے تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے نفرت نظر آتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ تمہیں جب بھی موقع ملے گا تو تم اسے نقصان پہنچاؤ گے۔ میں نے اسے بہت منع کیا مگر اسے دوستی زیادہ عزیز تھی۔ وہ تم سے مخلص تھا مگر تم حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔“

صدف نے میری طرف ایسے دیکھا۔ جیسے مجھے ابھی قتل کردے گی۔ ”میں نے تمہاری بہن سے پوچھا تھا کہ تم نے اسے فون کیوں کیا۔ وہ ہر بار میری بات ٹال دیتی تھی پھر میں نے اسے تابش کی قسم دی۔ میں جانتی تھی۔ وہ تابش کو پسند کرتی تھی اور تابش کی قسم کے بعد اس نے سب اگل دیا کہ تم نے اسے فون کرنے کو کہا تھا۔ تم نے ہماری زندگیاں ویران کی ہیں۔“ صدف نے ہچکی لی۔

”میں شرمندہ ہوں۔“ میری حالت ایسی تھی کہ میں اب اگر اپنے گناہوں کی معافی نہ مانگتا تو ساری عمر بے چین رہتا تھا۔

”تمہاری شرمندگی تابش کو واپس نہیں لاسکتی۔ تمہارے حسد نے اسے ہم سے جدا کردیا۔ اور ہاں تم کیا سمجھتے تھے۔ تم نے پولیس کو بے وقوف بنایا۔ نہیں ایسا نہیں۔ انکل تمہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے اور آنٹی نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنا فیصلہ اپنے اللہ پر چھوڑتے ہیں، دنیا والے انصاف نہیں کرتے لیکن میرا اللہ بہترین انصاف کرتا ہے اور اس کا انصاف تم دیکھ ہی رہے ہو۔“ اس نے نفرت سے میرے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

++

مفرور دکھی

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

ایک عجیب شخص کی عجیب سی سچ بیانی حاضر ہے۔ جو مجھے ایک سفر کے دوران ایک شخص نے سنائی تھی۔ بے حد عجیب کہانی ہے لیکن انسانی نفسیات کا پرتو بھی ہے۔ اسے دل سے پڑھیں گے تو وہ مجرم بہت معصوم نظر آئے گا مگر جرم معاف نہیں کیا جاسکتا۔

ایم الیاس
(کراچی)

میں اپنے ایک قریبی رشتے دار کی بیٹی کی شادی میں شرکت کی غرض سے تہران ہوائی جہاز سے جارہا تھا۔ میرا ہم سفر ایک ایرانی تھا۔ پرواز کرنے کے تھوڑی دیر بعد ائرہوسٹس نے روایتی طور پر ٹافیاں اور بسکٹ مسافروں کو پیش کیے۔ ٹرے میں نمکین پستہ، اخروٹ گری اور بادام کے علاوہ چلغوزے بھی تھے۔ میں نے ٹرے میں سے چلغوزے اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”اب تو چلغوزے خواب میں بھی نہیں ملتے ہیں۔ یہ کئی برس سے دسترس سے ایسے باہر ہیں جیسے نایاب موتی ہوں۔ پندرہ بیس برس پہلے یہ ٹھیلے پر پچاس کے پچاس گرام دستیاب ہوتے تھے اور اب......“

میں اک دم سے کہتے کہتے رک گیا کیوں کہ مجھے احساس ہوا کہ میرا ہم سفر پاکستانی نہیں بلکہ ایرانی ہے۔ میں اس سے اردو میں مخاطب ہوں تو میں نے انگریزی زبان میں اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ شاید اردو زبان سے واقف نہیں ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ انگریزی زبان میں ہم دونوں گفتگو کر سکتے ہیں؟''

''میں نہ صرف اردو روانی سے بول سکتا ہوں بلکہ لکھ پڑھ بھی سکتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔'' میں نے حیرت سے خوشی کا اظہار کیا۔ ''وہ کیسے؟ آپ چہرے مہرے، وضع قطع اور لہجے سے ایرانی لگتے ہیں۔ کیا آپ عرصہ دراز سے پاکستان میں مقیم ہیں؟''

''میں ایران کے شہر تہران میں ایک مالیاتی کمپنی میں ملازم ہوں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''میری فرم میں اقبال کاظمی جو پاکستانی ہیں وہ مالیاتی مشیر ہیں۔ میں نے ان کی صحبت میں اردو سیکھی ہے۔ اردو اور فارسی کا رشتہ صدیوں سے رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو جتنی پیاری ہے شاید ہی دنیا کی کوئی اور زبان ہوگی۔''

''اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دنیا کی سب سے بڑی تیسری زبان ہے۔''

''کیا آپ ایران ملازمت کے سلسلے میں یا کاروبار کے لیے تشریف لے جارہے ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''جی نہیں..... ان دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کوئی بائیس برس پہلے میرے ایک کزن ملازمت کے سلسلے میں تہران گئے تھے وہاں وہ ایک ایرانی لڑکی کے زلف کے اسیر بن گئے اور شادی کرلی۔ ان کی لڑکی کی شادی ہے۔ میں اس میں شرکت کی غرض سے جارہا ہوں۔ ایران میں بہت سارے پاکستانی برسوں سے آباد ہیں۔''

پھر ہم دونوں کے درمیان تعارفی رسم ادا ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا نام ایم الیاس ہے۔ میرا ذریعہ معاش کہانی نویسی ہے۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

''آپ کس سلسلے میں پاکستان آئے تھے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ایک سیاح کی حیثیت سے؟''

''میں آپ کو اپنی کہانی سناتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ نہ صرف دلچسپ، سنسنی خیز بلکہ تجربہ خیز کہانی ہے؟''

ہم نے ہوائی جہاز کی میزبان خاتون سے کافی منگوائی۔

''جو ہوائی جہاز کمپنی ہوتی ہے وہ مسافروں کی خدمت کے لیے حسین، طرح دار اور پُرکشش میزبان رکھتی ہے۔'' جب میزبان خاتون کافی دے کر چلی گئی تو اس نے کہا۔

میں نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''کیا آپ کو عورتوں کا کوئی تجربہ ہے؟ ایران کا حسن ساری دنیا میں مشہور ہے۔''

''میری یہ کہانی دکھ بھری ہے۔'' اس نے کافی ختم کرکے کہا۔ ''اب ہمہ تن گوش ہوجائیں۔ مرد لڑکیوں کے معاملے میں نرے احمق نہیں ہوتے ہیں ایم الیاس صاحب!'' وہ اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ ''وہ ایک نمبر کے کائیاں ہوتے ہیں۔ موقع پرست ہوتے ہیں۔ اس کی کسی بھی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے ہیں لیکن میں کبھی ناگ فطرت کا مرد نہیں بنا۔ میں اس کے برعکس ہوں۔ میں لڑکیوں کے معاملے میں ہمیشہ ہی سے چغد ثابت ہوا ہوں۔ چھتیس برس کا ہونے کے باوجود میں آج بھی عورت کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ وہ آج بھی میرے لیے ایک معما ہی ہے۔

آج دنیا بہت تیزی سے آگے جاچکی اور جابھی رہی ہے۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر کا لڑکا بھی لڑکی کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتا لیکن بہرحال اسے کیا کہا جائے کہ یہ میری بدقسمتی ہے۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر، اسمارٹ فون نے نئی نسل کی لڑکیوں اور لڑکوں کو گمراہ کیا اور کررہی ہے، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔''

''میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں۔ کسی لڑکی کو سمجھنا تو درکنار میں اس کی عمر کے بارے میں بھی کبھی درست اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آج تک کوئی ایسا اصول وضع نہیں ہوسکا کہ کسی عورت کی شکل صورت، جسم، تناسب، نشیب و فراز، چال ڈھال یا گفتگو سے اس کی اصل عمر معلوم کی جاسکے۔ ہر لڑکی اور عورت کی کوشش ہوتی ہے کہ مرد اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہ کرسکے۔''

اس نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔ ''جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری عمر چھتیس برس ہے لیکن اگر میں پری زاد خانم کے بارے میں یہ کہوں کہ اس کی اصل عمر تیس اور ساٹھ برس کے درمیان تھی تو میری طرح آپ کے لیے بہت سے سائل پیدا ہوجائیں گے۔ مثلاً یہ طے کرنا کہ وہ عمر میں آپ سے چھوٹی ہے یا بڑی ہے۔ تیس برس عمر تو وہ خود بتاتی تھی لیکن یہ جھوٹ تھا جو ہر عورت بولتی ہے اور جسے میری عمر کے لوگ بڑی فراغ دلی سے سچ سمجھ کر قبول کرلیتے ہیں پھر میرے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اس کے جھوٹ کا بھرم رکھوں لیکن عورت کے معاملے میں میری ناتجربہ کاری کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ میری زندگی میں جو پہلی لڑکی آئی میں نے اس سے فوراً شادی کرلی کہ شاید کوئی اور لڑکی مجھے پسند نہ کرپائے۔ اس لڑکی نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ آج کل کی لڑکیاں تصوراتی مرد کے خواب دیکھتی ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اب جب کہ میں نے تمہیں دل و جان سے قبول کرکے اپنا تن من سپرد کردیا ہے تو شادی میں دیر کس بات کی۔ میں نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی طور پر تمہاری ہوچکی ہوں۔''

اس نے بات آگے بڑھائی۔ مشکل یہ تھی کہ پری زاد خانم واقعی تیس برس کی بھرپور عورت کی طرح نظر آتی تھی۔ وہ بلاشبہ جتنی ذہین تھی اتنی ہی پُرکشش بھی تھی۔ ایسی جاذبیت اور دل کشی بہت کم ایرانی عورتوں میں ہوتی ہے۔ لباس اور بالوں کے انداز سے وہ میری ہم عمر لگتی تھی۔ گفتگو سے چالیس برس کی اور ہوٹل کے منیجر کے بیان کے مطابق پچاس برس کی کیونکہ ایک اور خمیدہ کمر اور رعشہ براندام خاتون اس کی ہم عمر یعنی ساٹھ برس کی تھی۔ اتنی ہی عمر میری ماں کی تھی۔ اب خود سمجھ لیں کہ ایسی عورت کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

پری زاد خانم کا تعلق میری ہی طرح تہران سے تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات کچھ دن پہلے کراچی میں ہوئی تھی۔ میں تہران سے ایک شخص کی تلاش میں کراچی آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شخص کراچی میں کسی جگہ موجود ہے لیکن مجھ جیسے شخص کے لیے جو پہلی بار کراچی آیا ہوا سے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا اور پھر میری یہ خوش قسمتی تھی کہ پری زاد خانم سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس شہر میں کثیر تعداد میں ایرانی باشندے برسوں سے مقیم ہیں۔

میں نے پری زاد خانم کو ایک پیشکش کی جسے اس نے بلاتامل قبول کرلیا۔

پری زاد خانم سے میری ملاقات سو فیصد کاروباری نوعیت کی تھی اس لیے گفتگو کرتے ہوئے عشقیہ مکالمے بولنا اور اس کے حسن کی مدح سرائی کرنا معاہدے میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی میری کوئی ایسی خواہش تھی کہ وہ مجھ پر مہربان ہوجائے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ناگ بن جاتا۔

میرے خشک رویے سے اس کی دل شکنی ہوئی تھی۔ شاید اسے اس بات پر حیرت ہورہی تھی کہ اس تنہائی میں، میں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ وہ جس لباس اور حالت میں تھی اور اس کا خیال تھا کہ میں ایک مرد ہونے کے ناتے اسے دبوچ لوں گا۔ وہ مشروط طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کردے گی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں میں کوئی میل اور نیت میں فتور نہیں ہے تو اس نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا تو مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ اس میں جو جذبہ اور خواہش کارفرما تھا میں اس کی تہ میں پہنچ گیا تھا۔

''پری زاد خانم!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سراسر زیادتی ہے اور معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمہیں آٹھ سو ڈالر فی ہفتہ پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ کیا تم بھول رہی ہو؟''

''تم نے مجھے صرف آٹھ سو ڈالر ایک ہفتے کے دیے ہیں۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''اگلے ہفتے بھی دوں گا اور اس کے بعد بھی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ''تم جب تک میرے لیے کام کرتی رہو گی تمہیں ہر ہفتہ آٹھ سو ڈالر ملتے رہیں گے۔''

''ایک بات کی وضاحت کردوں کہ تم نے مجھے ملازم نہیں رکھا ہے۔ بس ایک کام کے لیے تمہارے اور میرے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ کمر کے خم پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ معاہدہ ختم ہوچکا ہے۔''

''لیکن..... معاہدہ!''

''دیکھو مسٹر باسط اصفہانی! تم نے میرے سپرد جو کام کیا تھا وہ انجام پاگیا ہے۔ اگر یہ کام خود کرتے تو کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتے؟'' اس نے سوٹ کیس بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ساری عمر کراچی کی سڑکوں پر خاک چھانتے ہوئے گزر جاتی۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کیا میں نے آٹھ سو ڈالر نہیں دیے؟ کیا یہ کم ہیں؟''

''آٹھ سو ڈالر..... آٹھ سو ڈالر۔'' اس نے بری طرح بھنا کر تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم بار، بار آٹھ سو ڈالر کا رونا اس طرح سے رو رہے ہو جیسے

آٹھ ہزار ڈالر تھے۔ تم پانچ ہزار ڈالر کی بات کیوں نہیں کرتے ہو؟ کیا ندامت نے تمہاری زبان بند کردی؟"

میں نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ غلطی واقعی میری ہی تھی۔ ایک خوبصورت، جوان اور پُرکشش عورت آٹھ سو ڈالر کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے۔ محبت بھری نظر، اپنے حسن کی تعریف جو اس کی فطری کمزوری اور خواہش ہوتی ہے۔ اگر اسے ایسا ہوتا نظر آئے تو وہ پانچ ہزار ڈالر بھی ٹھکرا سکتی ہے اور شاید کسی بات سے انکار بھی نہیں کرسکتی بغیر کسی تذبذب اور تامل کے خود کو حوالے بھی کردیتی ہے۔

میں نے اس کی طرف بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اگر اس کی کمر کو بازو کے حلقے میں لیتا تو شاید وہ تعرض نہ کرتی پھر میں نے پری زاد خانم کو بیڈ پر بٹھا دیا۔ اس کے قریب سے ایک عجیب سی سوندھی، سوندھی خوشبو جیسی مہک کا احساس ہوتا تھا۔ یہ مسحور کردینے والی ایسی مہک تھی جو دنیا کے کسی عطر یا پرفیوم میں نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی بنائی جاسکتی ہے۔ یہ صرف اور صرف عورت کے بدن اور بالوں میں بسی ہوتی اور کسی چشمے کی طرح پھوٹتی ہے۔

"دیکھو پری زاد خانم!" میں نے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں لاتے ہوئے کہا۔ "تم یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی ہو کہ تمہیں پانچ ہزار ڈالر تو کیا پانچ سو بلکہ پندرہ ڈالر بھی نہیں دے سکتا۔ اگر میں اتنا دولت مند ہوتا تو اس گھٹیا قسم کے ہوٹل میں ہرگز قیام نہیں کرتا۔"

"تم بھی ذرا انصاف کی بات کرو...... آخر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں ایک غریب عورت ہوں۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ کیا پانچ ہزار ڈالر چھوڑ دیتے؟ تمہیں ایک مفرور آدمی کی تلاش تھی۔ میں نے اس میں تمہاری ہر ممکن مدد کی۔ تمہیں اس آدمی کا پتا مل گیا۔ لہٰذا اب میری کوئی کام باقی نہیں رہا۔"

"لیکن پری زاد خانم......! یہ بھی سوچو کہ تمہارے اس طرح جانے سے میرا کتنا نقصان ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اپنے نفع نقصان کے تم خود ذمے دار ہو۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "میں اس کے ساتھ استنبول اس لیے جارہی ہوں کہ وہ مجھے یک مشت پانچ ہزار ڈالر دے رہا ہے۔ اتنی بڑی رقم تو میں نے خواب میں نہیں دیکھی۔ اگر کوئی اس کی جگہ لے جانا چاہے تو اس سے ایک کم ڈالر بھی نہیں لوں اور نہ ہی سودا ہوسکتا ہے۔"

میں نے لمحے بھر توقف کرکے اس کے چہرے اور سراپا پر تنقیدی نظر ڈالی۔ کراچی شہر کے بارے میں سنا تھا کہ یہاں ایسی عورت کے بہت سارے رسیا ہیں جو اسے وقت گزاری کے لیے پانچ ہزار دے سکتے ہیں مگر وہ پانچ ہزار ڈالر دے رہا تھا تو یہ غلط نہ تھا۔ وہ ایسی ہوش ربا اور توبہ شکن تھی کہ پانچ ہزار کا سودا اس شخص کے لیے مہنگا نہیں تھا۔ وہ بستر کی بہترین رفیق ثابت ہوسکتی تھی۔

"ڈالر...... ڈالر...... ڈالر......" میں نے بری طرح جھنجلا کر کہا۔ "کیا اخلاق، اصول اور شرافت کوئی معنی نہیں رکھتی؟"

"مسٹر باسط اصفہانی!" وہ طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں تمہاری کوئی رشتے دار ہوں نہ بیوی اور نہ ہی محبوبہ...... یہ میرا کاروبار ہے میرے لیے تم دونوں کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے بھی میں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اگر میں کوئی سوال کرتی تو تم مشکوک ہوجاتے اور یہ سمجھتے کہ میں تمہاری ہم بستر بننا چاہتی ہوں...... وہ تمہارا دوست ہے یا دشمن! اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تاہم مجھے جو کوئی کام سپرد کرتا ہے تو میں اسے بڑی ذمے داری، رازداری اور ایمان داری سے کرتی ہوں۔ مکمل رازداری یہ میرا اصول ہے۔"

میں مایوس ہوکر فرش پر بیٹھ گیا۔

اگر کمپنی نے مجھے اخراجات کے لیے رقم دیتے وقت کنجوسی سے کام نہ لیا ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ اچھی بھلی کامیابی خاک میں مل رہی تھی۔ میں کیا کرسکتا تھا۔ ایک گہری سرد سانس لے کر رہ گیا۔

"خیر......" میں نے ایک اور گہرا سانس لیا پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "اگر تم نے طے کرلیا ہے تو میں تمہیں روک نہیں سکتا اور نہ ہی جبر سے کام لوں گا۔ میں اس بات کا حق نہیں رکھتا لیکن شاید تمہیں نہیں معلوم کہ استنبول میں تمہیں ایک مجرم کے ساتھ رہنا پڑے گا اور وہاں تمہیں کھانے کے لیے الٹی سیدھی چیزیں ملیں گی جو شاید تم کھا نہ سکو...... وہاں کا موسم اور......"

"تم میری فکر میں ہلکان اور پریشان نہ ہو۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور توقف کرکے اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ "وہ ایک شریف آدمی ہے۔"

"کیا یہ اس کی پیشانی پر لکھا ہے؟" میں نے چوٹ کی۔ "وہ ایک ایک ڈالر وصول کرکے رہے گا۔"

"میں ایک عورت ہونے کے ناتے اس آدمی کو

پہچانتی ہوں۔" وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "اس کے علاوہ ہم ہلٹن ہوٹل میں قیام کریں گے۔ وہاں ساری دنیا کے مزیدار کھانے ملتے ہیں اور ہمارے کمرے بھی الگ الگ ہوں گے۔ اگر کسی وجہ سے ہلٹن میں جگہ نہ ملی تو کسی اور بڑے ہوٹل میں ٹھہریں گے۔" اس نے توقف کرکے اس چھوٹے اور گندے کمرے پر نظر ڈالی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی ترکی اور ایران کی آب وہوا میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ اسی طرح کھانوں میں بھی...... تم جانتے ہو میں ایران میں پلی بڑھی ہوں اس لیے مجھے استنبول میں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔"

میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ اس شخص نے تمہیں سبز باغ دکھایا ہے۔ فریب دے رہا ہے۔ پانچ ہزار ڈالر بہت بڑی رقم ہوتی ہے ایران کی کرنسی میں... اس میں شک نہیں کہ تم جتنی حسین ہو اس سے کہیں زیادہ پُرکشش ہو۔ تمہارے دودھ جیسا، پُرشباب گداز بدن میں بجلیاں بھری ہیں اور انگ انگ سے مستی ابل رہی ہے۔ یقین نہیں آیا کہ وہ پانچ ہزار ڈالر یک مشت دے رہا ہے۔ استنبول میں لبنان، یونان اور اسپین کی نوجوان اور حسین لڑکیوں اور عورتوں کی بہتات ہے۔ ان ہوٹلوں میں جسم فروشی ممنوع نہیں ہے۔ پچاس، پچاس ڈالر میں، دو دو، پانچ پانچ دن ہم بستر رہتی ہیں...... کون ایسا احمق ہوگا جو تمہیں پانچ ہزار ڈالر دے دے... ملکہ حسن تو ہو نہیں...... وہ کسی ہوٹل میں تم سے کھلونے کی طرح کھیلتا رہے گا۔ جی بھر جائے گا تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوجائے گا اور شاید پانچ ڈالر بھی نہیں چھوڑے گا۔ کمرے کا کرایہ بھی نہیں دے گا۔ اس ہوٹل کا منیجر کرایہ وصول کرنے کے لیے کسی قحبہ خانے میں بٹھا دے گا۔ میں نے یہ سب کچھ اس کے علم میں لانے کا جو سوچا تھا اس لیے یہ ارادہ ترک کردیا کہ وہ اسے دروغ سمجھے گی۔ اچھا ہے۔ اسے جانے دو تاکہ تلخ تجربہ ہوجائے۔

"تو پھر خدا حافظ......" میں نے فرش پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ "کب جارہی ہو تم؟"

"سوری......!" وہ معنی خیز انداز سے مسکرادی۔ "میں کسی کی راز کی بات دوسروں کو نہیں بتاتی۔ جیسے میں نے تمہارے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس ہفتے میں نے تمہارے لیے دو دن کام کیا ہے۔ ایک سو چھ روپے مجھے دے دو۔"

یہ بات میں بھول گیا تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے بعد میرے لیے مزید دو دن ٹھہر چکی ہے۔ مجھے ان دو دنوں کے معاوضے کی ادائیگی کرنی ہوگی لیکن اس عورت کا ذہن کسی یہودی جیسا تھا۔ اس نے پورا حساب لگا رکھا تھا۔ میں نے حساب کیا۔ میں نے جیب سے ایک سو دس روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"پسند تو میں تمہیں بھی کرتی ہوں لیکن کاش تمہارے پاس پانچ ہزار ڈالر ہوتے۔" اس نے سوٹ کیس اٹھایا۔ شکریہ ادا کیا اور میری طرف دیکھے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

میرے لیے اس وقت یہ ممکن تھا کہ میں پولیس سے رابطہ کرکے درخواست کرتا کہ اس آدمی کو گرفتار کرلیا جائے لیکن میرے محض کہنے سے وہ پولیس ہوٹل میں مقیم ایک ایرانی سیاح کو گرفتار نہیں کرسکتے تھے۔ اس ہوٹل کی انتظامیہ وارنٹ کے بغیر اندر قدم رکھنے بھی نہیں دیتی۔ وارنٹ کے احکامات صرف مجسٹریٹ سے ہی حاصل ہوسکتے تھے۔ اس کے لیے بھی مجھے اپنی شناخت کرانے کے لیے ٹیلی فون یا انٹرنیٹ اور کسی بھی ذریعے سے تہران سے تصدیق کرانی پڑتی یا پھر کراچی میں ایرانی قونصلیٹ سے مدد لینی پڑتی۔

اور آپ جانتے ہیں کہ سرکاری قانونی کاموں کی رفتار کس قدر سست رفتاری سے ہوتی ہے اور اگر چوبیس گھنٹے کے اندر کارروائی مکمل ہوجاتی ہے تو پھر معاملہ استنبول پولیس کے ہاتھ میں چلا جاتا کیونکہ میرا مطلوب آدمی اس وقت تک استنبول پہنچ چکا ہوتا۔

وقت کم تھا اور معاملہ اتنا اہم کہ اس پر میری نوکری کا دارومدار تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس شخص کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ مقامی پولیس اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔

☆☆☆

میرے اور پری زاد خانم کے درمیان سو گز کا فاصلہ تھا جسے میں نے قائم رکھا ہوا تھا۔

جانے کیوں مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ میں جانے کس جذبے کے تحت اسے باز رکھنا چاہتا اور یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ میرا مطلوب شخص ایک نمبر کا عیار اور دھوکے باز ہے۔ استنبول کے رسائل اور جرائد میں لبنانی، اسپینی اور یونانی کال گرلز کے اشتہارات چھپتے ہیں۔ ان اشتہارات میں نہ صرف ان کے فون نمبر بلکہ ان کی جسامت اور تناسب

کے بارے میں بڑی وضاحت اور تفصیل بھی دی جاتی تھی ان کی فیس بھی درج ہوتی تھی۔ جب کوئی ان سے رابطہ کرتا وہ اپنی سیلی جوتی انداز اور زاویے سے ہوتی تھیں ان کی نمائش کر دیتی تھیں چونکہ ان کے درمیان مقابلے کی فضا ہوتی تھی اس لیے اپنی فیس ظاہر کرتی تھیں۔ وہ پچاس ڈالر تک ہوتی تھی۔ وہ کوئی بوڑھی، بھدی اور بے کشش نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اٹھارہ برس سے تیس برس کے درمیان ہوتی تھیں پھر مجھے خیال آیا خلوص کا اظہار بے سود ہوگا۔ جو میں جانتا ہوں وہ اس کے متعلق مجھ سے زیادہ ہی جانتی ہوگی۔ وہ کوئی بچی نہیں تھی۔ وہ جتنا جانتی اور معلومات رکھتی ہوگی میں عشر عشیر بھی نہیں جانتا ہوں گا۔ اس کے بشرے اور باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوگا۔ میں اس کے سامنے طفلِ مکتب ہوں۔

وہ اپنا سوٹ کیس بڑی مضبوطی سے اس طرح تھامے ہوئے تھی جیسے اس میں ڈالر بھرے ہوئے ہیں اور کوئی رہزن اسلحہ کے زور پر چھین نہ لے۔ وہ نت پاتھ پر شاخ گل کی طرح چلتی، تھرکتی اور سبک خرامی سے خراماں خراماں چلی جا رہی تھی کہ کوئی بھی جرائم پیشہ اسے اغوا کر سکتا تھا۔ اسے ذرا بھی شبہ تک نہ ہو سکا کہ میں اس کے تعاقب میں غیر محسوس انداز سے آ رہا ہوں کیونکہ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی ان راہ گیروں کو جو اسے کسی بھیڑیے کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پرنس ہوٹل کا شمار شہر کے اچھے ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ ہوٹل کی شاندار عمارت کے صاف و شفاف شیشوں والے دروازے کے سامنے لمبی لمبی اور نئے ماڈل کی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ آنے جانے والوں کے لیے سنہری بٹنوں والی سرخ وردیوں میں ملبوس مؤدب دربان دروازہ کھولتے تھے۔ پھولوں کے تختوں اور سوئمنگ پول کے درمیان گھاس کے سرسبز لان پر رنگین چھتریاں لگی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے نائیلون کی سیٹوں والی کرسیوں پر نہ صرف سیاح مرد بلکہ عورتیں بھی بڑی بے فکری سے بیراکی کے لباس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ مرد اور عورتیں دھوپ سینک کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس ہوٹل میں پیدل چل کر جانا ٹیکسی میں جانے سے زیادہ مشکل تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ غیر ملکی سیاح لڑکیاں، عورتیں پاکستان، ہندوستان اور سری لنکا سیاحت کے لیے اس لیے آتی ہیں کہ ان کے ملک میں دھوپ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ان گرم ممالک میں آ کر ہوٹلوں اور ساحلوں پر جسم سینکتی تھیں کہ ان کی اجلی جلد سانولی ہو جائے۔ ان کے ہاں مردوں کو سفید جلد کی لڑکیاں عورتیں بے کشش لگتی تھیں لیکن پری زاد خانم مرعوب ہوئے بغیر بڑے اعتماد سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ مؤدب دربان نے جھک کر بڑے تفصیلی مؤدب انداز اور مستعدی سے دروازہ کھولا۔ ان کے طرز عمل میں بھاری ٹپ کا دخل معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ لوگ اسے جانتے بھی ہوں گے۔ دس منٹ کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اوپر جا چکی ہوگی تو میں بھی بڑی بے نیازی سے قدم اٹھاتا اندر داخل ہو گیا۔ دربان نے مجھے وہ تعظیم نہیں دی جو اس نے پری زاد خانم کو دی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں واضح تھیں۔

دائیں طرف ہوٹل کا جو ایک گوشہ تھا وہاں ایک چھوٹا سا ٹیلی فون ایکسچینج تھا۔ ہر قسم کے موبائل فون عام ہونے کے باوجود ٹیلی فون کی ضرورت اور اہمیت کم نہیں ہوئی تھی۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ بھی نظر آیا تھا۔ انٹرکام بھی تھا۔ بائیں طرف جہاں استقبالیہ لکھا ہوا تھا۔ ایک مستعد نوجوان موجود تھا۔ ایک وسیع و عریض لابی بھی تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور نرم و گداز چھوٹے بڑے صوفوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ فیشن ایبل قسم کی لڑکیاں، عورتیں میک اپ اور بھڑکیلے لباسوں میں تتلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جن سے ماحول رنگین ہو گیا تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر لکڑی کے ایک بورڈ پر نمبر لکھے ہوئے تھے اور ہر نمبر کے ساتھ کیل پر ایک چابی لٹکی ہوئی تھی۔ ان کے نیچے چھوٹے چھوٹے خانوں میں سفید کارڈ لگے ہوئے تھے۔ ان پر متعلقہ کمروں میں مقیم لوگوں کے نام درج تھے۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مسٹر سعد شیرازی کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" میں نے جھک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

مجھے پری زاد خانم نے یہی بتایا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں آئی۔ وہ جعلی پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا جو صرف ایک گھنٹے میں بن جاتے ہیں۔ اس کا اصل نام خوشیر واں تھا۔

"معاف کیجیے مسٹر سعد شیرازی اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہوں گے کیا؟" استقبالیہ کلرک نے روم نمبر بتایا تو میں نے سوال کیا۔

"جی...... وہ اس وقت موجود نہیں ہیں؟" کاؤنٹر

کلرک نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "کیا آپ انہیں کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟"

"نہیں......" میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ "میں پھر کسی اور وقت آ کر ان سے مل لوں گا۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سعد شیرازی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں نہ پری زاد خانم سے ملوں اور اس سے کہوں کہ مجھے اس کے کمرے میں کہیں چھپا دوں لیکن اس عورت کی فطرت سے واقف ہونے کے بعد میں نے یہ خیال ذہن سے نکال دینا مناسب سمجھا کہ اب وہ پانچ ہزار ڈالر کے عوض اس کی وفاداری اور الٹا مجھے آبرو ریزی کا الزام لگا کر گرفتار کرا سکتی تھی۔ کیا معلوم اس بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اپنا لباس بھی پھاڑ لے۔ اپنے چہرے کو نوچ نوچ کر اس پر ایسے سرخ نشانات ڈال دیتی کہ میں نے دست درازی اور من مانیاں کی تھیں۔ اس سے کوئی بات بعید نہیں تھی لیکن اب سعد شیرازی کے بارے میں معلوم کرنا میرے لیے اب زیادہ مشکل نہیں رہا تھا کہ وہ کب استنبول جا رہا تھا یا کہیں اور جانے کی تیاری کر رہا ہو اور منصوبہ بنا رہا ہو۔

اپنے ہوٹل کے کمرے سے میں نے فضائی کمپنیوں کو فون کر کے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ سعد شیرازی یا پری زاد خانم کے نام سے آئندہ چند روز میں کوئی ریزرویشن ہوئی ہے یا نہیں...... استنبول کے لیے اس نام سے کوئی ٹکٹ خریدا نہیں گیا تھا۔ پری زاد خانم کے بارے میں پختہ یقین تھا کہ اسے فرضی یا غلط نام استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ وہ اندرون ملک جانے کا پروگرام نہ بنا رہا ہو، ریلوے ریزرویشن سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے میں نے پرنس ہوٹل کا انتخاب کیا۔ اگرچہ مینو کارڈ پر درج شدہ قیمتیں دیکھ کر میری بھوک اڑ گئی تھی لیکن مجھے ہر قیمت پر سعید شیرازی کا پیچھا کرنا تھا کیونکہ میری ملازمت اور مستقبل کا انحصار اسی پر تھا۔

مجھے سے زیادہ صدمہ مجھے یہ جان کر ہوا تھا کہ سعد شیرازی ہوٹل چھوڑ چکا تھا۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کے جاتے ہی وہ چند منٹ کے بعد آ گئے تھے۔ انہیں بہت افسوس تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مسٹر سعد شیرازی بہت اچھے آدمی تھے۔"

میری کمپنی نے مجھے اس مہم پر اس لیے بھیجا تھا کہ میں اردو زبان سے خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ جاسوسی ادب پر سینکڑوں کہانیاں اور کتابیں پڑھ چکا تھا اور سعد شیرازی بھی کوئی پیشہ ور مجرم نہیں تھا کمپنی کا خیال تھا کہ اسے آسانی سے ٹریپ کر لوں گا لیکن اب یوں لگتا تھا کہ مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہے۔ میں نے یہ ذمے داری قبول کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔

"کیا انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں......" استقبالیہ کلرک نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ جلدی میں تھے۔ عموماً ایسے سوال سے ہم احتراز کرتے ہیں۔"

اس نے یہ بات غلط کہی تھی۔ جب مسافر اپنا حساب کتاب چکتا کرنے لگتے تو استقبالیہ کلرک رسمی اور غیر رسمی انداز سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اب آپ کہاں جائیں گے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ شاید سعد شیرازی نے اسے بھاری ٹپ دے کر کہا ہوگا کہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے یقیناً کلرک کو بتایا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

"کیا میں فون استعمال کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

کلرک نے میرے سامنے فون سرکا دیا۔ میں نے ایک بار پھر وہ سارے نمبر ملائے جو ڈائریکٹری میں موجود تھے لیکن اس مرتبہ بھی نتیجہ وہی نکلا کسی ہوائی جہاز یا ٹرین پر سعد شیرازی یا پری زاد خانم کے نام کی کسی خاتون نے کسی جگہ کا ٹکٹ نہیں لیا تھا۔ میں نے کرائے پر کاریں فراہم کرنے والی ایجنسیوں سے بھی معلوم کیا۔ ان ناموں سے کسی نے کہیں سے بھی کرائے کی کار نہیں لی تھی۔

ایک اور خیال آیا کہ ان دونوں نے فرضی میاں بیوی کے ناموں سے کسی ساحل پر ہٹ کرائے پر لیا ہوگا۔ سعد شیرازی نے سوچا ہوگا کہ غیر قانونی اور غیر شرعی ہنی مون منانے کے لیے پانچ ہزار ڈالر بھی دو اور استنبول بھی جاؤ۔ یہ بہت ہی مہنگا سودا ہے لیکن میں نے اس آوارہ خیال کو اس لیے مسترد کر دیا کہ ساحل سمندر پر مختصر سا ہنی مون منانے سے رہا۔

میں نے کرائے پر ایک کار حاصل کی اور چند ایسی جگہوں پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا جہاں سے کچھ امید کی جا سکتی تھی لیکن مایوسی نے میرا منہ چڑا دیا۔ ناکام واپس آتے ہوئے میری نگاہیں سڑک پر تھیں۔ ذہن کہیں اور تھا۔ مجھے اپنی ملازمت کے ضمن میں جو غلط فہمی تھی وہ اب دور

بیٹھی تھی۔
[illegible] نہیں لیکن سعد شیرازی [illegible] بھی کوئی پیشہ ور [illegible] نہیں تھا اس کے باوجود وہ بڑی مشکل [illegible] ہاتھ سے نکل گیا تو [illegible] کار کا رابطہ [illegible] ہوٹل میں [illegible] بڑی قیمت ادا کرنے کے بعد سوائے [illegible] کوئی راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔
[illegible] ایک [illegible] بجائے [illegible] میری نگاہوں [illegible] پری زاد [illegible] پانچ ہزار کے ڈالر [illegible] میں ہوں۔ [illegible] پچاس ہزار سے [illegible] ہو سکتی ہے اور پھر آج [illegible] سامنے [illegible] اس ڈالر کے [illegible] استنبول [illegible] دو ڈالر کے عوض [illegible] نہیں کرنی تھی۔
[illegible] میں امید [illegible] کرتا ہے [illegible] مجھے [illegible] پری زاد خانم نے کسی [illegible] خیال آتے ہی [illegible] کرائے پر کار فراہم کرنے والی ایجنسیوں [illegible] کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا کیونکہ اس کے سوا کوئی [illegible] تھا۔
پہلی ایجنسی کے ملازم کا رویہ خاصا دل شکن تھا۔ میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تب بھی [illegible] کسی ایرانی عورت اور مرد نے یہاں سے کار حاصل نہیں کی تھی۔ دوسری ایجنسی پر بھی میرے [illegible] ضائع ہوئے۔
مجھے [illegible] ایک فاصلے پر پیٹرول پمپ دیکھ کر ایک [illegible] خیال آیا۔ [illegible] کرائے کی کار میں پیٹرول بھروانے کے بعد میں نے پیٹرول پمپ کے ایک ملازم کو پری زاد خانم اور سعد شیرازی کا حلیہ بتا کر دریافت کیا تو جواب میں اس نے جس انداز میں سر ہلایا وہ میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے پچاس روپے کی قربانی دینا پڑی۔

"اس جیسے کی ایک ایرانی عورت آج تو یہاں کرائے کی گاڑی میں پیٹرول بھروانے آئی تھی۔ کار بالکل نئی تھی۔" ملازم نے بتایا۔
"کیا وہ ایرانی مرد؟"
"وہ اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ سڑک کے اس پار کھڑا تھا۔ جب میں کار میں پیٹرول ڈال چکا تو وہ بھی کار میں آکر بیٹھ گیا تھا۔" ملازم یہ کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔
"ایک آخری سوال؟" میں نے جیب سے پچاس کا ایک اور نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "اس آدمی نے عورت سے کہاں چلنے کے لیے کہا تھا اور اس کار کا نمبر کیا تھا؟"
"میرا خیال ہے کہ اس نے حیدرآباد جانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے کار کا نمبر نہیں دیکھا۔" ملازم بتا کر دوسری گاہک کی طرف بڑھ گیا۔
جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ حیدرآباد شہر، کراچی سے سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کراچی جب پہنچا تو میں نے احتیاطاً کراچی اور سندھ و پنجاب کے نقشہ جات بھی اس خیال سے حاصل کر لیے تھے کہ جانے کب اور کس وقت ضرورت پڑ جائے۔ میں نہایت تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا تقریباً سوا دو گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچ گیا پھر ایک جگہ رک کر گائیڈ بک سے وہاں کے بڑے بڑے ہوٹلوں کا پتا دیکھا۔
حیدرآباد میں چار پانچ ایسے بڑے ہوٹل تھے جن میں سے کسی بڑے ہوٹل میں سعد شیرازی ٹھہر سکتا تھا لیکن وہ ان میں سے کسی میں بھی نہیں ملے۔ دوسرے ہوٹلوں میں جانے سے پہلے میں نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کر دی۔ میں کچھ دیر تک اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا سوچوں میں الجھا رہا پھر کار سے اتر کے ایک کیفے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک میز خالی تھی۔ صرف دو کرسیاں اس کے گرد تھیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی ویٹر کو کافی کا آرڈر دے دیا۔ اس وقت بے حد تھکا ہوا تھا۔
کافی بہت اچھی اور مزے دار تھی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے گائیڈ بک دیکھ رہا تھا کہ ایک مانوس سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو کافی کا کپ میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ دو میز چھوڑ کر پری زاد خانم میری طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر سعد شیرازی موجود تھا۔ میں نے جلدی سے گائیڈ بک کھول کر اپنی نظروں کے سامنے پھیلائی تو میرا چہرہ اس کی اوٹ میں چھپ گیا۔
دونوں آپس میں کسی بات پر جھگڑنے لگے تھے۔ پہلے

تو ان کی آواز قدرے مدھم سرگوشیوں کی مانند تھی پھر تیزی آ گئی۔
"تم ہوس پرست ہو....." پری زاد خانم کی تیز آواز سے کیفے میں بیٹھے ہوئے تقریباً سبھی لوگ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے بھی اپنی گائیڈ بک کی آڑ سے دیکھا۔
"اس بکواس اور بہتان کا کیا مطلب ہے۔" سعد شیرازی نے تحمل سے کہا۔ "میں تمہیں ایک ہزار ڈالر پیشگی دے چکا ہوں۔"
پری زاد خانم ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سعد شیرازی کے ہاتھ سے تحمل کا دامن چھوٹ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں۔ وہ دونوں فارسی میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر تنہائی ہوتی تو شاید سعد شیرازی اسے دبوچ لیتا۔ خونخوار بن کر نہ صرف تہس نہس بلکہ تاخت و تاراج کر دیتا۔ اس نے کیفے میں لوگوں کی موجودگی کے باعث خود کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ کیفے میں موجود لوگ ان کی باتیں سمجھ نہ سکے لیکن انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔
"تم نہ صرف بازاری عورت بلکہ بدچلن بھی ہو۔ تم مجھ سے نہیں میری دولت سے محبت کرتی ہو۔" سعد شیرازی نے چیخ کر کہا۔
پری زاد خانم کا ہاتھ سعد شیرازی کے منہ پر شب برات کا پٹاخہ بن کر چھوٹا۔ تھپڑ کی آواز کی گونج خاصی اونچی تھی۔ سعد شیرازی خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پری زاد خانم کے چہرے کا جغرافیہ بگاڑ دیتا۔ چونکہ پری زاد خانم عورت تھی اس لیے اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اگر وہ ہاتھ اٹھاتا تو شاید بہت سارے لوگ پری زاد خانم کے حامی بن کر اسے زد و کوب کرتے۔ پری زاد خانم کڑی کمان سے نکلے تیر کی مانند باہر نکل گئی۔ میرے چہرے کے سامنے گائیڈ میپ پھیلا ہوا تھا۔ اگر میپ نہ ہوتا تب بھی وہ مجھے دیکھ نہ پاتی۔ کیونکہ وہ غصے میں پیر پٹختی ہوئی دیکھے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ اس کا چہرہ نفرت اور غصے سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ عورت کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی تھی اسے سرعام بدچلن اور بازاری عورت کا طعنہ دیا جائے۔ میں نے گائیڈ بک تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔
جب ان دونوں کو کیفے میں داخل ہوتے دیکھا تو میرا خیال تھا کہ وہ پری زاد خانم کو استنبول لے جانے کی بجائے حیدرآباد رنگ رلیاں منانے لے آیا ہے اس لیے کہ شاید پری زاد خانم نے اسے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا کہ میں اس کی تلاش میں تہران سے آیا ہوں اس لیے اسے ایک ہزار ڈالر بھی پیشگی دے دیے تھے لیکن میرا یہ خیال اور اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ جانے کیا بات تھی ان کے درمیان کسی بات پر تنازع کھڑا ہوا تھا اور تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی۔ سعد شیرازی نے شاید ایک ہزار ڈالر جو پیشگی دیے وہ چارہ بھی اس لیے تھے کہ اس شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں دو میاں بیوی بن کر قیام کریں۔
پری زاد خانم نے اسے ہوس پرست کا طعنہ دیا اور سعد شیرازی نے اسے بدچلن اور بازاری عورت کہہ کر سرعام ذلیل و رسوا کیا اور اس کی توہین کی تھی۔ ایک ہزار ڈالر یا ایک ہزار کی رقم میں بھی ایک حسین اور نوجوان لڑکی بہ آسانی رفیق بستر بن سکتی ہے۔ سعد شیرازی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ میرا یہ خیال تھا کہ وہ پری زاد خانم سے جی بھر کے کھیلنے کے بعد اسے ایک دن بے ہوشی کی نیند سلا کر ایک ہزار ڈالر سمیت چمپت ہو جاتا۔
سعد شیرازی جب تہران سے فرار ہوا تھا تو میں نے اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اس کی مونچھیں ذرا بڑی اور نوک دار ہو گئی تھیں۔ ان میں سفیدی نمایاں تبدیلی تھی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس وہ ریٹائر فوجی افسر لگتا تھا۔ اس کی عمر پینسٹھ برس تھی۔ وہ تقریباً چالیس برس تک تہران کے ایک مالیاتی ادارے میں کام کرتا رہا تھا۔ اس مالیاتی ادارے میں ان چالیس برسوں میں ایک پائی بھی چوری نہیں ہوئی تھی۔ جعل سازی اور دھوکا دہی کی کوئی واردات عمل میں نہیں آئی تھی۔ وہ سب لوگوں کو اور سب لوگ اسے پہچانتے تھے۔ چند روز پہلے وہ ریٹائر ہوا تو ادارے کی انتظامیہ نے اسے سونے کی ایک ایسی گھڑی انعام میں دی تھی جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس گھڑی کی پشت پر ایماندار اور فرض شناس دوست سعد شیرازی کے لیے خراج تحسین کندہ تھا۔ ایماندار اور فرض شناس سعد شیرازی اپنے دوستوں کے لیے اپنی یاد کے علاوہ تجوری میں لاکھ پچاس ہزار ڈالر کے ایسے بنڈل چھوڑ گیا تھا جن کے اوپر نیچے ایک، ایک اصل نوٹ تھا اور بیچ میں نوٹوں کے سائز کے کٹے ہوئے کاغذ! دفتر میں ایسے سینکڑوں بنڈل ہر روز آتے جاتے تھے۔ بنڈل خواہ ایک لاکھ کے ہوں یا ایک ہزار کے سعد شیرازی جیسے شخص کو سادہ کاغذ پر دستخط کر کے دینے کو تیار تھے۔ اس روز سعد شیرازی کے پُرزور

اصرار پر نئے منیجر نے بنڈل گنے اور اس رقم کی رسید لکھ دی۔
چالیس گھنٹے کے بعد جب اس رقم کی چوری کا پتا چلا تو سعد شیرازی طیارے سے کراچی اتر چکا تھا اور اس کے پاس وہ رسید محفوظ تھی جو چارج لیتے وقت اس کے جانشین نے اسے دی تھی اور جواب جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔

پری زاد خانم کے تعاقب میں جانے سے کچھ حاصل نہیں تھا وہ میرا شکار نہیں تھی۔ میرا شکار تو سعد شیرازی تھا۔ پری زاد خانم کے جانے کے بعد وہ میز پر انگلیاں بجانے لگا۔ وہ رنجیدہ اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے اس بات کا دکھ اور افسوس ہو رہا ہو کہ وہ ایک ہزار ڈالر دے کر بھی پری زاد خانم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ آدمی کے چکر میں پوری سے بھی گیا تھا۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کی میز پر چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ میں پری زاد خانم کے جانے کے بعد اس کی میز پر آیا تھا۔

''آپ یقیناً ایرانی ہیں؟'' میں نے بڑے رکھی انداز میں کہا۔

میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کسی اجنبی ملک میں کسی ہم وطن کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ لوگ جب پردیس میں کسی پریشانی اور تنہائی کا شکار ہوتے ہیں تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی محبت اور خلوص ... آتا ہے۔

''جی نہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''بیٹھو۔ کیا پینا پسند کرو گے؟'' اس نے گرم جوشی سے خوش ہونے کا مظاہرہ کیا۔

''کافی چلے گی..... موسم ایسا ہے کہ اس کی طلب ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کے اشارے پر ویٹر نے میرے سامنے کافی لا کر رکھ دی۔ وہ کسی اور کے لیے لے جا رہا تھا۔

''کچھ دیر پہلے ایک خاتون سے آپ کا کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ آپ کافی اداس اور پریشان دکھائی دیتے ہیں۔'' میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس حرافہ کو پانچ ہزار ڈالر میں اپنے ساتھ ترکی لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں جبر سے لے جانے کا قائل نہیں ہوں۔''

''وہ آپ کی؟''

''کچھ نہیں۔ بس وہ مجھے اچھی لگی۔ مرد ہونے کے ناتے مجھے ایک ساتھی عورت کی ضرورت تھی۔ اس کی رفاقت میں سیر و سیاحت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ وہ میری ہم وطن بھی تھی۔ آپ نے اسے دیکھا ناں؟''

وہ تنہائی اور اداسی کے علاوہ احساس جرم کا بھی شکار ہو رہا تھا۔

''پانچ ہزار ڈالر میں اگر آپ مجھے جہنم بھی لے جائیں تو میں انکار نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ترکی خاصہ مہذب ملک ہے۔ اس کے علاوہ وہ بڑا خوب صورت ملک ہے اور وہاں ہر قسم کی تفریحات ہیں۔ اس پر صدیوں سے مغربیت کا بڑا گہرا اثر ہے۔''

''ہاں...... یہ حرافہ نجانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے پانچ ہزار ڈالر پر آ گئی تھی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ میں اسے غیر قانونی ہنی مون منانے کے لیے ترکی لے جا رہا ہوں۔ اسے میں دنیا کا احمق ترین شخص نظر آیا تھا۔ ترکی کیا، یورپ اور امریکا میں لبنانی، اسپین کے علاوہ ہر ملک کا حسن و شباب کا دریا ہے۔ صرف پچاس ڈالر میں لڑکیاں ایک ہفتہ تک دل بستگی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ صرف ایک پیگ وہسکی، شیمپین اور شیری پر رات بھر مہمان رہتی ہیں۔ مجھے صرف ایک عورت کی محبت اور رفاقت چاہیے تھی۔ اس نے مجھے غلط سمجھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میں جسم کا بھوکا ہوں۔ بات یہ ہے دوست! آج کی عورت صرف جسم دیتی ہے۔ وہ محبت اور رفاقت نہیں، جس کا ایک مرد متلاشی ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اسے ایک ہزار ڈالر دے کر رخصت کر دیا۔''

اس کے لہجے نے میرے اعتماد کو بحال کر دیا۔ یقیناً وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔

''آپ نے ایک ہزار ڈالر یوں ہی دے دیے؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں۔ اس کا افسوس اور صدمہ ہے اس لیے کہ میں نے یہ رقم بڑی مشکل سے حاصل کی تھی۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کیا اس کے حصول کے لیے آپ نے کوئی قیمتی چیز یا جائیداد فروخت کی تھی؟'' میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

''نہیں...... میں نے اس ادارے سے جرائی تھی جہاں میں نے چالیس برس کا ایک لمبا عرصہ بڑی ایمانداری، فرض شناسی سے کام کیا تھا۔''

میں نے اس کی سچ بیانی پر اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو، وہ بڑی سچائی سے اقبال جرم کر رہا ہو۔

''جانتے ہو اس کمینی، حرافہ نے کیا کہا تھا؟'' اس

نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہلکی سی آواز میرے کان میں گونجی تھی۔ شاید اس نے ہوس پرست کہا تھا؟'' میں نے جواب دیا۔

''ہوس پرست......!'' اس نے دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ''جہنم میں جائے۔'' وہ بڑبڑایا اور خاموش ہو گیا۔ وہ بڑے سکون سے کرسی سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہنا یا کرنا چاہیے؟ میں دل جوئی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہوس پرست!'' وہ پھر بڑبڑایا۔ ''کل کی چھوکری مجھے ہوس پرست کہتی ہے اس لیے کہ اس عمر میں اپنی بیوی کے مر جانے کے بعد میں تنہا ہوں...... چالیس برس تک اس کا وفادار رہا۔ میں نے اس کے سوا کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مجھے کبھی اس سے بے وفائی کا خیال نہیں آیا۔ تم بھی ایرانی ہو۔ ایران میں میری بیوی نے چالیس برس کی ازدواجی زندگی میں کبھی بھی ہوس پرست نہیں کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ دفتر میں ملازمت کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں مجھ سے کس قدر بے تکلف ہیں۔ میری ان کے ہاں آمد و رفت رہتی ہے۔''

اس کی بات سن کر تھوڑا سا صدمہ ہوا۔ عمر میں وہ میرے باپ کے برابر تھا۔

''آپ کے بچے کہاں ہیں؟'' میں نے مزید ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان سب کی شادیاں ہو گئیں۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد اور خوش ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ رہے تھے۔ جہاں ان بچوں کے قہقہے اور شور میں کان پڑی آواز سنائی دیتی تھی لیکن ہم پھر میاں بیوی اکیلے رہ گئے۔ میں رات کے سناٹے میں اپنی بیوی کو دوسرے ملکوں کے حالات پڑھ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ وہ حیرت زدہ سنتی رہتی تھی۔ کبھی نہ کبھی ہم ان ملکوں کی سیر و سیاحت کو ضرور جائیں گے۔ وہ کہتی اور میں جواب نہیں دیتا۔ پھر چالیس برس بعد ایک رات ایسی آئی جب وہ میری باتیں سنتے سنتے سو گئی۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور میں ساری رات ایک لاش کے پہلو میں سوتا رہا۔ گھر کے سارے کمروں میں اندھیرا تھا۔ سارے دروازے بند تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو مزید دو کپ کافی لانے کے لیے کہا۔

''تم ابھی جوان ہو۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھ نہیں سکتے ہو۔ اس تلخ تجربے سے گزرنے کے لیے چالیس برس کی رفاقت چاہیے۔ مجھے یوں لگتا جیسے کسی نے میرے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے ہوں اور میں راتوں کو اس کے دوسرے ٹکڑے کو تلاش کرتا تھا۔ میرے ہاتھ خالی جگہ پر اس وجود کو ٹٹولتے تھے۔ کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے قریب سو رہی ہو اور اس کے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک میرے وجود میں رچ بس رہی ہو پھر میں روشنی جلا کر دیکھتا تو بستر خالی نظر آتا...... چادر بالکل بے داغ اور بے شکن ہوتی۔ اس عمر میں آدمی کے اعصاب ساتھ نہیں دیتے۔ تنگ آ کر میں نے اپنے ادارے میں ڈاکا مارنے کا فیصلہ کر لیا۔''

میں اس لمحے کا بڑی بے چینی اور کرب سے منتظر تھا جو کہ صدی کی طرح بھاری تھا اور میرے لیے اعصاب شکن بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے پل بھر کی بھی دیر نہیں کی۔ فوراً ہی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہوں۔ اس نے بات کو محسوس نہیں کیا اور میری اس حرکت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ سچ بول رہا تھا لیکن اپنے ادارے میں ڈاکے کا جواز قطعی غیر منطقی تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ جب لوگ غم زدہ ہوتے ہیں اور ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے تو وہ ڈاکے نہیں ڈالتے ہیں بلکہ نشہ آور چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔''

''ہاں ایسا کر سکتے تھے۔ مگر میری اپنی خواہش تھی کہ میں کیمسٹری میں ریسرچ کروں کیونکہ میری اپنی تجربہ گاہ تھی۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میں نے دوسرا کٹھن راستہ اس وقت اختیار کیا جب پہلے راستے پر چلتے چلتے اچانک ایک دن میں اکیلا رہ گیا۔ میں اکیلا چل نہیں سکتا تھا۔ ایک قدم بھی نہیں۔ بستر کی رنگینی کے لیے سولہ سترہ برس کی دوشیزہ بھی مل سکتی تھی۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ مجھے جسم سے نواز سکتی ہے محبت سے نہیں۔ وہ عورت بننے کے بعد مجھے لوٹ کر کسی آشنا کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ تم نے بھی نہ صرف سنا ہوگا بلکہ دیکھا بھی ہوگا اور دیکھتے ہی ہو گے جو عمر رسیدہ لوگ اپنی نواسی اور پوتی کی عمر کی کسی دوشیزہ کو جو مفلس گھرانوں کی ہوتی ہیں ان سے شادی

کر لیتے ہیں۔ وہ تشنہ اور نا آسودہ ہو کر کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو جاتی ہیں۔ میں اس تنہائی بھری زندگی میں جو بہت دکھی ہو گیا تھا حسین، نوجوان اور پرشباب بدن کی دوشیزہ کی نہیں بلکہ محبت، رفاقت اور جذبے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا۔ یوں جیسے میں نے شادی ہی نہیں کی ہو اور میری زندگی میں جیسے کوئی عورت ہی نہ آئی ہو۔ میرے دفتر میں جو مطلقہ اور بیوائیں تھیں وہ غیر محسوس انداز سے مجھ پر ڈورے ڈال رہی تھیں اس لیے کہ وہ غریب بے چاریاں بھی دکھی تھیں۔ انہیں سہارے اور محبت کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی زندگی کا خلا پُر کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا خیال اور اندازہ تھا کہ چونکہ میں بہت دکھی ہوں اس لیے وہ آشنا بن جائیں گی۔ ان عورتوں نے میری اور اپنی عمروں کو نہیں دیکھا۔ اپنے ہاں کسی نہ کسی بہانے سے مدعو کر کے ان جانے راستے پر جانا چاہتی تھیں لیکن میں نے انہیں مایوس کر دیا۔"

"کیا آپ شادی سے پہلے جرائم پیشہ بننا چاہتے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"جرائم پیشہ؟ میں نے کب کہا۔ میں تو ساری دنیا کی سیر و سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ گھریلو ذمے داریوں میں میری یہ خواہش دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی اور ملازمت کے دوران کوئی غبن تو درکنار، معمولی سی چوری بھی نہیں کی تھی۔ لوگ میری شرافت اور ایمانداری کی قسم کھاتے تھے۔ اب بہت کم لوگوں کو اس بات کا یقین ہوگا کہ میں نے ڈاکا ڈالا ہے اس لیے کہ میں نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ میں کسی صاف و شفاف آئینے کی طرح تھا۔"

"لیکن ڈاکا تو آپ نے ڈالا ہے۔" میں نے اپنی اندرونی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے جرح کے انداز میں کہا۔

"نہیں۔ لیکن یہ ایسا ڈاکا نہیں ہے جسے تم ڈاکے کا نام دو۔" اس نے تکرار کے انداز میں کہا۔ "اس لیے کہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ اتنے پیسوں کی کہ میں ساری دنیا کی سیر کر سکوں، امریکا اور یورپ کی دوشیزاؤں کی حسن و شباب اور البیلی جوانی کا لطف اٹھا سکوں۔ جو سیر و سیاحت کے لیے جاتے ہیں وہ شراب اور شباب کا بجٹ بھی بناتے ہیں لیکن میں نے نہ تو سوچا اور نہ ہی کوئی تصور کیا اس لیے کہ دنیا کے کسی ملک اور خطے کی کوئی بھی عورت ہو۔ اس کا تعلق کسی ملک، قوم اور رنگ و نسل سے کیوں نہ ہو۔ وہ عورت ہی ہوتی ہے۔ ایک ہی بات ہر عورت میں مشترک ہوتی ہے۔ ایرانی دوشیزاؤں اور عورتوں کا حسن و شباب، جسمانی نشیب و فراز، رنگت اور ان کے تناسب ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ انہیں ملکہ حسن میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ انہیں جس حالت میں اس مقابلے میں شرکت کرنی پڑتی وہ نہایت شرمناک اور معیوب ہوتی ہے جو ایک شریف لڑکی، عورت کو زیب نہیں دیتی ہے ورنہ وہ ہر سال ملکہ حسن منتخب کر لی جائے گی۔ میں نے بہت سوچا کہ ضرورت کہاں سے اور کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ میری دلی مراد پوری ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ احوال بتاتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا ہے پھر میں کیا کرتا، میں تمہیں بتاتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں اجنبی ہیں اور اس مالیاتی ادارے اور میرے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ سب کچھ ایسے ہی ہو رہا تھا جو میں چاہتا تھا۔ میں خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا اور احساس بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت جذباتی ہو رہا ہے۔ وہ سب کچھ خود ہی دے گا تا کہ اس کا صدمہ اور دل کی بھڑاس نکل جائے۔

"تم جانتے ہو روزانہ مالیاتی اداروں میں بڑی رقمیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہمارا مالیاتی ادارہ غیر ملکی کرنسی کا بزنس کرتا ہے۔ ڈالر، پاؤنڈ، اسٹرلنگ...! ہمارے ادارے میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے اکاؤنٹ تھے۔ ان میں زیادہ تر غیر ملکی کمپنیاں تھیں۔ ایران میں تعمیر و ترقی کا کام زوروں پر ہے۔ تیل تلاش کرنے اور بڑی بڑی تعمیراتی کمپنیاں دن رات اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ایک اطالوی کمپنی اپنے ملازمین کو تنخواہ ہمارے ادارے کے ذریعے دیتی تھی اور یہ تنخواہ ڈالر کی صورت میں دی جاتی تھی۔ ہر ماہ کی تیس تاریخ کو ہمیں پانچ لاکھ ڈالر کا بندوبست کرنا پڑتا تھا تاکہ اگلے دن کمپنی کے ملازمین کو تنخواہوں کی ادائیگی کی جاسکے۔ یہ رقم بھی میں بینک سے لے کر آتا تھا۔ گاڑی میں میرے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ ایک محافظ بھی ہوتا تھا جب کہ میں رقم کے ساتھ گاڑی کے پچھلے بند حصے میں، اکیلا بیٹھتا تھا۔ یہ ہر مہینے کا معمول تھا اور اس میں کبھی فرق نہیں آیا نہ ہی کبھی کوئی گڑبڑ ہوئی۔ رقم کا تھیلا بینک سے دو کر دفتر کے سیف میں رکھ دیا جاتا۔ کوئی اس تھیلے کو کھول کر اس میں جھانکتا نہیں تھا۔ اگلے روز ہی یہ تھیلا کھلتا تھا۔"

"آپ کو اپنے ادارے سے رقم اڑانے کا خیال کیسے آیا؟" میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں بیوی کے مرنے کے چھ ماہ تک بازو پر سیاہ پٹی باندھے پھرتا رہا۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے۔ مجھ پر ترس کھاتے اور مجھے اپنے گھر بلا کر خوش رہنے اور دوسری شادی کرنے کے مشورے دیتے۔ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کی تصویریں دکھا کر ان کے کوائف بتاتے۔ ایسی عورتوں کی جو لاولد تھیں تاکہ میں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر سکوں۔ ٹی وی کے میرے پسندیدہ پروگرام مجھے بیزار اور اکتانے لگے۔ جبکہ نہ صرف غیر ملکی چینل اور ان کے پروگرام، ڈرامے اور کرنٹ افیئرز سے بھرے ہوتے تھے جو میرے لیے کبھی بھی سنسنی خیز نہیں رہے تھے۔ البتہ نئی نسل گمراہ ہو رہی تھی۔ ان میں ان کی تفریح کا ایسا سامان تھا کہ وہ رات رات بھر جاگ کر ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون بھی تھا جس میں ہر قسم کے ممنوعہ پروگرام کی بھرمار تھی پھر میں نے ایک دن تنگ آ کر سیاہ پٹی نکال پھینکی۔ مجھے لوگوں کی ہمدردی اور ترس کے جذبے کے سہارے سے گزارنے والی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے کئی دوسری زبانیں سیکھنی شروع کر دی تھیں۔ میں نے اپنی نئی زندگی کے آغاز کا فیصلہ کر لیا۔ کامیابی کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔"

"یہ نئی زندگی گزارنے کے لیے آپ نے پاکستان کا ہی انتخاب کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔ "یہاں نہ تو نائٹ کلب ہیں اور نہ ہی امریکا یورپ جیسی رنگینی ہے۔ یہ ملک ہر طرح کے مسائل سے بھرا ہوا ہے۔"

"صرف اس لیے کہ یہاں یعنی کراچی اور اسلام آباد میں برسوں سے ایرانی آباد ہیں۔ اگر ایک اور ایرانی آباد ہو جائے تو کسی کو پتا نہ چلے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے حسن و شباب اور رنگینیوں سے دلچسپی ہوتی تو ہندوستان چلا جاتا۔ وہاں کا معاشرہ اس قدر پستی اور غلاظت کے دلدل میں دھنسا ہوا ہے کہ اس پر مغربیت کا گمان ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے احمقانہ انداز سے سر ہلایا۔

"جب میری ملازمت کی مدت ایک برس رہ گئی تو میں نے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ میں نے خلیج فارس کے ساحل، خوب صورت تاریخی شہر بوشہر میں لوگوں سے باتیں کیں اور سوالات بھی کیے۔ مگر سیاحت سے کنارے بھی حاصل کیے اور اپنے دوستوں سے خصوصی طور پر ذکر کیا۔ یہاں تک لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں ریٹائر ہونے کے بعد بوشہر میں سکونت اختیار کروں گا۔

چھ مہینے میں نے پچاس ہزار ڈالر کے نوٹوں سے بھرے ہوئے تھیلے کا وزن کیا۔ اس کے بعد میں نے تھوڑا تھوڑا کاغذ خرید کر نوٹوں کے برابر کاٹنا شروع کیا۔ ہر بنڈل کے نیچے میں نے ایک ایک نوٹ رکھا اور اسے تار سے باندھ دیا۔ سب کا وزن کر کے میں نے ایک سوٹ کیس میں بھر دیا۔ میں نے اپنا مکان فروخت کر دیا اور اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگا۔ جس شخص نے مجھے کرائے پر مکان دیا تھا وہ کرایہ لینے پر آمادہ نہ تھا کیونکہ مجھے

ہم جیسے عام انسانوں اور سوچنے والوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں سے بھی کوئی نہ کوئی مفید پہلو نکال ہی لیتے ہیں کہ اس تخریب میں مضمر ہے ایک تعمیر کی صورت۔

اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم تعمیر میں تخریب کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت ربڑ پلاسٹک کی ایجاد کے ساتھ ہوئی تھی۔

چارلس گڈ ایئر ربڑ کی کوئی اور قسم بنانے کے لیے تجربے کر رہا تھا۔

اس نے ربڑ اور سلفر کے مرکب کو ایک برتن میں رکھ کر اسٹو پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹو بجھا ہوا تھا۔ اس میں آگ نہیں ہے۔ پھر وہ کسی کام سے باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے چولہا تو بند ہی نہیں کیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر آیا۔ چولہے کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلفر اور چونے کے اشتراک سے کوئی اور چیز بن گئی تھی اور یہی پلاسٹک تھی۔ اس کے بعد اس نے مزید تجربات کیے لوگوں نے بھی اس فیلڈ میں کام کیا اور آج کی پلاسٹک آپ کے سامنے ہے۔

یعنی ایک غلطی ایسی بھی ہوتی ہے جو مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: اعجاز فرحت، سکھر

اس مکان میں صرف پندرہ دن رہنا تھا لیکن میں نے زبردستی کرایہ ادا کردیا۔ ریٹائرمنٹ سے قبل شام کو میرے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ انہوں نے مجھے سنہری گھڑی انعام میں دی اور میری تعریف میں بہت کچھ کہا گیا۔ میں نے جواب میں تہہ دل سے بہت شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے بوشہر جارہا ہوں۔ میں نے چیئرمین کو اپنا ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کل آخری بار ادارے کی کمپنی کے ملازمین کی تنخواہوں کی رقم لاؤں گا اور حسبِ معمول دوپہر تک کام کروں گا۔ میری اس بات پر خوب تالیاں بجیں۔ لوگوں نے مجھے ہار پہنائے اور پھر اگلے دن صبح ادارے کی وین میرے دروازے پر آگئی۔ گاڑی میں محافظ بھی موجود تھا۔ میں ایک سوٹ کیس اٹھائے مکان سے باہر آگیا۔ ڈرائیور اور محافظ مجھے دیکھ کر مسکرائے، بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے۔

''آپ ہمیں بہت یاد آئیں گے۔'' ڈرائیور نے جذباتی انداز سے کہا۔

''میں بھی آپ لوگوں کو یاد کرتا رہوں گا۔'' میں نے محافظ سے بغل گیر ہونے کے بعد کہا تو میرا لہجہ بھی جذباتی سا تھا۔

''بس یہی سامان آپ لے کر جارہے ہیں؟'' محافظ نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔

''مجھ اکیلے کے لیے یہ بھی بہت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ضرورت کا سامان وہاں پہنچ کر لیتا رہوں گا۔''

پھر میں سوٹ کیس سنبھالے ہمیشہ کی طرح وین کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔

جب بینک سے وین دفتر جارہی تھی میں بڑا پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ میں نے خود کو بڑے اطمینان سے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس تین تھیلے تھے۔ سوٹ کیس سے میں نے کاغذوں کے دو بنڈل خالی کرکے تھیلے میں ڈال دیے اور سوٹ کیس میں نوٹوں کے بنڈل رکھ دیے پھر میں بڑے سکون اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ محافظ اور ڈرائیور کو اس کارروائی کی ہوا تک نہیں لگی کیونکہ وہ سڑک پر نظریں جمائے فٹ پاتھ پر محوِ خرام دوشیزاؤں اور پُرکشش عورتوں کے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔

کمپنی کے دفتر پہنچ کر پہلے میں نے وہ تھیلا کھولا جس میں رقم تھی۔ نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر منیجر کے سامنے رکھ دی۔ وہ بہت رنجیدہ تھا۔ اسے میرے جانے کا بہت دکھ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رقم تجوری میں رکھ دیں اور مجھ سے رسید لے لیں۔''

''اب تم منیجر ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں ذمّے داری کا ثبوت دینا ہے۔ کبھی اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرنا۔ رسید دیتے وقت رقم گن کر تسلی کرلو۔''

وہ بنڈل کھول کر رقم گننے لگا۔ جب وہ رقم گن چکا تو میں نے دوسرے تھیلے کی گڈیاں اس کی طرف بڑھا دیں لیکن دوسرے تھیلے کی رقم گنتے ہوئے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ''جہنم میں گئی ذمّے داری۔'' وہ جھنجلا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ ''یہ تمام بنڈل تجوری میں رکھ دیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔''

میں نے تیسرا تھیلا کھولا۔ اس میں کاغذات والے بنڈل تھے جن کے اوپر اور نیچے ایک، ایک اصل نوٹ تھا۔ میں نے یہ بنڈل تجوری میں سب سے نیچے رکھے اور ان پر اصل نوٹوں کے بنڈل جما دیے، تجوری بند کردی۔

مقررہ وقت پر میں نے سب سے گرم جوشی اور بڑی خوش دلی سے ہاتھ ملایا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر سب کو جذباتی اور غم زدہ چھوڑ کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک اور اس وقت تک ہاتھ ہلاتے رہے جب تک ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئے۔ ابھی دفتر بند ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا اس لیے ان میں کوئی بھی الوداع کہنے ائرپورٹ تک نہیں آسکا۔ سب کو معلوم تھا کہ دوپہر کے بعد ایک جہاز بوشہر کا جاتا ہے۔ اس وقت ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ اس وقت دوسرا جہاز کراچی بھی جاتا ہے۔ وہ دن تک مجھے بوشہر ڈھونڈتے رہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن میں یہ سب کچھ خود اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔

''آپ کو یقین تھا کہ وہ اگلے دو دن تک ضمن کا پتا نہیں چلا سکیں گے؟''

''ہاں۔ ہمیشہ ایسا ہوتا چلا آیا تھا۔ پاسپورٹ وغیرہ میں پہلے ہی حاصل کرچکا تھا۔ پوری رقم کی رسید بھی مجھے مل چکی تھی۔ قانونی طور پر میں ہر طرح سے محفوظ تھا اور گرفت میں آنے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا۔ کیونکہ میں نے ملک سے نکلنے سے پہلے ایک غیر ملکی بینک میں تمام رقم جمع کرادی تھی تاکہ کسی بھی ملک میں نکلوا سکتا ہوں۔''

''واقعی آپ کی کہانی بڑی دلچسپ، سنسنی خیز اور سپنس

سے بھرپور ہے۔ اگر اس پر فلم بنائی گئی تو وہ ہٹ ہوسکتی ہے کیونکہ آج کل ایسی فلمیں کہاں بن رہی ہیں۔ وہ ایکشن اور عریانیت اور بولڈ قسم کے رقص پر بن رہی ہیں۔ اچھا تو اب آپ کہاں جائیں گے؟ استنبول یا کہیں اور؟ جیب بھری ہو تو آدمی کا دل حسن و شباب سے دل بہلانے کو کرتا ہے.....اور.....''

''بس کہیں نہیں صرف تمہارے ساتھ! کیونکہ تم انشورنس کمپنی کے سراغ رساں ہو۔ میں تمہیں مایوس کرنا نہیں چاہتا۔''

میں بھونچکا ہوگیا۔ ایسا سکتہ طاری ہوگیا جیسے کوئی بجلی سی آگری ہو۔ ''کیا آپ کو معلوم تھا کہ؟''

''ہاں..... اس نے مجھے بتادیا تھا۔'' اس کا اشارہ پری زاد خانم کی طرف تھا۔ ''مجھے پری زاد خانم پر غصہ آیا، دل میں کوستا اور گالیاں دیتا اسے دیکھتا رہا۔ جانے کیوں ایک پچھتاوا سا ہوا کہ میں نے تنہائی میں اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ مجھے دکھ اور افسوس کی بجائے اس بات سے ایک عجیب اور ان جانی خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی شریکِ حیات سے بے وفائی نہیں کی۔ اس کی محبت اور رفاقت کی لاج رکھی۔ آلودہ ہوکر میں اپنی بیوی کی نظروں میں گناہ گار ہوجاتا۔ اللہ بھی میری اس لغزش کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

''بات یہ ہے نوجوان دوست!'' سعد شیرازی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ''انسان صرف ایک زندگی گزار سکتا ہے۔ ساٹھ برس کے بعد دوسری زندگی شروع کرنے کا خیال لگتا تو بہت اچھا ہے اس لیے کہ عورت روز بہ روز نہایت ارزاں اور وضع قطع سے بے حجاب ہوتی جارہی ہے۔ عورت سے زیادہ حسین اور پُرکشش شے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن میرے لیے ناممکن ہے کہ میں غلاظت کے دلدل میں گر جاؤں کیونکہ چالیس سال تک جو محبت مجھے میری بیوی نے دی کوئی دوسری عورت نہیں دے سکتی۔ یہ عورت جو میرے منہ پر طمانچہ مار کر گئی ہے۔ وہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو چھوڑ دیا، دوسروں کو چھوڑ دیا جو مجھ سے پیسوں کے بغیر محبت کرتے تھے۔ وہ مجھے مجرم سمجھتے ہیں۔ لاکھوں ڈالروں کے عوض یہ سودا بہت مہنگا ہے۔''

''اب آپ کے پاس کتنی رقم بچی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جب کہ آپ نے شباب اور شراب پر خرچ نہیں کیا؟''

''رقم؟'' وہ بے خیالی میں بولا۔ ''مجھے پتا نہیں..... جس شخص نے عمر بھر ایک ایک پائی بچائی ہو۔ اپنی ذات کے لیے..... ان کے لیے جو بالآخر اسے چھوڑ گئے۔ وہ اور کیا کرے گا۔''

میری نگاہ باہر کی طرف اٹھی۔ سڑک پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔

''مسٹر سعد شیرازی.....!'' میں نے قدرے خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد کہا۔ ''آپ شاید یقین نہ کریں لیکن مجھے آپ سے ہمدردی ہے، معاملہ میری ملازمت کا ہے۔ کاش! میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا؟''

''مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ تہران جارہا ہوں۔ تم پیسا چاہتے ہو تو جاؤ باہر نئی کار کھڑی ہے۔ یہ اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ دونوں چیزیں لے لو۔'' اس نے چابیاں میرے سامنے ڈال دیں۔ ''میں ہر صورت میں واپس جارہا ہوں۔ ڈرو نہیں..... میں تمہارا نام نہیں لوں گا۔ میرے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہوگی۔ شاید جیل میں تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ جہاں مجھ سے کوئی ہمدردی کرنے والا نہ ہو۔ جہاں میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔''

''مسٹر سعد شیرازی!'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے پیسا نہیں چاہیے۔ مجھے اپنی ملازمت بہت عزیز ہے۔''

''احمق مت بنو۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم مجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تمہیں ترقی مل جائے گی۔ تنخواہ اور بونس بھی بڑھ جائے گا۔ چلو..... اکٹھے رات کا کھانا کھا کر کراچی روانہ ہوجائیں گے۔''

اس نے ویٹر کو بلا کر مینو کارڈ دیکھ کر کھانے کا آرڈر دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ ایک دکھی اور تنہا انسان تھا۔ شاید کمپنی ایک بڑی رقم کی رضاکارانہ واپسی پر اسے معاف کردے۔ ممکن ہے عدالت اسے کم سزا دے اور انشورنس کمپنی بھی تھوڑی بہت رعایت دینے پر آمادہ ہوجائے۔

''مسٹر سعد شیرازی!'' میں نے اچانک اور غیر متوقع کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بچاؤں گا۔ کمپنی معمولی ڈالر کا نقصان برداشت کرنا قبول کرلے گی۔ کار کچھ کم قیمت پر واپس ہوجائے گی۔ پھر تھوڑا سا فرق رہ جائے گا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ.....'' اس نے ہتھیلیاں اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کمپنی تمہاری بات مان لے گی؟''

کوٹھڑیوں کی طرف بڑھے تو وہ بنجارا جس کا نام کالو خان تھا، پہلی ہی کوٹھڑی میں مقید ملا۔ اس تنگ اور نیم تاریک سی کوٹھڑی میں اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی وزنی بیڑیوں اور ہاتھوں میں لگی ہوئی ہتھکڑیوں میں وہ یوں جکڑا ہوا تھا کہ بمشکل ہی چل پھر سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اگرچہ کرختگی اور عجیب سی سختی چھائی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی کشادہ اور کھلی کھلی آنکھوں میں عجیب عجیب سی تشنگی اور محرومیاں ہویدا تھیں۔ جیسے اس نے ساری زندگی رشتوں کی محبت کی پیاس میں سرگرداں گزاری ہو۔ جیسے زیست کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بے سائباں اور بھٹکتے بھٹکتے گزاردی ہو۔ اس کے بے رونق چہرے اور اس پر چھائی ہوئی نحوست سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کی ساری زندگی مختلف منشیات کے استعمال میں گزری ہے حالانکہ جیل کے ریکارڈ کے مطابق اس کی عمر پینتیس سال تھی۔ اس عمر میں جوانی یوں ٹوٹ کر آتی ہے کہ انسان کی رانوں تلے دبا ہوا گھوڑا بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا گھڑ سوار کوئی جوان جہان ہے... مگر مختلف نشوں کے استعمال نے اس کے جسم کو یوں کھوکھلا کردیا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے اڑا کر لے جائے گا۔ جیل کے عملے سے ہی پتا چلا تھا کہ اس نے اپنے ماں باپ کو قتل کیا ہے۔ اس قتل کے پیچھے اصل محرکات کیا تھے۔ یہ نہ اس نے پولیس کو بتائے تھے اور نہ ہی پولیس نے یہ محرکات جاننے کی کوشش کی تھی۔ پولیس کے لیے یہی بہت تھا کہ اسے جب خون آلود چھری سمیت پکڑ کر پولیس کے سامنے لایا گیا تو اس نے پوری سچائی اور دلیری کے ساتھ اس لرزہ خیز دہرے قتل کا اعتراف کرلیا تھا۔ عدالت میں اس نے پولیس کو قطعاً پریشان نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قتل کا یہ مقدمہ بہت کم عرصہ چلا اور اسے عدالت نے سزائے موت سنادی۔ نہ کوئی اس کا ولی وارث تھا جو اس سزا کے خلاف بڑی عدالتوں میں اپیل کرتا اور نہ ہی کالو خان کو اپیل سے کوئی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پھانسی کا دن بھی مقرر ہوگیا۔ اسے تقریباً دو ماہ بعد پھانسی دی جانی تھی۔

اپنی روزمرہ زندگی میں ہم ہر روز ان گنت چہرے دیکھتے ہیں۔ ان بے شمار چہروں میں ان کے باطن کی گندگی اور پاکیزگی ان کے چہروں پر صاف نظر آتی ہے۔ بہت ہی کم ایسے انسان ہوتے ہیں جن کے باطن میں دنیا جہان کی غلاظتیں گندے جوہڑوں کی طرح کلبلا رہی ہوتی ہیں۔ ان کی سوچیں، ان کے خیالات انتہائی سفلے اور شیطانی ہوتے ہیں... مگر ان کے چہرے ان کے باطن کی عکاسی نہیں کرتے۔ یہی حال اس بنجارے کا تھا۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ عادی قسم کا نشئی، شرابی، جواری تھا۔ دنیا جہان کے عیب اس میں تھے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو انتہائی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ اس کا باطن اس غلیظ جوہڑ کی طرح تھا جس میں ہمہ وقت گناہوں اور شیطانی اعمال کے کیڑے کلبلاتے رہتے تھے۔ مگر ان کی معمولی سی پرچھائیں بھی اس کے چہرے پر ہویدا نہیں تھی۔ شکل و صورت سے بس وہ ایک عام سا سیدھا سادا نشئی نظر آتا تھا جو ہمہ وقت مختلف منشیات کے نشے میں دھت نظر آتا ہے اور بس......

جیل کے اسٹاف میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور ٹرالی پر لدے ہوئے کمبلوں کے ڈھیر میں سے ایک کمبل اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔

''کالو خان یہ لو کمبل تاکہ سردی زیادہ ہوجانے کی صورت میں اسے اوڑھ سکو۔''

کالو خان نے ایک نظر ہم سب کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے ہلے بغیر بڑی بے نیازی سے بولا۔ ''اڑے من نوں کمبل کیا کرے ہے۔ من ای زندگی بس تھوڑی سی اے۔ پھر من نوں ہر سردی گرمی سے بے نیاز ہوجاوے ہے۔'' (ارے میں نے کمبل کا کیا کرنا ہے۔ میری زندگی تو بس تھوڑی سی رہ گئی ہے پھر ہر سردی گرمی سے بے نیاز ہوجاؤں گا)

اس اہلکار کے چہرے پر غصے کی لالی سی چھا گئی۔

''تیری تو......'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے اسے غالباً کوئی موٹی سی گالی دینا چاہی تھی مگر اچانک اسے ہماری اور اپنے بالا آفیسرز کی موجودگی کا خیال آگیا... چنانچہ وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''کالو خان! یہ کمبل تیری اور تجھ جیسے قیدیوں کی ملکیت میں نہیں دیے جارہے بلکہ یہ جیل کی ملکیت ہوں گے۔ تم اور تم جیسے قیدی جب اپنے اپنے جرائم کی پاداش میں اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے تو یہ کمبل تمہارے بعد آنے والے قیدیوں کے کام آئیں گے۔'' اتنا کہہ کر اس اہلکار نے کمبل اس کی طرف پھینکا اور کوٹھڑی کے دروازے کو بند کرتے ہوئے دوبارہ تالا لگا دیا۔ اگلی کوٹھڑی کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کمبل کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا اور بڑی بے نیازی سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

موت کی سزا بڑے سے بڑے جفادری اور دل گردے والے مجرموں کو بھی توڑ کر رکھ دیا کرتی ہے۔ غصے اور طیش کے جذبات سے مغلوب ہوکر انسان قتل تو کرلیتا ہے مگر جب ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ کر آتا ہے تو اسے

احساس ہوتا ہے کہ اس سے کتنا بڑا اور سنگین جرم سرزد ہوچکا ہے اور پھر جب اس جرم کی پاداش میں موت کی سزا سنائی جاچکی ہو اور اسے احساس ہوجائے کہ اس کی موت کا دن مقرر ہوچکا ہے اور ہر گزرنے والا دن اس کی زندگی کی معیاد کو کم کرتا جارہا ہے تو وہ اعصابی طور پر یوں ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے کہ ہمہ وقت روتا رہتا ہے اور پشیمانی کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے یہی دعا کرتا رہتا ہے کہ کاش کوئی ایسا معجزہ رونما ہوجائے اور اس کی مختصر سی رہ جانے والی زندگی کی جانب بڑھتے ہوئے موت کا عفریت ٹل جائے۔ مگر کالو خان جسے معلوم ہوچکا تھا کہ اس کی زندگی صرف اور صرف دو ماہ رہ گئی ہے اور ہر گزرنے والا لمحہ اس کی زندگی کو کم سے کم تر کررہا ہے اس کے باوجود اس کے چہرے پر نہ خوف کے سائے تھے اور نہ ہی کسی پشیمانی کا احساس۔ وہ تو یوں گرد و پیش اور آنے والے وقت سے بے نیاز کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ جیسے اسے نہ اپنی موت کا خوف ہے، اور نہ ہی لمحہ بہ لمحہ کم ہوتی ہوئی زندگی کی پروا۔ مجھے نجانے کیوں ایک کرید سی لگ گئی کہ آخر وہ کون سے محرکات تھے جس کی بدولت اس نے اپنے ماں باپ کو قتل کردیا اور اب اسے اپنے اس قبیح فعل پر نہ تو...... رتی برابر پشیمانی ہے اور نہ ہی ندامت، چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں اس کی کہانی جان کر رہوں گی۔ تمام قیدیوں میں کمبل تقسیم کرنے کے بعد ہم جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں بیٹھے جہاں ہمارے لیے ایک پرتکلف چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ قیدیوں کے لیے جو بھی چیزیں کوئی فلاحی تنظیم عطیہ کرتی ہے تو وہ تمام عطیات جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں جمع کروادی جاتی ہیں۔ جہاں جیل کا عملہ ضروری کارروائی کرنے کے بعد وہ عطیات اپنے مخصوص طریقہ کار کے تحت قیدیوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ اور عطیات دینے والی فلاحی تنظیموں کے عہدیداران جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ فوٹو سیشن کرنے اور چائے پینے کے بعد واپس چلے آتے ہیں۔ مگر میرا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب میں کسی تہوار یا کسی قومی دن کے موقع پر قیدیوں میں ''عید گفٹ'' یا عطیات دینے جاتی ہوں تو اپنی فلاحی تنظیم کے عہدیداران کے ساتھ جیل حکام سے یہ خصوصی اجازت ضرور لے لیتی ہوں کہ تحائف اور عطیات خود اپنے ہاتھوں سے قیدیوں میں تقسیم کرسکوں، دوسرے ان کے مسائل اور کہانیاں بھی سن سکوں۔

جیل سپرنٹنڈنٹ اور سینئر عملہ میرے اس معمول سے واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے میرے اور میرے ساتھ آئے ہوئے دیگر افراد کو قیدیوں میں کمبل تقسیم کرنے پر کسی قسم کا تعرض نہ کیا۔ انہوں نے اس وقت بھی کوئی تعرض نہ کیا جب میں نے چائے پیتے ہوئے کالو خان سے انٹرویو کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ چائے سے فارغ ہوتے ہی جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے عملے سے کہہ کر کالو خان کو پابہ زنجیر اپنے آفس میں بلالیا اور اب میں اس سے انٹرویو کررہی تھی۔ اس نے اپنی زبان میں جو کہانی سنائی۔ میں اسے اردو کے قالب میں ڈھال کر اسی کی زبانی پیش کررہی ہوں۔

میرا تعلق اس قبیلے سے ہے جسے خانہ بدوش، بھیل، واس، بنجارے، چنگڑ اور نجانے کن کن ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ہم لوگوں کا کوئی مذہب، کوئی دین، کوئی ضابطہ حیات اور کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہوتا۔ جانوروں کی طرح ہمیں پیٹ بھرنے، اولاد پیدا کرنے اور زندگی گزارنے سے غرض ہوتی ہے۔ حلال اور حرام ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہمارے قبیلے کے لوگ کسی ایک شہر، گاؤں یا جگہ پر ٹک کر نہیں رہتے۔ بلکہ جہاں چاہا اور جتنا عرصہ چاہا جھگیاں لگالیں اور جب وہاں سے دل اوبھ گیا تو جھگیاں اکھیڑیں، انہیں گدھا گاڑیوں پر لادا اور نئی جگہوں کی تلاش میں چل دیے۔ میں نے بنجاروں کے جس قبیلے میں آنکھ کھولی۔ وہ بھی ایک ایسا ہی قبیلہ تھا جو پاکستان کے مختلف علاقوں میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے قیام کرتا اور پھر نئے شہر، قصبے اور علاقوں کی جانب کوچ کرجاتا۔ ہمارے قبیلے میں بہت سے جرائم پیشہ مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ مردوں میں کچھ لوگ بظاہر بندر، ریچھ اور مختلف سدھائے ہوئے جانور لے کر گلی محلوں میں کھیل تماشے دکھانے نکل جاتے اور عورتیں رنگین کاغذ کے کھلونے مثلاً کاغذی گھوڑے وغیرہ بنا کر ٹوکروں میں سجاتیں اور علی الصبح بیچنے نکل جاتیں۔ مگر ان سب کی آڑ میں وہ اس سارے علاقے کی ریکی کرتیں اور جہاں جہاں بھی انہیں اپنے ''ٹارگٹ'' نظر آتے۔ وہ واپس آکر اپنے ساتھیوں کو خبر کردیتیں... پھر ان کی نشاندہی پر ان کے ساتھی چوری ڈاکے اور دیگر جرائم اتنی استادی سے کرتے کہ ان کا کوئی سراغ ہی نہ ملتا۔ ہمارے قبیلے کے کچھ افراد منشیات فروش بھی تھے جو منشیات کا لین دین بڑی رازداری سے کرتے تھے۔ ہمارے قبیلے کا ایک

سردار بھی ہوتا تھا جو اپنے قبیلے کے تمام جرائم پیشہ سے باقاعدہ حصہ وصول کرتا تھا اور اس کے عوض وہ انہیں تھانے کچہریوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ ہمارے قبیلے کے بچے، بچیاں اور جوان لڑکیاں گداگر بھی تھیں جو علی الصبح علاقے کے مختلف بارونق چوراہوں، بس اسٹاپ، رکشا اسٹینڈ، ویگن اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن اور دیگر پُرہجوم جگہوں پر بھیک مانگنے پہنچ جاتیں۔ شام کو جھولی بھر کر لاتیں اور قبیلے کے سردار کا حصہ اس کی جھگی میں پہنچا کر اپنی اپنی جھگیوں میں پہنچ جاتیں۔ ہمارے اس قبیلے میں بہت سے ایسے جرائم پیشہ بھی تھے جو قتل، ڈکیتی اور دیگر مختلف سنگین جرائم میں ملک بھر کی پولیس کو مطلوب تھے۔ ان کی گرفتاری پر حکومت نے بڑے بڑے انعامات مقرر کر رکھے تھے۔ مگر وہ ایک معقول رقم کے عوض ہمارے سردار کی پناہ میں روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے ہوش سنبھالتے ہی مجھے بھی قبیلے کی روایت اور رواج کے مطابق دیگر بچوں کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ گویا میری عملی زندگی کا آغاز ہوگیا۔

مجھے یہ سب پتو نجانے کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ میری عمر کے تمام لڑکے اور لڑکیاں شام کو تھیلے بھر بھر کے بھیک لایا کرتی تھیں مگر میرے تھیلے میں بہت کم پیسے ہوتے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ میں۔ پتا تھا کہ میرے ساتھی بس اسٹاپ، لاری اڈے، ریلوے اسٹیشن اور دیگر بارونق چوراہوں، سڑکوں پر ہر آنے جانے والے کے ساتھ یوں چپک جاتے اور اس طرح کی بھرپور ایکٹنگ کرتے کہ ان لوگوں کو ان بھکاریوں اور بھکارنوں کو کچھ دیے بغیر جان چھڑانی مشکل ہو جاتی اور وہ چھوٹے چھوٹے ان کو دے کر ہی آگے بڑھتے تھے۔ مگر میں ان سب سے الگ تھلگ بالکل خاموش کھڑا رہتا۔ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا اور نہ ہی منہ سے کچھ بولتا۔ تاہم چونکہ میرا حلیہ مانگنے والوں جیسا ہی ہوتا اس لیے کوئی خدا ترس اور اللہ کا نیک بندہ دیکھ کر چھوٹے موٹے میرے کچھ پیسے ہاتھ میں دے جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ کم بھیک لانے پر اکثر سردار اور ماں باپ سے مری پٹائی بھی ہو جاتی تھی۔ شروع شروع میں انہیں شک تھا کہ میں پیسے خورد برد کر جاتا ہوں اس لیے میری بھرپور جامہ تلاشی لی جاتی مگر جب میرے ساتھیوں نے بتایا کہ میں بھیک نہیں مانگتا بلکہ سب سے الگ تھلگ رہتا ہوں تو ان کے سارے شکوک و شبہات رفع تو ہو گئے تاہم کم بھیک لانے کے جرم میں میری سزا اور مار پیٹ جاری رہتی۔

ماں باپ اور سردار کا خیال تھا کہ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھیک مانگنے کے سارے گر سیکھ جاؤں گا۔ مگر چودہ سال کی عمر ہو جانے کے باوجود بھی میری کارکردگی مایوس کن ہی رہی تو سردار کے مشورے پر میرے ماں باپ نے میری لائن (بھیک مانگنا) بدل دی۔ اب میرے ماں باپ نے مجھے قبیلے کے ان استادوں کے سپرد کر دیا جو جرائم پیشہ تھے اور مختلف جرائم مثلاً منشیات فروشی، چوری چکاری، ڈاکا زنی حتیٰ کہ قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ مگر ان استادوں کی شاگردی میں پانچ چھ سال گزارنے کے باوجود میری کارکردگی بالکل صفر رہی۔ نجانے مجھے یہ سب کچھ بالکل ہی اچھا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی یہ سب کرنے کو میرا دل چاہتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے قبیلے کے تمام تر رسم و رواج، روایات اور طریقوں سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ حالانکہ میں اسی قبیلے کا بیٹا تھا۔ اسی قبیلے میں ہوش سنبھالا۔ یہیں جوان ہوا۔ قبیلے کے دیگر لوگوں کی طرح مجھے بھی ان جیسے طور طریقے اپنا لینے چاہئیں تھے۔ بھیک مانگنے، جوا کھیلنے، چوری چکاری، منشیات فروشی اور دیگر جرائم اپنا لینے میں مجھے کوئی عار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے ان سب چیزوں سے نفرت تھی۔ کئی دفعہ اپنی خواہشات کو مار کر میں نے اس قبیلے کی دنیا اور ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہا۔ مگر نجانے کیوں میں اپنے آپ کو اس قبیلے کے ماحول میں ڈھال سکا اور نہ ہی یہاں کی روایات و رسم و رواج اپنا سکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں پورے قبیلے کے لیے اچھوت تو بن ہی گیا تھا خود اپنے ماں باپ اور سردار کی نظروں میں معتوب بھی ٹھہرا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ماں باپ اور دیگر لوگ مجھے نکھٹو، کام چور اور نجانے کس کس القاب سے پکارتے، اور تو اور قبیلے کی عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی مجھ پر طرح طرح کی پھبتیاں کستیں۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں، قصبے قصبے، عارضی پڑاؤ کے ساتھ ساتھ وقت گزرتا رہا اور میں عمر کی منازل طے کرتا رہا۔ میرے ماں باپ اب بوڑھے ہو چلے تھے۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر اکثر کوسنے دیتے رہتے کہ میں جوان جہان ہو کر بھی گھر پڑے اینڈتا رہتا ہوں جبکہ میرے دیگر بہن بھائی جو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں اپنے مختلف پیشوں کی بدولت اچھے خاصے کماؤ پوت بن گئے ہیں مگر میں کیا کرتا۔ میرا دل اپنے بہن بھائیوں کی طرح چوری چکاری، بھیک مانگنے، جوا کھیلنے کو

تیار نہیں کرتا تھا۔ اپنے ہی لوگوں کے درمیان میں ان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ دل کی ویرانی اور تنہائیوں سے اکتا کر میں اکثر اپنی جھگیوں کے شہر سے دور کسی ویران جگہ پر چلا جاتا اور پہروں وہاں بیٹھا انجانی سوچوں اور خیالات کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا رہتا۔ میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھے اس قبیلے میں پیدا کیا یہیں پروان چڑھایا پھر کیا وجہ ہے کہ میں اس قبیلے میں اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس قبیلے کی عادات، اس کے اطوار، اس کی روایات، اس کے رسم و رواج سے کیوں اتنی نفرت ہے۔ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں کیوں نہیں ڈھال پا رہا ہوں۔ ایک روز میں اپنی جھگیوں سے دور نکل گیا۔ ان دنوں ہم ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن کے قریب جھگیاں ڈالے ہوئے تھے جس کے قریب ہی دریا بہتا تھا۔ یہ جہلم شہر تھا۔ میں دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھا یوں ہی بے مقصد پانی میں کنکریاں پھینک رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہی قریب سے پازیب کی ہلکی سی جھنکار سنائی دی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ رانو تھی۔ رانو بھی میرے ہی قبیلے کی تھی۔ میں اکثر اسے دیکھا کرتا تھا کہ وہ علی الصبح بھیک مانگنے نکل جاتی اور شام کو جب واپس لوٹتی تو اس کا تھیلا بھرا ہوا ہوتا تھا۔ وہ سردار کا حصہ اس کی جھونپڑی میں جا کر اس کے حوالے کرتی اور باقی رقم ماں باپ کو تھما دیتی۔ اس کے ماں باپ اس سے بہت خوش تھے۔ قبیلے ہی کے کسی آدمی سے پتا چلا تھا کہ شروع شروع میں وہ بھی انتہائی اکھڑ مزاج تھی۔ میری طرح اسے بھی اس ماحول، اس قبیلے کے رسم و رواج سے نفرت تھی۔ اسے بھیک مانگنے کے لیے ہر قماش کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس قبیلے کی دیگر عورتوں اور جوان لڑکیوں کے برعکس بھیک کی آڑ میں اوباش لوگوں کا ہاتھ پکڑنا، فحش اشارے کرنا اور گرسنہ اور ہوس آلود نگاہوں سے دیکھنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر ماں باپ کی غیر انسانی سزاؤں اور سردار کے وحشیانہ سلوک کے سامنے اسے ہتھیار ڈالتے ہی بنی، اور اب وہ بنجاروں کی اسی بستی کی ایک کامیاب اور شاطر ترین لڑکی تھی۔ وہ اپنی عشوہ طرازیوں اور ناز و انداز سے لوگوں کی جیبوں سے بہ آسانی پیسے نکال لیتی۔ اور وہ منچلے لوگ جب اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتے تو وہ ان کے لیے انجیر کا وہ پھول بن جاتی جو دیکھنے میں دسترس میں نظر آتا ہے مگر ہاتھ

> ## رائی (Mustard)
>
> ایک ایسا پودا ہے جس کا بیج عموماً سالنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پودے کی لمبائی تقریباً چھ فٹ ہوتی ہے اور اس میں چار پتیوں والے، پیلے رنگ کے پھولوں کے گچھے نکلتے ہیں۔ بیجوں کی پھلی یا ڈوڈا ایک انچ لمبا ہوتا ہے۔ اس پودے کا وطن ایشیا ہے اور اسے سیاہ رائی کہتے ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا ایک پودا یورپ میں کاشت کیا جاتا ہے جو سفید رائی کہلاتا ہے۔ رائی کے بیجوں کو پیس کر، پانی اور آٹا ملا کر پلستر بھی بناتے ہیں۔ نیز اس سفوف کو اچاروں میں بھی ڈالا جا سکتا جاتا ہے۔ مسکن درد ہے۔ یعنی چوٹ کے درد پر لگایا جائے تو درد کھینچ لیتا ہے۔
>
> مرسلہ: فراز حیدر، علی پور چٹھہ

بڑھاؤ تو پنچ سے دور لگتا ہے۔

اس اتھری گھوڑی کو نجانے مجھ میں کیا نظر آیا کہ اس کا جھکاؤ میری طرف ہو گیا۔ شاید اسے یہ خبر ہوئی تھی کہ میں اس ماحول سے اس قبیلے کی روایات سے باغی ہوں۔ کسی وقت اس نے بھی قبیلے کی روایات اور ماحول سے بغاوت کی تھی۔ مگر تشدد اور غیر انسانی سزاؤں نے اس کی بغاوت کو دبا لیا تھا اور وہ اس ماحول میں ڈھل گئی تھی۔ مگر میں اب ایک جوان سال مرد تھا اور ابھی تک سرنڈر نہیں کیا تھا، اور باوجود تھارہ جانے کے علم بغاوت بلند کیے ہوئے تھا۔ میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ میں نے اپنے دل کی ویرانی اور تنہائیوں سے گھبرا کر مختلف منشیات کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ سردار نے مجھے راہ راست پر نہ آتے دیکھ کر اپنے خاص بندوں کو میرے پیچھے لگا کر مجھے مختلف نشوں کا عادی بنا دیا تھا۔ سردار کے نزدیک جب میں منشیات کے نشے کا عادی ہو جاؤں گا تو پھر منشیات کی فراہمی سے ہاتھ کھینچ لیا جائے گا۔ مجبوراً مجھے نشے کے لیے ہر وہ کام کرنا پڑے گا جو اس قبیلے کے دیگر افراد کرتے تھے یعنی جرائم کی دلدل میں یوں پھنس جاؤں گا جہاں سے نکلنا ناممکن

ہو جائے گا۔

"آج اکیلے بیٹھے ہوئے ہو؟" رالو نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

رالو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی چند لمحوں کے لیے جیسے کہیں کھو سی گئی۔

"بتاؤ ناں تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے دوبارہ اس سے پوچھا تو وہ جیسے چونک سی گئی۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی:

"میں تمہارے لیے آئی ہوں۔ میں نے تمہیں ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا چنانچہ تمہارے پیچھے پیچھے چلی آئی۔"

"مگر کیوں!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اس پورے قبیلے میں میرے ساتھ تو ایسا کوئی نہیں کرتا۔ ہر کسی کی نظر میں میں نکھٹو ہوں۔ کام چور ہوں۔ خود میرے والدین بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔" میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔

رالو چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بڑی بے باکی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "مگر میں تو تمہیں بہت ہی اچھا سمجھتی ہوں۔ اور اس اچھا لگنے کی وجہ یہ ہے کہ تم نے بھی میری طرح اس ماحول کو دل سے نہیں اپنایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ابھی تک قبیلے والوں اور بالخصوص سردار کے سامنے نہیں جھکے جبکہ میں ہار گئی۔ مگر یقین کرو باوجود ہار جانے کے میں اس ماحول سے اب بھی نفرت کرتی ہوں۔ شدید اور بے انتہا نفرت۔"

"رالو!" میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "اس قبیلے سے ہی ہماری بقا ہے۔ جس طرح مچھلیوں کی زندگی پانی سے شروع ہوتی ہے اسی طرح ہماری زندگیاں بھی اسی قبیلے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہم تہذیب و اخلاق سے عاری وہ لوگ ہیں جن کا کوئی مذہب ہے نہ حلال و حرام کی تمیز، جانوروں کے بھی زندگی گزارنے کے کچھ اصول ہوتے ہوں گے مگر ہم تو جانوروں سے بدتر ہیں۔ نہ زندگی گزارنے کا قرینہ ہے نہ جینے کا کوئی مقصد۔ بس جائز ناجائز طریقے سے کھانا پینا، بچے پیدا کرنا۔ قریہ قریہ گھومتے پھرتے زندگی گزارنا اور مر جانا۔ بس یہ ہے ہماری زندگی...... تم شاید مجھ تہذیب و تمدن سے عاری ایک اجڈ اور گنوار سے بنجارے کے منہ سے ایسی باتیں اور خیالات سن کر حیران تو ضرور ہوتی ہو گی۔ میں خود بھی حیران و پریشان ہو جاتا ہوں کہ تعلیم سے عاری اس غیر مہذب قبیلے میں رہنے والے ہر انسان کی طرح میری سوچیں بھی ایسی کیوں نہیں ہیں۔ میں کیوں ان جاہل بنجاروں کی طرح زندگی گزارنے۔ ان کے انداز و اطوار اور عادات اپنانے سے گریزاں ہوں۔ میں اپنے اس آبائی قبیلے میں کیوں تنہا تنہا سا پھرتا ہوں۔ جواب دو مجھے رالو جواب دو۔" میں نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"کالو خان!" وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ...... یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج! کیا تم یقین کرو گے کہ میرے دل و دماغ میں بھی ایسے ہی خیالات آتے تھے... مگر جس سلیقے سے تم نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی تھی۔ بس سوچ کر رہ جاتی ہوں۔"

اس روز میں اور رالو دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور جب اٹھے تو ہم ایک دوسرے کے دلوں اور روحوں میں یوں سما چکے تھے جیسے ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

اس طویل ملاقات کے بعد مجھ میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ میں جو خود اس گھٹے ہوئے ماحول میں خود کو تنہا تنہا اور اجنبی اجنبی سا محسوس کرتا تھا۔ رالو کی رفاقت میں میری زندگی میں گویا بہار آ گئی۔ یہی قبیلہ، یہی جھگیاں جہاں کا ماحول مجھے ہمیشہ پریشان کیے رکھتا تھا۔ رالو کی محبت میں اب یہی سب کچھ مجھے بہت خوبصورت اور حسین لگنے لگا تھا۔ اب جب بھی رالو فارغ ہو کر آتی ہم دریا کی طرف نکل جاتے اور گھنٹوں وہاں بیٹھے سنہرے مستقبل کے حسین خواب دیکھتے رہتے۔ ہمارے قبیلے میں شادی بیاہ کے لیے مہذب دنیا کی طرح نہ کوئی شرعی اور اخلاقی قوانین رائج تھے اور نہ ہی مذاہب اور رشتوں کی حدود و قیود۔ بس جانوروں کی طرح جب چاہا اور جس سے چاہا وقتی طور پر رشتہ ازدواج جوڑ لیا جاتا اور جب دل بھر جاتا تو ساتھی بدل لیا جاتا۔ بڑی عجیب اور انوکھی بات یہ تھی کہ مجھے اور رالو کو رشتوں کی یوں بے حرمتی اور عارضی پن بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ ہمارے قبیلے اور ہم دونوں کے باپ داداؤں میں سے کسی نے بھی یوں ایک جیون ساتھی کے ساتھ تمام عمر زندگی نہیں گزاری ہو گی۔ مگر ہم دونوں کے دلوں میں یہی خیال جاگزیں تھا کہ ہم تمام عمر ایک دوسرے کے سنگ سنگ زندگی گزاریں گے۔ پتا نہیں ہم دونوں قبیلے والوں سے بالکل منفرد کیوں تھے۔

ہم دونوں نے شادی کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا اور اس سلسلے ابھی کوئی پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ ایک دن وہ سب کچھ ہو گیا جس کی ہمیں توقع ہی نہ تھی۔ اس روز جب رالو بھیک مانگ کر واپس آئی اور سردار کا حصہ اس کی جھگی میں پہنچا کر اپنی جھگی کی طرف جا رہی تھی تو مجھے ملاقات والی جگہ پر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی جھگی میں چلی گئی۔ یہ ہمارا روزمرہ کا معمول تھا۔ رالو شام کو واپس آ کر سردار کی جھگی میں جاتی اور واپسی پر مجھے مخصوص جگہ پر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی جھگی میں چلی جاتی اور دن بھر کی کمائی ماں باپ کے حوالے کر کے کھانا وغیرہ کھا کر ملاقات والی جگہ پر پہنچ جاتی۔ جہاں میں پہلے سے اس کا انتظار کر رہا ہوتا پھر ہم وہاں کافی دیر بیٹھے مستقبل کے خواب بنتے رہتے۔

اس روز میں رات گئے اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ مجھے پریشانی سی لاحق ہو گئی۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے آنے کا اشارہ دیا ہو اور نہ آئی ہو۔ تھک ہار کر میں رات تقریباً بارہ بجے واپس جھگیوں میں لوٹ آیا۔ کئی جھگیوں میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ان جھگیوں میں جوئے کی بازی لگی ہوئی ہو گی۔ میں ان جھگیوں کے قریب سے ہوتا ہوا اپنی جھگی میں آ کر لیٹ گیا۔ میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ رالو کی غیر حاضری سے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رالو کو کوئی ایسی مجبوری پیش آ گئی ہو جس کی وجہ سے وہ نہ آ سکی ہو۔ مگر نجانے کیوں میرا دل یہ تاویل نہیں مان رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی "ان ہونی" ہو گئی ہو۔

اگلی صبح رالو معمول کے مطابق بھیک مانگنے بھی نہ گئی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کشاں کشاں اس کی جھگی میں چلا گیا۔ وہ جھگی میں اکیلی تھی۔ چٹائی پر بچھے ہوئے بستر میں چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ اور متورم آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کافی دیر تک روتی رہی ہے۔ میں اس کے قریب ہی نیچے بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے رالو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!" میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا جیسے مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کی پیشانی تیز بخار کی حدت سے جل رہی تھی۔ "اوہ رالو تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ کوئی دوا وغیرہ لی؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ فلاں عمارت بیٹھ گئی کیونکہ اس کی تعمیر میں خرابی رہ گئی تھی۔

اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ایسی بربادی کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ پرانی تاریخ کو چھوڑیں موجودہ دور میں ہی لے لیں۔

اندازاً پوری دنیا میں کروڑوں عمارتیں تو ہوں گی لیکن ان میں سے کتنی عمارتیں بیٹھی یا منہدم ہوئی ہیں۔ کم بہت ہی کم۔

تباہ کن زلزلے آتے ہیں۔ سیلاب آتے ہیں لیکن زیادہ تر عمارتیں کھڑی رہتی ہیں۔ اور جو بیٹھ جاتی ہیں وہ زلزلے یا سیلاب کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی غلطی کی وجہ سے بیٹھتی یا تباہ ہوتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف موجودہ یا زمانہ قریب ہی کی عمارتیں اپنے ڈیزائن یا انجینئرنگ کی خرابی کی وجہ سے منہدم ہوتی ہوں۔

بلکہ اس قسم کے واقعات صدیوں پہلے بھی ہو چکے ہیں۔

مثال کے طور پر 27ء میں ایسا ہی ایک حادثہ ہوا تھا۔

آپ نے روم کے تھیٹرز کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہوگا۔ بلکہ اس کی تصویریں بھی دیکھی ہوں گی۔ اس زمانے میں اس اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر لوگ بیٹھ جایا کرتے اور درمیان میں تماشا ہوا کرتا۔

یہ تماشا کیا تھا۔

خطرناک لوگوں کی جنگ۔ ان جنگجوؤں کو Glabiators کہا جاتا تھا۔

یہ بہت بہادر اور قوی ہیکل ہوا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل کے دور میں جب اکھاڑے میں کشتی ہوتی ہے تو اعلان کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو سکیں۔

تو اس دن بھی ایسا ہی ایک تماشا ہونے والا تھا۔

شہر کے زیادہ تر لوگ اکھاڑے میں جمع ہو چکے تھے۔ اس تھیٹر کی تکمیل کچھ دنوں پہلے ہی ہوئی تھی اور یہاں یہ پہلا تماشا تھا۔

اس دور کے انجینئر نے ایک غلطی کر دی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا وہی ہوا۔ اس کے اندازے کی غلطی نے سیکڑوں کی جانیں لے لیں۔ پورا تھیٹر ایک زوردار آواز کے ساتھ بیٹھ گیا اور سیکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔

اس دور کے حساب سے جو مالی نقصان ہوا ہوگا۔ وہ الگ ہے۔

مرسلہ: عنبرین سلطان علی، کراچی

میرے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ میں پریشان ہو گیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی ساون بھادوں آنکھیں چھم چھم آنسو بہاتی رہیں۔ کافی دیر بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "کالو خان!" اس نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے انتہائی آزردہ لہجے میں کہا۔ "رات مجھ پر ایک ایسا تکلیف دہ انکشاف ہوا ہے کہ میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہوں۔ رات میں تمہارے پاس آنے کے لیے جھگی سے نکلنے ہی لگی تھی کہ میرے ماں باپ نے مجھے روک لیا۔ اس وقت وہ دونوں کسی تیز نشے میں دھت تھے۔

"رات کا وقت ہے تو اس وقت کہاں جا رہی ہے؟" باپ نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تجھے نشے پانی کے لیے میں نے پیسے دے دیے ہیں ناں۔ اب تجھے اس سے کیا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔" میں نے پلٹ کر جواب دیا۔

"جانا کہاں ہے اس نے اسی کنگلے کالو خان کے پاس جا رہی ہوگی۔ جو پورے قبیلے حتیٰ کہ ماں باپ کا بھی دھتکارا ہوا ہے۔" ماں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور زمین پر بڑی نفرت سے تھوک دیا۔

"زبان چلاتی ہے......" باپ نے انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ "اپنی اوقات جانتی ہے؟ تو ہمیں نشے پانی کے لیے پیسے دیتی ہے تو کوئی احسان نہیں کرتی۔ ہم نے بھی پیسے خرچ کر کے تجھے خریدا ہے۔" باپ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ہوش ربا انکشاف کر رہا تھا اور میں صدمے اور حیرت سے بت بنی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ میں تو تمہارے پاس آنا بھی بھول گئی تھی۔ باپ کے کہنے کے مطابق ہمارے قبیلے میں کچھ ایسے بھی سفاک لوگ ہیں جن کا کام بچوں کا اغوا یعنی بردہ فروشی ہے۔ ہمارا قبیلہ جب کسی جگہ قیام کرتا ہے تو یہ گروہ جانوروں کا تماشا دکھانے اور رنگین کاغذ کے کھلونے اور غبارے بیچنے کی آڑ میں اس علاقے کی ریکی کرتے ہیں اور جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ کسی چھوٹے بچے کو اغوا کر کے دوسرے شہر لے جاتے ہیں۔ جہاں ان جیسے خانہ بدوش قبیلے کے لوگ ان بچوں کو خرید کر انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جن سے وہ بھیک منگوانا، منشیات فروشی، چوری چکاری کے کام لیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے اس عمر میں اغوا کیا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی۔ میرے نام نہاد باپ نے اور بھی بہت سے انکشافات کیے تھے۔ نشے میں ہزاروں برائیاں ہوتی ہیں مگر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انسان کے منہ سے سچ نکل جاتا ہے۔ ماں باپ تو بک جھک کر جھگی کے ایک کونے میں پڑ کر سو گئے مگر مجھے سوچوں اور صدمے کی سولی پر لٹکا گئے۔ میں روتی رہی اور سوچتی رہی کہ نجانے میں کن ماں باپ کی آنکھوں کا نور تھی۔ اور ان بدبختوں نے میرے ماں باپ کی آنکھوں کا نور چھین کر بنجاروں کی جھگیوں میں لا پھینکا تھا۔

میں اور رانو باتیں کر ہی رہے تھے کہ رانو کے ماں باپ جھونپڑی میں آ گئے۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو انہوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ پھر اس کا باپ بڑے تلخ لہجے میں مجھ سے بولا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ چل دفع ہو جا یہاں سے۔"

رانو کی کہانی سن کر میرا خون پہلے ہی کھول رہا تھا۔ اب جب اس کے باپ نے میرے ساتھ اس لہجے میں بات کی تو میرا پارہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا ابھی گلا گھونٹ کر اسے ختم کر دوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ تاہم بڑے سرد لہجے میں بولا۔ "وہ بندہ کہاں ہے جس سے تم نے رانو کو خریدا تھا۔"

"کیا کرے گا پوچھ کر!" اس نے تمسخرانہ انداز میں میرے سوال کو ہوا میں اڑاتے ہوئے کہا۔ میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ "بتاتے ہو یا ابھی ٹینٹوا دبا کر تمہیں اوپر پہنچا دوں۔" میں نے اس کے گلے پر ہاتھوں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ رانو کی ماں نے شور مچا دیا۔ پل بھر میں اردگرد کی جھگیوں سے لوگ نکل آئے اور بمشکل مجھے اس سے علیحدہ کیا اور گھسیٹتے ہوئے جھونپڑی سے باہر لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں رانو اس کے ماں باپ اور میرے ماں باپ سردار کی جھونپڑی کے سامنے کھڑے تھے۔ سردار جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گویا سردار کی سربراہی میں عدالت لگ چکی تھی۔ ہمارے بیانات ہوئے پہلے رانو کے ماں باپ کے بیانات ہوئے۔ جس میں انہوں نے اصل کہانی گول کرتے ہوئے مجھ پر جھوٹا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ "میں ان کی بیٹی کو ایک عرصے سے ورغلا رہا تھا اور آج ہماری عدم موجودگی میں یہ ہماری جھونپڑی میں اس وقت آیا جب رانو اکیلی تھی۔ اس نے دست درازی کرنا چاہی مگر اتنے میں ہم آ گئے۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کی تو اس نے مجھے گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی۔ اگر میری عورت کے شور مچانے پر اور لوگ نہ آ جاتے تو اس نے مجھے مار ہی دینا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔" اس

کے بیان کی تصدیق اس کی عورت نے بھی کر دی۔ رانو نے بیچ میں کچھ بولنا چاہا تو سردار نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ میں حیران تھا کہ خانہ بدوشوں کے اس قبیلے میں جہاں عورت کی عزت کوئی معنی نہیں رکھتی جہاں عورت کو کھلونے اور پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہاں رانو کے حوالے سے ایک بے بنیاد الزام مجھ پر لگا کر سردار کے روبرو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ بے شک میں نے رانو کے باپ کا گلا دبایا تھا۔ مگر ایسے لڑائی جھگڑے تو قبیلے میں ہوتے ہی رہتے تھے اور پھر خود ہی نمٹا بھی دیے جاتے تھے۔ ہاں جب معاملہ حد سے بڑھ جاتا تھا تب سردار کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوتا تھا۔ میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ سردار کی بھاری آواز گونجی۔ وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے اپنا موقف پیش کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے مختصراً اسے بتایا کہ مجھ پر لگایا گیا یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ مجھے رانو نے بتایا تھا کہ اس کے یہ ماں باپ اس کے اصلی ماں باپ نہیں ہیں۔ بلکہ اسی قبیلے کے کسی آدمی نے رانو کو چھوٹی عمر میں کہیں سے اغوا کیا تھا اور ان کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ میں ان سے صرف اس اغوا کار کا نام پوچھ رہا تھا۔ "تم اس اغوا کار کا نام پوچھ کر اور اس کے بارے میں جان کر کیا کرو گے۔"

سردار کے بولنے سے قبل ہی میرے باپ نے مجھ سے سوال کیا۔ "میں اس اغوا کار سے یہ پوچھوں گا کہ اس نے رانو کو کہاں سے، کس شہر، گاؤں یا قصبے سے اغوا کیا تھا۔ پھر میں اسے اس جگہ لے جا کر اس کے ماں باپ کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ بے شک اسے اغوا ہوئے مدتیں بیت گئی ہیں مگر جو لوگ کوئی نشان کوئی پتا دیے بغیر دنیا کے وسیع و عریض سمندر میں غائب ہو جائیں۔ ان سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے ہمیشہ ان کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ خاص کر ماں باپ تو اپنی اولاد کو پیار و محبت کی خوشبو اور لہو کی کشش کی بدولت ہزاروں میں سے بھی پہچان لیا کرتی ہے مجھے یقین ہے کہ برس ہا برس گزر جانے کے باوجود بھی اگر رانو کے ماں باپ زندہ ہوئے تو وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ اس کے ننھے منے کپڑوں، اس کے کھلونوں، اس سے منسوب ہر شے کو اب تک سنبھالے ہوئے ہوں گے اور ان کو اپنی آنکھوں سے لگا کر چومتے ہوں گے اور روتے ہوئے اس کے لوٹ آنے کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔"

تمہارا بھاشن ختم ہو گیا ہو تو سن لو کہ رانو کو میں نے ہی

چھوٹی چھوٹی غلطیاں فلموں میں بہت زیادہ دیکھنے میں آیا کرتی ہیں۔ کچھ یہ کنٹینیوٹی یعنی تسلسل کی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ اسکرپٹ ڈائریکشن کی۔

آئیں۔ ہم آپ کو کچھ مشہور فلموں کی ایسی غلطیاں بتاتے ہیں۔

ٹرمینیٹر، بہت ہی مشہور فلم۔ اس سیکوئل کی کئی قسمیں بن چکی ہیں۔ اس فلم کی ایک دلچسپ غلطی ملاحظہ فرمائیں (یہ فلم 2003 میں ریلیز ہوئی تھی)

ٹرمینیٹر 3 کا ایک سین ہے کہ جان اور کیتھرین دوڑتے ہوئے ایئرپورٹ کے ہینگر میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں ایک طیارہ کھڑا ہے جس کا نمبر ہے N3035C۔ دونوں وہ طیارہ لے کر پرواز کر جاتے ہیں۔ اور جب طیارہ فضا میں بلند ہوتا ہے تو اس کا نمبر ہوتا ہے N.3973F اور جب طیارہ زمین پر اترتا ہے تو اس کا نمبر وہی پہلے والا ہو جاتا ہے یعنی N.3035C۔ ہے نا مزیدار غلطی۔

امریکن پائی۔ یہ بھی ایک مشہور فلم ہے اور 1999 میں آئی تھی۔

اس فلم کا ایک منظر ہے کہ لڑکی نے اپنے ہاتھ میں بیئر کا گلاس اٹھا رکھا تھا اور جب کیمرا لڑکی کو پیچھے سے دکھاتا ہے تو گلاس کی بجائے اس کے ہاتھ میں کافی کا ایک کپ ہے۔ اور جب کیمرا دوبارہ سامنے آتا ہے تو پھر وہی بیئر کا گلاس۔

مرسلہ: احمد سلمان، لاہور

ایسی ہی ایک اور غلطی 2005 میں ریلیز ہونے والی فلم مسٹر اور مسز اسمتھ میں ہوئی تھی۔ نیویارک کے پس منظر میں بننے والی اس فلم کے ایک منظر میں انجلینا اور براڈ ایکشن سین میں گاڑی دوڑاتے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ ان کے تعاقب میں تین اور گاڑیاں لیکن جب شہر کے مختلف بورڈز پر کیمرا جاتا ہے تو وہ بورڈز لاس اینجلس کے ہیں۔

خود سوچ لیں گاڑیاں نیویارک کی سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں اور بورڈز لاس اینجلس کے ہیں۔

مرسلہ: فرزانہ آزاد، جہلم

اغوا کیا تھا اور صرف مالو کو ہی نہیں میں نے تمہیں بھی اغوا کیا تھا۔ تم دونوں سمیت میں نے کئی بچے مختلف شہروں، گاؤں، قصبوں سے اغوا کیے اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے علاوہ دوسرے کئی جرائم پیشہ لوگوں کو فروخت کیے۔ میں نے اب تک اتنے بچے اور بچیاں اغوا کی ہیں کہ نہ تو مجھے ان کی تعداد یاد ہے اور نہ ہی یہ یاد رہا ہے کہ میں نے انہیں کہاں کہاں سے اغوا کیا ہے۔" میں یہ سن کر شل ہو گیا۔ میرے لیے یہ احساس ہی جان لیوا تھا کہ میں جو ہوش سنبھالنے سے اب تک ان سفاک لوگوں کو اپنا ماں باپ اور ان جاہل، اجڈ، جنگلی اور غیر مہذب بنجاروں کو اپنا خاندان سمجھتا رہا ہوں۔ ان سے میرا دور دور تک بھی واسطہ نہیں۔ اب مجھے ادراک ہوا کہ میں اور مالو کیوں اب تک ان خانہ بدوشوں کے انداز واطوار اپنا نہیں پائے تھے۔ کیوں ہمیں ان کے رسم و رواج، ان کی روایات ان کے ماحول سے نفرت تھی۔ اس قبیلے کی روایات کے مطابق میں کیوں بھیک مانگنے اور دیگر قابل نفرین کاموں سے اب تک گریزاں تھا۔ میں نجانے کس کا بیٹا تھا۔ کس کا لہو میری شریانوں میں دوڑ رہا تھا۔ نجانے کس ماں کی کوکھ اجاڑی تھی۔ میرے اس نام نہاد باپ نے۔ یقیناً مالو کے ماں باپ اور قبیلے کے سردار اور دیگر تمام بنجارے ان نام نہاد ماں باپ کے تمام کالے کرتوتوں سے واقف تھے۔ یہ بدبخت اور سفاک انسان اپنے قبیلے کے ساتھ جہاں بھی قیام کرتا۔ وہاں سے موقع پا کر چھوٹی عمر کے بچے اور بچیاں اغوا کرتا اور اپنے قبیلے کے علاوہ دیگر جرائم پیشہ اور بردہ فروشوں کو بھاری قیمت پر فروخت کرتا۔ یوں ان بدقسمت بچوں کا مستقبل جرائم کی دنیا کا گھور اندھیرا ہوتا۔ جہاں وہ معاشرے کے لیے ایک ناسور بن جاتے۔ اس سفاک انسان کو یقیناً قبیلے کے سردار سمیت بنجاروں کی اسی ساری بستی کی آشیر باد حاصل تھی۔ مالو کے ماں باپ بھی جانتے تھے کہ مالو کو کس نے اغوا کیا ہے۔ انہوں نے یقیناً مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ انہوں نے مالو کو کسی اجنبی سے خریدا تھا۔ ایک دم میرے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں جیسے سلب ہو گئیں۔ میری نظروں کے سامنے گویا سرخ آندھی سی چل پڑی۔ سردار اپنی چارپائی پر بڑے مزے سے بیٹھا موسمی پھل کھا رہا تھا۔ قریب ہی ایک تیز دھار چھری نہ جانے کس مقصد کے تحت اس نے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کسی اجنبی قوت کے تحت آگے بڑھ کر تیزی سے چھری اٹھائی اور اپنے نام نہاد ماں باپ پر چھریوں کے پے در پے وار کرنے شروع کر دیے اور جب تک سردار سمیت دیگر بنجاروں کو پتا چلتا اور وہ آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے چھری چھینتے میں نے ان بدبختوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ سردار کے حکم سے مجھے جکڑ لیا گیا اور دو بنجارے تھانے دوڑا دیے گئے۔ پولیس آئی اور مجھے آلۂ قتل سمیت گرفتار کر کے لے گئی۔ میرے اعتراف جرم، سردار سمیت کئی چشم دید گواہان کی گواہی اور آلۂ قتل سمیت پولیس کو مقدمہ درج کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی اور جلد ہی یہ کیس عدالت میں لگ گیا۔ جہاں انتہائی کم مدت میں اس کیس کا فیصلہ ہو گیا اور مجھے سزائے موت ہو گئی۔ جس روز مجھے موت کی سزا سنائی گئی۔ اس روز بنجاروں کا قبیلہ بھی جہلم شہر سے کوچ کر گیا۔ یوں میرا ان سے اور مالو سے ناتا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔"

کالو خان اپنی داستان سنا کر خاموش ہو چکا تھا اور ہم سب انتہائی تاسف اور افسوس کے ساتھ اس کی داستان الم سن رہے تھے۔ ماحول پر ایک گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"میرے ماں باپ نے میرا نام نجانے کیا رکھا ہوگا۔ میں ایک مہذب دنیا کا باسی تھا۔ مگر ان بدبختوں نے میرا نام "کالو خان" رکھ کر مجھے اپنے جیسا ہی بنجارا بنا دیا۔ میں نے اپنے اغوا کاروں کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اغوا کاری کا یہ باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہوا۔ جب تک بنجاروں کی یہ جھگیاں قائم ہیں جب تک بارونق چوراہوں، سڑکوں، بس اسٹاپ اور گلی گلی، محلے محلے جانوروں کا کھیل تماشے دکھانے والے مداری اور بھکاری، بھکارنیں زندہ ہیں۔ چھوٹے بچوں کے اغوا کا یہ قبیح عمل جاری رہے گا اور مجھ جیسے کالو خان ماں باپ سے بچھڑ کر یونہی جرائم پیشہ بنتے رہیں گے۔"

پھر وہ بڑی حسرت سے بولا۔ "موت کی سزا پانے والوں سے ان کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے اگر مجھ سے میری کوئی آخری خواہش پوچھے تو میری بس یہی آخری خواہش ہے کہ کاش میں مرنے سے پہلے اپنے ماں باپ کو دیکھ لوں۔ ان کے بارے میں جان سکوں۔" کالو خان خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی اور یہ کہانی جیل سپرنٹنڈنٹ سمیت ہم سب کو رلا گئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہم واپس لوٹ رہے تھے تو سب ہی دل گرفتہ تھے۔ کاش ہم اس بنجارے کی آخری خواہش پوری کرنے کے قابل ہو سکتے۔

++

داستانِ ہجر

محترم و مکرم مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک ایسی داستان مرسلہ ہے جو کرب میں لپٹی ہے، یوں بھی قیام پاکستان کے وقت ایسی ایسی داستانوں نے جنم لیا ہے جو ان کہی ہے۔ ہجرت کا مرقع ہے۔ یہ داستان بھی کچھ منفرد ہے۔ قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

نفیسہ سعید
(کراچی)

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب باہر سے سنائی دیتی تیز دھماکوں کی آواز سے فاطمہ کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ سمجھ نہ پائی یہ آواز کس چیز کی ہے مگر جیسے ہی اس کے حواس بحال ہوئے تو احساس ہوا کہیں قریب ہی فائرنگ ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس جا پہنچی جس کا شیشہ کھولتے ہی ایک زوردار دھماکے کی آواز کہیں قریب سے سنائی دی۔ شاید یہ فائرنگ ان کی چھت پر ہو رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی پاؤں میں چپل پھنسائی فاطمہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ دیکھا لاؤنج میں اندھیرے کا راج تھا اور چاروں سو مکمل سناٹا طاری تھا لیکن چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی لائٹ جل رہی تھی جس سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اوپر چھت پر کوئی ہے۔ اب وہ بمشکل اپنے قدم اٹھاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھی ہی تھی کہ ایک دم جانے کہاں سے طیبہ نکل کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"خیریت تو ہے اماں جان یہ آپ آدھی رات کو کہاں جا رہی ہیں؟"

اس نے دیکھا طیبہ نے اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ چھت پر رات کے اس وقت تک محفل جمی رہی ہے۔

"یہ آدمی رات کو کون آیا ہے جو چھت پر اتنا اودھم اٹھا رکھا ہے۔" فاطمہ نے ناگواری سے بہو کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سمیعہ کے کچھ دوست آئے ہیں جو ہماری چھت پر جشن آزادی منا رہے ہیں۔ سب نے مل کر باربی کیو کا اہتمام کیا ہے۔" یہ کہتی طیبہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ ساس اس سے مزید کوئی سوال نہ کر سکے جبکہ پیچھے کھڑی فاطمہ چھت سے بلند ہوتے آزادی کے نغموں کی لے کے ساتھ آنے والے بے ہنگم شور و غل کو سن کر سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

نعمان نے دیکھا ستارہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی جب وہ اس کے قریب جا بیٹھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت ہی پیار سے بولا۔ "کیا بات ہے امی آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"تمہاری خالہ کا خط آیا ہے۔" ستارہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ کو ان کی خیریت کی اطلاع مل گئی پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟"

"خط میں اس نے جو لکھا ہے وہ پریشان کن بات ہی ہے۔" یہ کہہ کر ستارہ نے ہاتھ میں پکڑا خط بیٹے کو تھما دیا جسے پڑھتے ہی نعمان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ تیزی سے بولا۔

"خالہ کو یہ رشتہ مانگنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، ان کا بڑا بیٹا اور شوہر کانگریس کے سرکردہ لوگوں میں شامل ہیں اور اپنے علاقے میں پاکستان مخالف بیانات دیتے ہیں ایسے میں بھلا ابا جی کس طرح اس رشتے پر رضامند ہوں گے جبکہ ہم دونوں خاندانوں کے نظریات میں واضح فرق ہے۔"

"جانتی ہوں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کلکتہ ہمارے امرتسر سے بہت دور ہے جہاں ہم بہنیں ایک دوسرے سے سال بعد ملتی ہیں یا پھر کوئی خوشی یا غم ہمارے ملن کا سبب ہوتے ہیں، وہاں میں اپنی اکلوتی بیٹی کیسے دے دوں۔" ستارہ کی بات بھی درست تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، خالہ اور خالو تو جب بھی امرتسر آئے مشکل سے ہی کبھی ایک رات ہمارے ہاں رکے ہوں گے اس لیے آپ نے اس رشتے کے متعلق سوچنا بھی کیوں ہے بس فوراً انکار کر دیں۔" نعمان نے اپنے تئیں بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات درست ہے لیکن میرا اپنا خیال ہے انکار کرنے سے پہلے ایک بار امینہ سے پوچھ لوں اس کی کیا رضا ہے کیونکہ جب سے ناظم میٹرک پڑھنے آیا ہے وہ ہر دوسرے، تیسرے ماہ یہاں کا چکر لگاتا ہے تو ایسے میں اس کی اور امینہ کی کافی اچھی دوستی ہو گئی ہے تو کہیں ایسا نہ ہو..."

"ظاہر ہے وہ جب گھر آتا ہے تو پڑھائی میں امینہ کی مدد کر دیتا ہے۔" نعمان نے جلدی سے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو ایسے میں لازمی دونوں کے درمیان دوستی ہو گی جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ امینہ اس رشتے پر راضی ہے۔ چلو خیر میں ایک بار اس سے بات کر لوں پھر رفعت کو خط لکھوا دوں گی۔" ستارہ بات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ حاجی صاحب کے گھر آنے کا وقت ہو گیا تھا اور اسے چاولوں کو بگھار لگانا تھا۔

☆☆☆

گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتے راجندر سنگھ کی نگاہ جیسے ہی سامنے سے آتی امینہ پر پڑی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا حالانکہ بڑی سی چادر میں لپٹی امینہ کا چہرہ وہ کبھی بھی نہ دیکھ پایا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی امینہ کو دیکھتے ہی اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو جاتی۔

زیادہ پرانی بات نہ تھی چند سال پہلے تک وہ اور امینہ محلے کے دیگر بچوں کے ہمراہ نیم والے میدان میں ساری دوپہر خوب کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کے بڑوں کے دلوں میں قومی نظریاتی تفریق نے جنم نہ لیا تھا تب وہ سب ہندو، سکھ اور مسلمان بچے ایک تھے جو ساری دوپہر اس میدان میں کھیلتے پھر ملکی سطح پر شروع ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے پیش نظر بہت سے بچے اپنے گھروں کے اندر محصور ہو گئے جن میں امینہ اور اس کا بھائی نعمان بھی شامل تھا۔ امینہ کے تو گھر بیٹھنے کی ایک بڑی وجہ اس کی بڑھتی ہوئی عمر بھی تھی وہ بلوغت کی حدود میں داخل ہو چکی تھی، دوپٹے کی جگہ اس کے سر پر چادر آ گئی اور اس کا گھر سے نکلنا تقریباً ختم ہو گیا مگر پھر بھی وہ ہر روز شام گلی کی نکڑ پر موجود بیری والی ساجدہ آپا کے گھر دینی تعلیم حاصل کرنے ضرور جایا کرتی جہاں اس جیسی اور بھی بہت سی مسلمان بچیاں آیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ امینہ کا وقت مخصوص ہوتا جو راجندر سنگھ جان چکا تھا اور وہ اسی وقت گلی میں موجود ہوتا جب امینہ، ساجدہ آپا

کے گھر جا رہی ہوتی یا واپس آ رہی ہوتی۔ ابھی بھی وہ چور نظروں سے اپنے قریب سے گزرتی امینہ کو دیکھ رہا تھا جو راجندر سنگھ کو مکمل طور پر نظرانداز کرتی ہوئی تیزی سے رقیہ کی گلی کا دروازہ عبور کرتی اپنے گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ وہ تو شاید راجندر سنگھ کو جانتی بھی نہ تھی کیونکہ جب سے اس نے گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑا تھا وہ کبھی بھی راجندر سے نہ ملی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی راجندر سے بات کی ایسے میں راجندر کا روز گلی میں کھڑے ہو کر امینہ کا انتظار کرنا اسے خود کو بھی پریشان کر رہا تھا مگر تو اسے ایسا لگتا جیسے اس کے وجود میں امینہ کی محبت پھیل رہی ہے اور اگرچہ احساس اسے خوفزدہ کر دیتا مگر پھر بھی وہ اپنے اس عمل سے پیچھے نہ ہٹ سکا تھا۔

☆☆☆

"یہ اللہ ہی ہے وہ جب چاہے کسی بھی بشر کا دل پھیر دے اور اس میں اپنی محبت بھر دے اور یہ تب ہوتا ہے جب میرا سوہنا رب اس بشر پر مہربان ہوتا ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے۔"

مولانا نور محمد کی آواز میں رقت طاری ہو گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ ہر ماہ کے آخری جمعہ کا خطبہ جامعہ مسجد میں دیا کرتے تھے جسے سننے کے لیے دور دور سے مسلمان آتے۔ خطبہ کے آخر میں جب مولانا صاحب دعا کرواتے تو ہر آنکھ اشک بار ہوتی، مجمع میں موجود اکثر لوگ ہچکیوں سے رو رہے ہوتے اور اس وقت بھی ایسی ہی کیفیت مجمع پر طاری ہو چکی تھی جبکہ اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لیے پھیلائے مولانا صاحب خود بھی رو رہے تھے۔ مولانا نور محمد کون تھے؟ یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ان کی رہائش جامع مسجد سے کچھ دور واقع مدرسہ دارالعلوم کے احاطہ میں موجود ان کوارٹرز میں تھی جو عملہ کی رہائش کے لیے بنائے گئے تھے۔ مولانا صاحب اپنے کوارٹر میں تنہا رہتے تھے عام لوگوں کا خیال تھا انہوں نے اب تک شادی نہ کی تھی جبکہ کچھ پرانے لوگوں کا کہنا تھا مولانا صاحب کی فیملی 1947ء میں ہندو مسلم فسادات کی نذر ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مولانا صاحب پاکستان نہ گئے اور اپنی فیملی کی یاد میں انڈیا کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان باتوں میں کتنی حقیقت تھی اس سے قطع نظر جامع مسجد کے آس پاس بسنے والے مسلمان مولانا صاحب سے نہایت گہری عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا صاحب کو یہ سعادت بھی حاصل تھی کہ اب تک کئی غیر مسلم ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

☆☆☆

"یہ سرشام اتنے نوٹ کہاں سے لے آئے ابھی تو دن ختم ہونے میں بھی بہت وقت پڑا ہے؟"

رفعت نے الٰہی بخش کے ہاتھ میں تھمی نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔ ویسے بھی یہ وقت الٰہی بخش کے گودام سے واپسی کا نہ تھا وہ ہمیشہ رات آٹھ بجے کے بعد گھر آیا کرتا تھا ضرور آج کوئی خاص بات تھی جو وہ سہ پہر تین بجے ہی گھر آ گیا تھا اور وہ بھی اتنے سارے نوٹوں کے ساتھ جو رفعت کو حیران کر رہے تھے۔

"کہیں سے لے کر آتے ہیں اپنی محنت کی کمائی ہے۔" یہ کہہ کر الٰہی بخش نے نوٹوں کی دو گڈیاں رفعت کی جانب بڑھا دیں۔

"انہیں تجوری میں رکھ دو۔" الٰہی بخش نے سر سے ٹوپی اتار کر اپنے بال سنوارتے ہوئے ایک نظر بیوی پر ڈالی اور بولا۔

"جگن داس کو تو جانتی ہو نا؟ وہی جس نے پچھلے برس اپنے بیٹے کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی۔"

"ہاں وہ جگن داس جو اخبار نکالتا ہے؟" رفعت کا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں وہی، اب اس کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے جس میں شرکت کے لیے پورے ہندوستان سے اس کے مہمان پہنچ رہے ہیں تو بس جگن داس نے آج ہی گودام کے سارے چاول، گھی، سوجی اور چینی اٹھوا لیے ہیں اور یہ بھاری رقم ادا کر دی ہے۔"

"چلو پھر میرے کڑے پکے ہوئے۔" الٰہی بخش کی بات مکمل ہوتے ہی رفعت نے خوشی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "یاد ہے نا آپ کا وعدہ تھا اس شب برأت پر مجھے سونے کے کڑے بنا کر دیں گے۔"

وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے جب ان کا بڑا بیٹا سلیم کمرے میں داخل ہوا جس کے چہرے پر پھیلے فکرمندی کے تاثرات دیکھ کر رفعت خاموش ہو گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔" الٰہی بخش نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"پریشانی کی تو بات ہے۔ ملک کے سارے مسلمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں یہاں تک کہ کانگریس میں موجود مسلمان بھی مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ ابراہیم مرچنٹ نے اپنے خاندان سمیت کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔"

"بیوقوف لوگ ہیں جو بلاوجہ شر پھیلا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ساری زندگی ان ہندو اور سکھوں کے ساتھ گزاری ہے،

یہاں اپنا کاروبار جمایا اور روپیا کمایا اب تم تو بھلا اس ملک کے دو ٹکڑے کر کے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ صرف یہ کہ جما جمایا کاروبار برباد ہو جائے گا۔" الٰہی بخش تاسف سے بول رہا تھا۔

"یہی تو افسوس ہے اور ایسے میں آپ نے ناظم کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی بھیج دیا ہے جو اس وقت مسلم لیگ کا گڑھ بن چکا ہے۔ مجھے خدشہ ہے ایسا نہ ہو کل کلاں کو ناظم بھی مسلم لیگ میں شامل ہو جائے جس سے ہمیں بہت نقصان ہوگا، یونیورسٹی سے وہ ستارہ خالہ کے گھر بھی جاتا ہے جہاں آئے دن مسلم لیگ کے اجلاس ہوتے ہیں۔" سلیم کی اصل پریشانی یہی تھی۔

"اس لیے تمہاری ماں سے کہا ہے ستارہ کی بیٹی کا رشتہ ناظم کے لیے مانگ لے شاید بیٹی کی محبت میں اس کے باپ، بھائی بھی ملک توڑنے والی اس تحریک سے علیحدہ ہو جائیں۔"

"مشکل ہے کہ خالو ہمیں یہ رشتہ دیں۔ وہ تو شاید ہمیں پسند بھی نہیں کرتے جس کی وجہ ہماری کانگریس میں شمولیت ہے۔ ظاہر ہے ان کا کوئی کاروبار نہیں ہے۔" الٰہی بخش نے نخوت سے کہا۔

"ایک مسجد کا پیش امام کہیں بھی جا کر کما لے گا جائیداد کے نام پر صرف ایک مکان ہے جسے چھوڑ کر نکل جانے میں اسے کیا تکلیف ہوگی ایسے لوگوں کو بھلا کیا احساس کہ جما جمایا کاروبار چھوڑ کر جانا کتنا مشکل فیصلہ ہے۔"

الٰہی بخش نوٹوں سے بھری تجوری کی جانب دیکھ کر بول رہا تھا جس میں رفعت پیسے رکھ رہی تھی جو اس کی عمر بھر کی جمع پونجی تھی اور اس نے ہندو، مسلمان اور سکھوں سے کمائی تھی۔ اس کے لیے یہ تصور محال تھا کہ وہ یہ دولت چھوڑ کر ایک نئے اور انجان سفر پر نکلتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پاکستان بننے کے حق میں نہ تھا اور اسے لگتا تھا علیحدہ وطن کا مطالبہ مسلمانوں کی بیوقوفی ہے جو دو سو سال سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں اور آج ایک دم ہی سب کچھ چھوڑ کر اس ملک کے دو ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔

☆☆☆

ناظم کو شروع دن سے ہی امینہ اچھی لگی تھی مگر وہ جانتا تھا ان دونوں گھرانوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق اور اختلاف تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کے والد اور دونوں بڑے بھائی تھے جو نہ صرف مسلمان مخالف جماعت کانگریس کے سرگرم کارکن تھے بلکہ دو قومی نظریہ سے بھی اختلاف رکھتے تھے اور اپنے علاقے میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبہ کے خلاف تحریک چلا رہے تھے جبکہ امینہ کے چاروں بھائی اور عبداللہ خالو مسلم لیگ میں شامل تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن دیا جائے جہاں وہ اپنے اسلامی نظریات کے ساتھ مکمل آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ ناظم کو مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل جائز لگتا کیونکہ اب وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو چکا تھا جس کا علم فی الحال اس کے باپ اور بھائیوں کو نہ تھا۔ یہ فیصلہ اس نے امینہ کو مسلم لیگ خواتین ونگ میں زور و شور سے کام کرتے دیکھ کر کیا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا مزید رہنا دوبھر ہو چکا ہے اور اب انہیں ہر حال میں آزادی چاہیے ورنہ ان کی آنے والی نسلیں مذہب اور ثقافت سے دور ہو جائیں گی۔ اسلام کے نام پر ایک نیا مذہب ان کے بچوں میں سرایت کر جائے گا جس میں بہت کچھ دوسرے مذاہب سے شامل کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ان کا کلچر بھی ہندو کلچر میں ضم ہو جائے گا جبکہ یہ بات ہندوستان میں آباد بہت سے مسلمان نہ سمجھ پا رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم مسلمانوں کے لیے نقصان کا سبب بنے گی اور وہ اپنے کاروبار اور جائیداد سے محروم کر دیے جائیں گے یہی وجہ تھی کہ ابھی تک بہت سارے مسلمان گھرانے کانگریس کا حصہ تھے جو پاکستان بننے کی مخالفت کر رہے تھے اور پھر جن دنوں ناظم کلکتہ اپنے گھر گیا ہوا تھا عبداللہ صاحب نے امینہ کا رشتہ اپنے دوست مولوی یونس کے بیٹے جاوید سے طے کر دیا جو ان کے قریبی گاؤں جگاں والے کا رہائشی تھا اور مولوی یونس جگاں والا کی مسجد کے پیش امام تھے۔

☆☆☆

"یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟"

فاطمہ نے چشمہ کی اوٹ سے ایک نظر اپنی پوتی پر ڈالی جو جینز، ٹی شرٹ پر ہلا دوپٹا پہنے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"کپڑے ہیں دادو۔" سمیعہ نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کیسے کپڑے ہیں؟ لڑکوں کا پہناوا تم لڑکیوں نے اپنا لباس بنا لیا جبکہ ہمارے دین میں اس کی سختی سے ممانعت ہے۔"

"ممی...... ممی۔" دادی کی باتوں سے سخت بیزار ہوتی سمیعہ نے اندر کی جانب منہ کر کے زور سے آواز لگائی اس سے قبل کہ طیبہ اپنی لاڈلی بیٹی کی چیخ و پکار سن کر کچن سے باہر نکلتی۔ فاروق اپنے کمرے سے باہر آ گئے جن کے ہاتھ میں تھما بریف کیس بتا رہا تھا کہ کہیں جانے کو تیار ہیں۔

"السلام علیکم اماں۔" ماں کو سرسری سا سلام کر کے اس نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی۔

"بیٹا اگر آپ تیار ہیں تو چلیں۔"

"یہ تمہارے ساتھ کہیں جا رہی ہے؟" فاطمہ نے ایک نظر سولہ سالہ سمیعہ پر ڈالتے ہوئے بیٹے سے سوال کیا۔

"جی اماں۔" مختصر سا جواب دے کر فاروق دروازہ کی سمت بڑھ گیا جبکہ سمیعہ بھی، اس کے ساتھ تھی ایسے میں فاطمہ کے دل میں جانے کیا سمائی کہ بیٹے کو آواز دے کر روک لیا:

"ایک منٹ بیٹا میری بات سنو۔"

دروازے سے باہر نکلتا فاروق چوکھٹ پر ہی رک گیا جبکہ سمیعہ لاؤنج سے باہر نکل چکی تھی۔

"بیٹا تم شاید بھول گئے ہو ہم مسلمان ہیں اور ہم نے اپنی نسل کو ہندوانہ طور طریقوں سے بچانے کے لیے پورا خاندان قربان کیا ہے، یہ آزادی اسلام کے نام پر حاصل کی ہے تو کیا فائدہ اگر ہمارے بچے ہندووانہ رنگ و روپ میں ڈھل جائیں۔" تسبیح کے دانے گراتی فاطمہ طنز سے بولی تب تک طیبہ بھی کمرے میں آ چکی تھی جسے فاطمہ کا یہ انداز گفتگو بالکل پسند نہ آیا اس لیے ذرا بلند آواز میں بولی:

"کیا ہو گیا ہے اماں کیوں ہر وقت میری بچی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔"

"وہ اب بچی نہیں ہے اور نہ ہی صرف تمہاری بچی ہے۔" فاطمہ نے سمجھانا چاہا۔

"آپ دروازہ پر کھڑے کیا کر رہے ہیں جلدی جائیں سمیعہ کو دیر ہو رہی ہے۔" طیبہ نے ساس کو جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور قریب رکھا کپڑا اٹھا کر دروازے جھاڑنے لگی جبکہ فاطمہ سمجھ گئی تھی طیبہ کو اس کا جرح کرنا پسند نہیں آیا اس لیے مزید کوئی بات کیے بنا خاموشی سے اپنے وظائف پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

☆☆☆

لے کے رہیں گے پاکستان

بٹ کے رہے گا ہندوستان

کے نعرے پورے ہندوستان میں گونج رہے تھے اور مسلمان ہر طرح کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے لیکن ابھی بھی الٰہی بخش جیسے مسلمان دو قومی نظریہ کو ماننے سے انکاری تھے۔ ان کا کہنا تھا ملک کے دو ٹکڑے کرنے سے ہم اور ہمارا کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ ان حالات میں ناظم نے اپنے والد اور بھائیوں کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر الٰہی بخش نہ مانا اور اپنے ہندو دوستوں کو خوش کرنے کے لیے فنڈ کے نام پر اپنے پیسے سے کانگریس کی مدد کرتا رہا، ویسے بھی کلکتہ کے حالات اتنے برے نہ تھے کیونکہ وہاں دوسرے شہروں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ تھے جبکہ امرتسر میں حشر برپا ہو چکا تھا یہاں مسلمانوں کے مقابلے میں سکھ اکثریت میں تھے جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ عروج پر پہنچ چکی تھی اور ایسے میں وہ اپنے برسوں پرانے تعلقات فراموش کر چکے تھے۔ ایسی ہی ایک دوپہر کی جب باہر گلی میں ہو کا عالم تھا۔ ستارہ دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھی اور امینہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی اپنی ماں سے کڑھائی کا کوئی نیا ٹانکہ سیکھ رہی تھی تب نعمان کے ساتھ عبداللہ صاحب گھر میں داخل ہوئے جنہیں دیکھتے ہی امینہ سلام کرتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مٹکے سے پانی بھر کر مٹی کا پیالہ باپ کے سامنے لا کر رکھ دیا جسے انہوں نے ہاتھ بھی نہ لگایا امینہ نے دیکھا کہ اباجی کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

"کیا بات ہے مولوی صاحب سب خیر تو ہے نا؟" چوکی پر بیٹھی روٹی پکاتی ستارہ نے عبداللہ کی جانب دیکھا۔

"میں نے یونس صاحب کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ امینہ اپنا سامان اٹھا کر اندر کمرے میں چلی جاؤ مجھے تمہارے اباجی سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

عبداللہ صاحب کے منہ سے یونس کا نام سنتے ہی ستارہ نے جلدی سے بیٹی کو وہاں سے ہٹایا اور خود چوکی سے اٹھ کر چارپائی پر ان کے قریب آن بیٹھی۔ "اب بتائیں کیا بات ہے آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں؟"

"بھلی مانس پریشانی ہی پریشانی ہے تمہیں نہیں پتا پرسوں رات مولوی بشیر کے محلے پر بلوائیوں نے حملہ کیا اور ساری بچیاں اٹھا کر لے گئے۔"

"ہائے اللہ۔" ستارہ نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

"ہاں ستارہ بی بی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس حملے میں ان بلوائیوں کا ساتھ محلے میں بسنے والے سکھوں نے بھی دیا بلکہ سنا ہے حملہ ہوا ہی ان کی مخبری پر تھا جو برسوں پرانا یارانہ رکھتے تھے۔" عبداللہ صاحب کی آواز میں دکھ اور رنج جھلک رہا تھا۔ "اسی لیے سوچ رہا ہوں امینہ کا نکاح کر کے اسے رخصت کر دوں کیونکہ جگے والا کے حالات اتنے برے نہیں ہیں۔ بھائی یونس کی عزت پورا گاؤں کرتا ہے۔ ابھی بھی وہاں کے ہندو، سکھ ان سے پانی دم کرواتے ہیں اور پھر شادی کے بعد امینہ جاوید کی عزت بن کر اس گھر میں محفوظ رہے گی۔"

تمام تر خدشات کے باوجود عبداللہ صاحب کے لہجے میں بیٹی کی محبت، پریشانی بن کر بول رہی تھی۔

"لیکن میرا نہیں خیال کہ خود سے جا کر انہیں بیٹی کی رخصتی کا کہنا درست عمل ہوگا۔" ستارہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"دونوں بیٹے یونس بھائی نے مجھے حکیم صاحب کے
ذریعے پیغام بھجوایا ہے وہ آ رہے ہیں، بیٹے بھی آنے والے
وقت کو محسوس کر تو بہتر ہو گا یہ فرض جلد ادا کر دیا جائے۔"
عبداللہ صاحب نے بیوی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔
"اس سے آج ہم خود بھی بہنوں کے گھر چلے جاتے ہیں
اور اگلے مہینے کے پہلے جمعہ مبارک کو امینہ اور جاوید کا نکاح کر
دیتے ہیں تاکہ وہ ہماری بچی کو رخصت کر کے اپنے ساتھ لے
جائیں۔" عبداللہ صاحب پورا پروگرام بنا کر گھر آئے تھے۔
"تم اپنا چاندی کا سارا زیور کسی پوٹلی میں باندھ دو، وہ بھی
ہم نے امینہ کو دے دینا ہے گھر کا سارا قیمتی سامان امینہ کا
ہے۔ "رضوان اور نعمان کا کیا ہے اپنے زور بازو کمائیں گے اور
پاکستان جا کر عزت کی زندگی گزاریں گے۔"
"میرا خیال ہے نعمان ایک خط لکھ کر ناظم کو پہنچا آئے وہ
ایک دو دن میں کلکتہ واپس جانے والا ہے تو اس طرح امینہ کی
شادی کا پیغام تمہاری بہن رفعت تک بھی پہنچ جائے گا اگر اسے
شرکت کرنا ہو گی تو وہ بھی آ جائے گی ورنہ کوئی گلہ نہ رہے گا۔"
"مولوی صاحب آپ پریشان مت ہوں اللہ تعالیٰ
بہتری کے اسباب پیدا کرے گا محلے میں اور بھی مسلمان
گھرانے ہیں جن کے گھر بچیاں موجود ہیں تو گھبرانا کیسا۔ جب
ہم یہاں سے ہجرت کریں گے تو اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے
جائیں گے پھر وہاں جا کر اس کی اور جاوید کی شادی کر دیں گے
اتنی جلد بازی میں نکاح کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" عبداللہ صاحب کو
تسلی دیتی ستارہ کا اپنا دل بھی پریشان تھا۔
"دیکھو ستارہ بیگم شاید تم نہیں جانتیں۔ یونس بھائی کا بڑا
بیٹا لاہور میں ملازمت کرتا ہے تو ان کے لیے یہاں سے
پاکستان جانا بہت آسان ہے بلکہ حکیم صاحب نے بتایا ہے وہ
لوگ جلد ہی اپنے بیٹے کے پاس لاہور جانے کی تیاری میں ہیں
تو اچھا ہے نکاح کر کے امینہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں اس
طرح ہماری بچی محفوظ ہو جائے گی۔"
"آپ ایک دفعہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں بچی کی ساری
زندگی کا معاملہ ہے۔" ستارہ کا دل اتنی جلدی اپنی بچی کی رخصتی
پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔
"زندگی سے زیادہ ضروری چیز عزت ہے اگر وہ بچ
جائے تو سمجھو سب کچھ بچ گیا اور ان حالات میں عزت بچانا
بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" ستارہ سمجھ گئی مولوی صاحب کیوں
پریشان ہیں۔

☆☆☆

ناظم کے دل میں موجود امینہ کی محبت کی خبر کی اور تم
پہنچنے سے پہلے ہی اس کی شادی کا پیغام آ گیا۔ انھی دنوں ہر
وقت ملک میں پھیلے انتشار کا ذمہ دار بدنام پھیلے ان سوالوں کو
ہی ٹھہراتا تھا جنہوں نے آزادی کے نام پر ملک کے دو ٹکڑے کر
دیے تھے ایسے میں وہ امینہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا
فیصلہ کر چکا تھا لیکن ان حالات میں ناظم کے سمجھانے پر الٰہی
بخش، رفعت اور سلیم کے ہمراہ امرتسر جانے پر بمشکل راضی ہوا۔
ناظم کے ہاتھ آنے والے خط کے مطابق آنے والے جمعہ کو امینہ
اور جاوید کا نکاح تھا جس کی تمام تر تیاریاں دونوں طرف مکمل
تھیں اس نکاح میں شرکت کے لیے الٰہی بخش اپنی بیوی رفعت،
سلیم اور بڑی بہو کے ہمراہ جمعرات کی صبح ہی امرتسر کے لیے
نکل گیا لیکن اس وقت جب وہ لوگ امرتسر سے کچھ ہی دور تھے
تب وہ سانحہ ہو گیا جس نے عبداللہ صاحب کے تمام خدشات
کو درست ثابت کر دیا۔ امرتسر کے مسلمان گھرانوں پر بلوائیوں
نے حملہ کر دیا تھا جس کی اطلاع ملتے ہی الٰہی بخش کے حکم پر سلیم
نے اپنی گاڑی واپس کلکتہ جانے والے راستے پر موڑ لی کیونکہ
اب امرتسر جانا خطرے سے خالی نہ تھا چونکہ وہاں کے رہائشی
سکھوں نے ہندو بلوائیوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار اور قتل و
غارت کھلے عام شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے امرتسر جانے
والے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے۔

☆☆☆

امینہ کو جب ہوش آیا کمرے میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی
تھی وہاں موجود سناٹے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کمرے
میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر
ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے جس کے سبب اسے سانس لینا
مشکل ہو رہا تھا اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ہوتا تو بھی وہ چلانے
کا ارادہ نہ رکھتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی یہاں اس کی مدد کو کوئی نہیں
آئے گا سوائے اللہ کی ذات کے۔ اس حالت بے بسی میں اس
کے نتھنوں سے ٹکرانے والی مہندی کی خوشبو نے امینہ کو یاد دلایا
آج اس کی شادی تھی اور اس وقت وہ دلہن کے لال جوڑے
میں ملبوس تھی۔
مقامی مسجد میں جمعہ کے بعد امینہ کا نکاح تھا اس لیے بدھ
کی صبح ستارہ نے گلی کے کونے والے ہندو پنساری سے مہندی
خریدی تھی جسے گھول کر اس نے بچی کے ہاتھ اور پاؤں کو رنگ
دیا اور پھر شام میں محلے کے مسلمان گھرانوں کو امینہ کے نکاح کی
اطلاع کر دی گئی۔ جمعرات کی شام محلے میں غیر معمولی طور پر
سناٹا طاری تھا نعمان اور رضوان بھی آج جلدی گھر لوٹ آئے

تھے عبداللہ صاحب عشاء کی اذان دے کر گھر کے اندر داخل ہی ہوئے تھے کہ باہر سے سینکڑوں آوازوں کا ملا جلا نعرہ سنائی دیا۔ جو بولے سو نہال ست سری اکال۔ تبھی ان کے چار، پانچ لمبے تڑنگے مرد اندر آ گئے جنہوں نے اپنا منہ ڈھکا ہوا تھا ان مردوں کو دیکھتے ہی ستارہ نے خطرہ بھانپ لیا اور تیزی سے اینہ کا ہاتھ تھام کر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی جب ان میں سے دو مردوں نے ان دونوں ماں بیٹی کو سیڑھیوں پر جا لیا اور پھر اینہ کے سامنے ہی ان میں سے ایک نے اگلے ہی پل اپنی کرپان کو ستارہ کے پیٹ میں اتار دیا جس کے جسم سے بھل بھل کرتا خون بہہ کر سیڑھی اور اس کی دیواروں پر جا پڑا دہشت سے اینہ کی آواز بند ہو گئی جب کسی مرد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے کندھے پر ڈالا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اینہ نے آخری بار دیکھا اس کے گھر کے صحن میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا جس کے بعد اسے ہوش نہ رہا اور اب جانے وہ کتنی دیر بعد ہوش میں آئی تھی ایسے میں اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندہ کیوں ہے۔ اس نے روتے ہوئے صدق دل سے دعا کی اے کاش وہ ابھی مر جائے۔

کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی شخص اندر داخل ہوا جس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اینہ کے پاس آن بیٹھا اینہ نے دیکھا۔ اس کا چہرہ چھپا ہوا نہیں تھا۔ دہشت و خوف کے باوجود وہ اس چہرے کو پہچان چکی تھی۔ یہ لڑکا اس کے محلے میں رہنے والا رابندر سنگھ تھا جس کے ساتھ ہی نفرت کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی۔ اس نے سوچا ابا جی کا خیال درست تھا کہ محلے میں آباد سکھ، بلوائیوں کے حملے میں برابر کے شریک ہیں جب اس کے کانوں سے رابندر کی آواز ٹکرائی۔

"دیکھو میں تمہارے منہ سے کپڑا نکالنے لگا ہوں لیکن کوئی آواز مت نکالنا کیوں کہ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی رابندر نے اس کے منہ سے کپڑا ہٹا دیا اور بازو سے پکڑ کر اینہ کو کھڑا کرنا چاہا جس کے پورے وجود پر خوف سے لرزہ طاری تھا تب رابندر اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ "دیکھو اینہ مجھ سے ڈرو مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اگر تم میری ہر بات مان لو تو ہم بہ آسانی یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"رابندر اگر تمہیں پرانی محلے داری کا ذرا سا بھی پاس ہے تو خدا کے لیے مجھے مار دو کیونکہ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔" گھٹی گھٹی آواز میں روتی ہوئی اینہ کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں اور باپ کی خون میں لت پت لاشیں تیر رہی تھیں۔

"کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ جو تمہیں یہاں لائے تھے وہ تمہاری لاش کی بے حرمتی بھی کر دیں گے اس لیے بہتر ہو گا تم میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔" اپنی بات ختم کرتے رابندر نے اینہ کی سمت اخبار میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ بڑھا دیا۔

"اس میں میری بے بے کی ساڑی اور کچھ ضروری سامان ہے جسے پہن کر اس طرح تیار ہو جاؤ کہ تم سکھ یا ہندو کڑی لگو تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔"

"مگر تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟" رابندر سنگھ کے رویّے نے اینہ کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

"کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے ویاہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر بہتر ہے تم اپنی کرپان ابھی میرے سینے میں اتار دو کیونکہ میں ایک مسلمان ہوں جو محض اپنی جان بچانے کے لیے ایک غیر مذہب والے سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا ابھی تو یہاں سے نکلو۔"

اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اینہ نے رابندر سنگھ کی لائی ہوئی ساڑی پہن کر خود کو ایک ہندو لڑکی کی طرح تیار کیا اور رابندر اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا جہاں اس کی بے بے اور ایک چھوٹی بہن رہتی تھیں جن کا رویّہ اینہ کے ساتھ نہایت حقارت آمیز تھا مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی اس وقت تک جب تک وہ یہاں سے نکل کر کسی مسلمان گھرانے تک نہ پہنچ جاتی۔

☆☆☆

مسلم کش فسادات آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں پھیل چکے تھے قرارداد پاکستان منظور ہو گئی تھی جس کے مطابق مسلمان اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ وطن پاکستان کو وجود میں لانے کا فیصلہ ہو چکا تھا جس کی کاغذی کارروائیوں پر عمل درآمد نے ہندو اور سکھوں کو نفرت اور غصے کی کیفیت سے دوچار کر دیا اب وہ کسی طور نہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو آزادی حاصل ہو اور وہ خیر و عافیت کے ساتھ یہاں سے اپنا مال و دولت لے کر پاکستان جا سکیں جس کی وجہ سے لوٹ مار اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے رات کی تاریکی میں اپنے بھرے پرے گھر چھوڑ کر ہندوستان سے نکل رہے تھے۔ ایسے میں اینہ بھی چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح کلکتہ اپنی خالہ رفعت کے گھر پہنچ جائے کیونکہ اسے رابندر سنگھ نے بتایا تھا کہ محلے والا میں جاوید اور اس کے گھر والے موجود نہ تھے۔ رابندر کا کہنا تھا اگر وہ بلوائیوں کے حملے سے بچ گئے ہوں گے تو یقیناً ہجرت کر کے یہاں سے جا چکے

تھے کیونکہ اب اس محلے میں کوئی مسلمان گھرانا نہیں بچا۔ اینہ کو اس گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تو مگر اس دوران رابندر نے کبھی کوئی غلط حرکت نہ کی کہ جس سے اس کی بدنیتی اینہ پر کھلتی یہی وجہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ رابندر پر اعتماد کرنے لگی تھی جس نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ جلد ہی وہ اسے کسی قافلے کے ہمراہ پاکستان بھیج دے گا یا خود ساتھ لے جا کر کلکتہ خالہ رفعت کے گھر چھوڑ آئے گا کیوں کہ پاکستان بننے کی مخالفت کرنے والے مسلمان ابھی ہندوستان میں ہی موجود تھے۔ ایسی ہی ایک اداس سی شام تھی جب رابندر کی بے بے اور بہن دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے اور اینہ کا دل اپنے بھائیوں کو یاد کر کے رو رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے اپنے ماں باپ کے خون میں لت پت جسم آ رہے تھے ایسے میں رات کے کسی پہر رابندر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلمانوں کا ایک قافلہ لوٹ کر آیا تھا تب وہ اور اس کے ساتھی نشے کی حالت میں گھر کے صحن میں بیٹھے لوٹ کا مال آپس میں تقسیم کر رہے تھے اور ان کی باتوں کی آواز اینہ کو کمرے کی کھلی کھڑکی سے صاف سنائی دے رہی تھیں تب رابندر کے کسی دوست نے پوچھا۔ "اوئے رابندر تو نے جو مسلیوں کی کڑی اٹھائی تھی وہ کدھر گئی۔"

"او کیڑی کڑی دی گل کر رہے ہو؟ اینہ کی؟"

نشے میں دھت ہو کر رابندر سنگھ سچ اگل رہا تھا جو دروازے کے پیچھے کھڑی اینہ سن رہی تھی تب اس پر انکشاف ہوا کہ رابندر آج تک اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے اسے کسی اور نے اغوا نہ کیا تھا بلکہ رابندر نے اپنی گندی نیت کے سبب ایک سازش کے تحت عین شادی والے دن اینہ کے گھر والوں کو شہید کر کے اسے اٹھایا ان انکشافات کے ساتھ ہی اینہ کے پورے جسم میں غم و غصے اور نفرت کی شدید لہر دوڑ گئی ایسے میں اس نے فیصلہ کیا اگر رابندر نے اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تو وہ۔۔ اپنی جان دے دے گی۔ تب اس کے کانوں سے رابندر کے کسی دوست کی آواز ٹکرائی۔

"چل پھر آج تیرے گھر پہ پارٹی کرتے ہیں تو نے بتایا ہے نا کہ بے بے بھی گھر نہیں ہے۔"

"ہاں بالکل مسلوں کی اس کڑی کی دعوت ہم سب کے لیے ہونی چاہیے۔" یہ آواز کسی دوسرے لڑکے کی تھی۔

اینہ نے کمرے کے دروازے کی جھری سے جھانکا صحن میں بیٹھے تمام لڑکے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نشے میں جھومتے یہ بدمست ہاتھی تعداد میں سات تھے اور تنہا اینہ کسی بھی حال میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی بس یہی فیصلے کا وقت تھا عزت یا زندگی اور اینہ نے عزت کو زندگی پر فوقیت دی اس نے کمرے میں یہاں وہاں نظر دوڑائی سامنے کی دیوار پر رابندر کی کرپان ٹنگ رہی تھی اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا تیزی سے دوڑ کر وہ کرپان اتاری اور اپنے پیٹ میں گھونپ دی۔ درد کی ایک شدید لہر اینہ کے جسم میں پھیل گئی جس کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ اپنی زبان سے کلمہ پڑھتی اینہ زمین پر گر گئی جب تک رابندر سنگھ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اینہ آخری سانس لے رہی تھی اپنی بند ہوتی آنکھوں سے اینہ نے دیکھا رابندر تنہا تھا اس کا کوئی دوست اس کے ہمراہ نہ تھا وہ خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر ہی بیٹھ کر رونے لگا مگر اس کی اس آہ و زاری کا اینہ کو علم نہ ہو سکا کیونکہ وہ یہ دنیا چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

آج تین ماہ ہو گئے تھے نعمان تقریباً روز ہی ان کیمپوں کو دیکھنے آتا تھا جہاں روزانہ ہی لٹے پٹے ہزاروں مسلمان قافلوں کی صورت پہنچ رہے تھے لیکن اسے اب تک اپنی بہن اینہ اور بھائی رضوان نہ ملے تھے جبکہ وہ اپنی ماں اور ابا جی کی بے گور و کفن لاشیں صحن میں چھوڑ کر چھت سے کودا تھا اور جانے کس طرح ہندوستان سے پاکستان پہنچا تھا۔ اس نے کئی میلوں کا سفر ننگے پاؤں پیدل دوڑتے ہوئے طے کیا تھا جس سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے مگر اسے ہر حال میں پاکستان پہنچنا تھا اور یہ جذبہ اور خواہش ایسی تھی جس نے نعمان کی بھوک پیاس سب کچھ ختم کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا اس کی موت ایک آزاد وطن میں ہو، وہ پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا جس کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔

سفر کرتے ہوئے اسے جنگل میں ایک قافلہ مل گیا جن کے ہمراہ نعمان پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا ہے جیسے وہ ایک بار پھر جی اٹھا ہو ایسے میں وہ ہر تکلیف بھول گیا سوائے اپنے ماں باپ کی شہادت کے، ساتھ ہی اپنے بہن بھائی کی گمشدگی کا غم بھی اس کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا جب ان ہی دنوں اس کی ملاقات مہاجر کیمپ میں رہنے والی فاطمہ سے ہوئی جو اسی کی طرح اپنا سارا خاندان قربان کر کے پاکستان پہنچی تھی اور پھر ایک دو دفعہ کی ملاقاتوں کے بعد ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ لاہور کی ایک مسجد میں فاطمہ اور نعمان کا نکاح انجان لوگوں کی موجودگی میں ہوا جس میں ان کا کوئی بھی اپنا شریک نہ تھا۔ وہ دونوں تنہا تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اولاد کی صورت ان کی یہ تنہائی دور کی اور انہیں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا فاروق کی صورت میں دیا۔ نعمان جب تک زندہ رہا اپنی بہن اور بھائی کو تلاش کرتا

رہ جوا سے موت تک نہ سے یالآخر وہ بھی یہ دنیا چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے پیچھے ذہرا اکیلی رہ گئی جو اپنے اکلوتے بیٹے فاروق کے ساتھ اس کے گھر میں رہتی تھی۔

☆☆☆

مولوی نور محمد جب بھی دلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھاتا تو وہاں سے عصر کی نماز کے بعد امرتسر کے قریب موجود اپنے گاؤں ضرور جاتا جہاں اب کوئی بھی اسے نہ پہچانتا تھا لیکن مولوی نور محمد وہاں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں موجود امینہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا بس کا صرف اسے ہی علم تھا جب تک وہ قبرستان میں رہتا امینہ کی قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر رویا کرتا اور اس سے معافی مانگتا نور محمد کو وہ دن آج بھی یاد تھا جب جاوید گاؤں میں امینہ کو تلاش کر رہا تھا اور وہ اس کے گھر کے ایک کمرے میں موجود تھی مولوی نور محمد کو وہ وقت بھی یاد تھا جب اس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر گلے والا میں موجود مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا اور انہیں شہید کیا جن میں پیش امام یونس صاحب کا گھرانا بھی شامل تھا۔ نور محمد کو وہ رات بھی نہ بھولی تھی جب اس کے دوستوں نے امینہ کی دعوت کا مشورہ دیا تھا جنہیں جھوٹ بول کر اپنے گھر سے نکالنے کے بعد نور محمد کی نیت میں فتور آ گیا تھا جس کا علم شاید امینہ کو ہو گیا تھا اور اس نے نور محمد کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی اپنی جان لے لی تھی امینہ کی شہادت نور محمد کے دل کا وہ درد تھی جو اسے کبھی بھی چین نہ لینے دیتی یہ اس کی زندگی کی وہ رات تھی جب رابندر سنگھ نے نور محمد بننے کا سفر شروع کیا تھا اس رات رابندر سنگھ نے امینہ کی لاش کو بے گور و کفن کہیں پھینکا نہ تھا بلکہ اپنی ماں کی سفید چادر میں لپیٹ کر گاؤں کے واحد قبرستان میں زمین کھود کر دفنا دیا تھا پھر اس نے وہ قبر اپنے ہاتھوں سے پکی کر کے نشانی بھی رکھ دی تھی۔ امینہ کی موت کے بعد رابندر سنگھ کا دل ہمیشہ بے چین رہا اور وہ رات کو تنہا قبرستان چلا جایا کرتا جہاں امینہ کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر وہ روتا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا۔ اسے دکھ تھا کہ وہ یہ سب کچھ امینہ کو اس کی زندگی میں نہ بتا سکا اب قبر کے سرہانے بیٹھ کر وہ امینہ سے باتیں کرتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ کاش تم زندہ ہوتیں تو میں تمہیں ان تمام ظلم کی داستان بتاتا جو میں نے تمہارے خاندان والوں پر کیے جن کا قصور محض یہ تھا کہ وہ ایک آزاد وطن چاہتے تھے ایسی ہی ایک رات تھی جب وہ امینہ کی قبر کے سرہانے بیٹھا رو رہا تھا تب کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رابندر نے پلٹ کر دیکھا اس کے بالکل پیچھے سفید لباس میں امینہ کھڑی مسکرا رہی تھی جس کے جسم سے پھوٹتی پھولوں کی خوشبو سارے قبرستان میں پھیل گئی تھی وہ ایک دم گھبرا گیا جب امینہ کی مدھم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں نے تمہیں معاف کر دیا اپنے ماں باپ بھائی کے خون کے ساتھ جاوید اور اس کے گھر والوں کا خون بھی معاف کیا کیونکہ وہ شہید ہیں اور شہید کبھی نہیں مرتے لیکن یہ تم نہیں سمجھ سکتے اگر اب بھی تمہارے دل کو سکون نہ آئے تو اللہ سے رجوع کرو یقیناً وہ تمہیں سکون عطا فرمائے گا۔ یہ کہتے ہی امینہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی یا شاید رابندر نے کوئی خواب دیکھا تھا یا پھر امینہ کا تصور جو دن رات اس کے ساتھ رہتا تھا وہ حقیقت بن گیا تھا لیکن جو بھی تھا یہ رابندر سنگھ کی زندگی کا آخری دن تھا وہ مر گیا اور اس کی جگہ نور محمد نے جنم لیا اس رات رابندر دوبارہ اپنے گھر واپس نہ گیا بلکہ جنگلوں جنگلوں پھرتا ایک دینی درس گاہ تک پہنچ گیا جہاں اس نے اسلام قبول کیا اور پھر خود کو دین اسلام کے لیے وقف کر دیا مگر وہ امینہ کو کبھی نہ بھولا۔

☆☆☆

فون کب سے بج رہا تھا ناظم نے کال ریسیو کی دوسری طرف اس کا بڑا بھائی سلیم تھا جو کسی قدر گھبرایا ہوا تھا وہ ناظم کے سلام کرتے ہی فوراً بولا۔ ''احمد علی کو بمبئی پولیس نے گرفتار کر لیا۔''

''احمد علی، سلیم کا بڑا بیٹا تھا جو بمبئی کے کسی کالج کا طالب علم تھا۔''

''خیریت بھائی جان ایسا کیا کر دیا احمد نے جو اسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔''

بھائی کی بات سن کر ناظم بھی گھبرا گیا۔

''وہ ہی بابری مسجد کی شہادت کا معاملہ تھا جس میں احمد اپنے کالج کی طرف سے تمام مسلم طلبہ کی نمائندگی کر رہا تھا۔''

''اوہ۔''

ناظم کی سمجھ میں ساری بات آ گئی اس نے سنا سلیم کہہ رہا تھا۔

''ہم سے غلطی ہوئی جو تقسیم کے وقت اس ملک میں رہ گئے ان ہندوؤں نے ہمیں کبھی اپنے برابر تسلیم نہ کیا اور اس کی سزا آج ہمارے بچوں کو مل رہی ہے۔''

ناظم کے پاس بھائی کو دلاسہ دینے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا مگر اس نے شکر ادا کیا کہ اس کی اولاد نے آزاد وطن پاکستان میں آنکھ کھولی جہاں وہ ملکیت کے احساس کے ساتھ خود مختار زندگی گزار رہے ہیں اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ آزاد تھے۔

++